موم
ایم اے راحت

چوکیدار نے کالج کا گیٹ کھول دیا اور لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں باہر نکلنے لگیں۔ کاروں کے ہارن اور رکشاؤں کا شور، موٹر سائیکلوں کی آوازیں، بہت سی گاڑیاں فٹ پاتھ سے لگی ہوئی تھیں۔ چھٹی کے وقت زیادہ تر لڑکیوں کو ان کے بھائی یا والدین لینے آجاتے تھے لیکن کچھ لڑکے ایسے بھی آجاتے تھے۔ جن کا مقصد کسی کو لینے آنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ وہ لڑکے ہوا کرتے تھے جو عموماً کالجوں کے دروازوں پہ پائے جاتے ہیں۔

رومانہ فائل بغل میں دبائے اپنی دو تین ساتھیوں کے ساتھ باہر نکلی۔ کچھ لڑکیاں کاروں اور موٹر سائیکلوں کی طرف بڑھ گئیں۔ ایک دو ایسی تھیں جنہیں بس اسٹاپ پر جانا ہوتا تھا۔ بس اسٹاپ کالج کے گیٹ سے کافی فاصلے پر تھا، پہلے یہ بس اسٹاپ کالج کے گیٹ پر ہوا کرتا تھا، لیکن اس طرح لڑکوں کو آسانی ہوگئی تھی اور وہ بس کے انتظار کے بہانے یہاں کافی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ تب کالج کی انتظامیہ نے کوشش کر کے بس اسٹاپ یہاں سے ہٹوا دیا۔ اس سے لڑکوں کی تعداد میں تھوڑی سی کمی ہوگئی تھی۔

عائشہ نے رومانہ سے کہا۔ ''کھڑے ہوئے ہیں حضرت، جائیے۔''

رومانہ نے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہوئے سرمد کو دیکھا۔ سرمد اسی کالج میں پڑھتا تھا اور رومانہ کا بہت اچھا دوست تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ سرمد کالج کے گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو کر رومانہ کا انتظار کرتا تھا۔ پھر رومانہ اور وہ سیدھے کالج کیفے جایا کرتے تھے جو بس اسٹاپ اور کالج کے درمیان تھا۔ دونوں بڑی آزادی سے ایک میز کے گرد بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ سرمد کے حالات بہت اچھے نہیں تھے لیکن اس نے رات کے وقت دو تین ٹیوشنز پکڑی ہوئی تھیں، جن سے اسے مناسب آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ والدین کے اوپر بوجھ نہیں تھا۔ اپنے اخراجات کے علاوہ تھوڑی بہت رقم وہ اس طرح بھی خرچ کر لیا کرتا تھا۔ رومانہ بے دھڑک اس کے ساتھ کیفے جاتی تھی۔ آدھا پونا گھنٹہ وہ لوگ وہاں گزارتے اور اس کے بعد بس اسٹاپ کی طرف چل پڑتے، رومانہ کو راستے ہی میں اترنا ہوتا تھا۔ سرمد اسی بس میں آگے بڑھ جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اسٹوڈنٹس کا رش بھی کم ہو جاتا تھا اس لئے بس آسانی سے مل جاتی تھی۔ دونوں کو دنیا کی کوئی پرواہ نہیں تھی، چنانچہ اس وقت بھی عائشہ کے کہنے پر رومانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ عائشہ، ظاہر ہے ہمارے معمولات ہیں۔۔۔۔"

"یار جس دھڑلے سے تم عشق کر رہے ہو، میرا خیال ہے اس طرح کسی اور کی ہمت نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" رومانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ ماشاءاللہ تمہارے والدین بھی ہیں اور ظاہر ہے دوسرے لوگ بھی ہوں گے۔ تم لوگوں کی کوئی منگنی وغیرہ بھی نہیں ہوئی جیسا کہ میرے علم میں ہے لیکن پھر بھی تم اتنی آزادی کے ساتھ۔۔۔۔"

"عائشہ! چھوٹی باتیں مت کرو، میں اس بات کا اعتراف پہلے بھی کئی بار کر چکی ہوں کہ مجھے سرمد سے محبت ہے لیکن شادی وادی کا جو چکر ہے نا وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کام والدین ہی کرتے ہیں اور میرے بھی والدین ہی کریں گے۔ اگر مجھ سے انہوں نے پوچھا کہ بیٹی کہاں شادی کرو گی تو میں کہہ دوں گی کہ سرمد سے، انہوں نے کہا کہ نہیں وہاں شادی نہیں ہو سکتی تو میں خاموش ہو جاؤں گی۔ ظاہر ہے میں کوئی فلمی ہیروئن نہیں ہوں، نہ

کسی کہانی کا کردار، دنیا میں جو کچھ ہوتا آیا ہے وہی میرے ساتھ بھی ہوگا۔"

باتیں کرتی ہوئی وہ سرمد کے قریب پہنچ گئیں۔ عائشہ آگے بڑھ گئی تھی۔ سرمد نے مسکرا کر اسے "ہیلو" کہا تو رومانہ بھی مسکرا دی۔

"آؤ" وہ لوگ کالج کینٹین کی جانب بڑھ گئے۔ انہوں نے معمول کے مطابق کالج اور کینٹین کے درمیان بیٹھے ہوئے اس بوڑھے بابا کو دیکھا جس کی سیدھی آنکھ سے ہمیشہ پانی بہتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ترتیب سے بہت سے لفافے سجائے طوطے کا پنجرہ پاس رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ کالج کے لاتعداد لڑکے اور لڑکیاں اس سے فال کھلوا چکے تھے اور فال والے لفافے کی پرچی کو پڑھ کر ہنستے ہوئے وہاں سے گزر جاتے تھے۔ کبھی کبھی تفریحاً ہی وہ بابا کے پاس بیٹھ جاتے تھے اور اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ بابا بھی ان بچے بچیوں کا عادی ہو گیا تھا۔ شاذونادر ہی باہر کے لوگ اس سے فال کھلواتے تھے ورنہ سچی بات ہے کہ لڑکے لڑکیاں ہی اس بوڑھے کی کفالت کرتے تھے، مگر آج اس کے پاس کوئی لڑکا یا لڑکی نہیں بیٹھے تھے۔ اکثر دن ایسے بھی گزر جاتے ہوں گے، کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس وقت اتفاق سے رومانہ نے اس بات پر غور کر لیا، بابا سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ سے پانی بہہ رہا تھا جسے وہ اپنے کرتے کی آستین سے پونچھ لیا کرتا تھا۔ رومانہ کے قدم اچانک رکے تو سرمد نے چونک کر اسے دیکھا۔

"خیریت۔۔۔۔"

"سرمد ہم نے کبھی اس بوڑھے بابا سے فال نہیں کھلوایا۔"

سرمد ہنسنے لگا اور پھر بولا۔ "اس لئے کہ ہمارا دماغ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہے اور ہمارے اندر کوئی پاگل پن موجود نہیں ہے۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں جو لوگ اس سے فال کھلواتے ہیں وہ پاگل ہوتے ہیں۔"

"کافی حد تک، بھلا ان ہاتھ سے لکھے ہوئے لفافوں کے اندر رکھی ہوئی تحریروں میں کونسا علم نجوم پوشیدہ ہو سکتا ہے اور پھر یہ بیچارہ طوطا۔۔۔۔ رومانہ! کیا تم ان باتوں پر یقین کرتی ہو؟"

"پاگل ہو تم، میں خود بھی کمزور ذہن کی مالک نہیں ہوں، بس یوں سمجھ لو کہ اس بابا کی صورت دیکھ کر یہ احساس دل میں جاگا ہے کہ پتہ نہیں اس کی جیب میں کچھ پیسے ہیں یا نہیں۔"

"تو کچھ پیسے اس کی جیب میں ڈال دیتے ہیں۔"

"ذلیل کرو گے بیچارے کو، کبھی دیکھا ہے اسے کسی سے کچھ لیتے ہوئے؟"

"تو پھر آؤ فال کھلوا لیتے ہیں۔" سرمد نے کہا اور دونوں چند قدم آگے بڑھ کر بابا کے پاس پہنچ گئے۔ دونوں نے اسے سلام کیا تو بابا نے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا اور گردن ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ منہ ہی منہ میں وہ کچھ بدبدایا بھی تھا۔ سرمد نے کہا۔

"باباجی فال نکلوانی ہے۔"

بابا نے پنجرے کی طرف ہاتھ بڑھا کر طوطا نکالا اور اسے لفافوں پر چھوڑ دیا طوطا لفافوں پر گردش کرنے لگا اور پھر اس نے ایک لفافہ کھینچ لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ بابا نے لفافے کے اندر لکھا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی تحریر ان لوگوں کے سامنے کر دی۔ دونوں نے اس تحریر کو پڑھا، لکھا تھا۔

"تجربات اور جذبات کے مرکب کا نام نظریہ ہے، اس لئے دنیا کو جسم کی خاطر حاصل کرو اور آخرت کو دل کیلئے۔"

دونوں کے ذہن میں ایک چھناکا ہوا تھا۔ انہوں نے تعجب بھری نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھا اور لفافے کا کاغذ اسے واپس کر دیا۔ ان الفاظ نے دونوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دیر تک وہ اس تاثر میں ڈوبے رہے، پھر رومانہ نے کہا۔

"بابا! میں بھی فال کھلوانا چاہتی ہوں۔"

بابا نے طوطے کو پھر لفافوں پر بٹھا دیا اور طوطے نے ایک لفافہ نکال لیا، بوڑھے نے ایک کاغذ نکال کر رومانہ کی طرف بڑھایا اور رومانہ اسے ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگی، لکھا تھا۔

"موت سے تمام مسائل اور شادی سے تمام مسرتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ محبت انسان کے اندر ایک شدید جذبے کا نام ہے جسے نکال دیا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق

نہیں رہتا۔"

دونوں شدت حیرت سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس طرح کے جملے فٹ پاتھ پر بچھے ہوئے کپڑے پر رکھے ہوئے لفافوں میں مل سکتے ہیں، بہرحال دیر تک دونوں تاثر میں ڈوبے رہے۔ پھر سرمد نے بابا سے پوچھا۔ "بابا، ایک بات بتا دیں گے آپ مجھے؟"

اس سوال پر بابا کے چہرے پر کچھ بے چینی کے نقوش نمودار ہوئے پھر اس نے غرغراتی ہوئی آواز میں کہا۔

Deep rivers move with silent majesty, Shallow brooks are noisy. رومانہ اور سرمد کی آواز بند ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بول سکے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ کالج کیفے کی ایک میز کے گرد بیٹھ کر رومانہ نے کہا۔

"بابا بڑی پراسرار چیز ہے۔ نہ جانے کیا کہانی ہو گی اس کی۔"

ویٹر نے آرڈر لئے بغیر چائے ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ چائے کا سپ لے کر سرمد نے کہا۔

"ہے کوئی کسوٹی، کوئی پیمانہ انسان کو پرکھنے کا، ویسے رومانہ فلسفہ ہمارا موضوع نہیں ہے، فلسفی تو بہت بڑے ہوتے ہیں لیکن کیا انسان کی کوئی حد ہے؟"

"سوال فلسفیانہ ہے اور فلسفہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اس لئے سوال کا جواب نہیں دیا جائے گا۔"

"نہ جانے کیوں بابا کی شخصیت کے اس انکشاف نے دل پر ایک بوجھ ڈال دیا ہے۔ پتہ نہیں بے چارے کی ذات سے کون سی کہانی لپٹی ہو گی۔"

"یہ بھی الف لیلیٰ کے کسی کھیل میں ہارا ہو گا۔"

رومانہ نے ایک مصرع پڑھا۔

"بھئی، کیوں؟" سرمد نے بے چینی سے کہا۔

"مصرع ہے بھئی۔"

"رومانہ کیا ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے؟"

"کیا میں جانتی ہوں؟" رومانہ نے سوال کیا۔

"پھر میں کس سے پوچھوں؟" سرمد بولا۔

"وقت سے پہلے کیوں الجھتے ہو؟"

"وقت پر الجھن کا حل نہ ملا تو۔۔۔؟"

"صبر کریں گے۔" رومانہ نے پہلی بار اپنی چائے کی پیالی اٹھائی اور اس کا ٹھنڈا گھونٹ لیا۔ وہ ٹھنڈی چائے پینے کی عادی تھی۔ سرمد اس کے جواب پر اس کی صورت دیکھنے لگا اور کسی قدر دکھی لہجے میں بولا۔

"اور اگر صبر نہ ہو سکے تو؟"

"مر جائیں گے۔" رومانہ نے لاپروائی سے کہا۔

سرمد گردن ہلانے لگا، پھر بولا۔ "ٹھیک کہتی ہو ایک اچھا حل ہے، وہ کام جو ہم کر سکتے ہیں۔"

"سرمد جو کام کر سکتے ہیں، ہمیں اسی کو ذہن میں رکھنا چاہئے، دوسروں سے آس لگانا فائدہ مند نہیں ہوتا، اب مجھے دیکھو، میری ہر شناسا لڑکی یہ بات جانتی ہے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ گھر والوں کو بے شک اس بات کا علم نہیں ہے کیونکہ یہ بتانے والی بات نہیں تھی اور وہ بھی وقت سے پہلے۔ میں تمہارے ساتھ کالج کیفے آ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ہم چائے پینے کے بعد اٹھتے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ کوئی اگر کالج کی پرنسپل کو بھڑکا کر یہاں لے آئے اور وہ ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے دیکھے اور مجھ سے سوال کرے کہ میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں تو تم یقین کرو سرمد میں اسے جواب دوں گی کہ میڈم سرمد میرا دوست ہے ہم لوگ مستقبل میں یکجا ہونا چاہتے ہیں، ہمارے کردار بے داغ ہیں، اس کے باوجود آپ ہمیں کالج سے نکالنا چاہتی ہیں تو شوق سے نکال دیں، ہم تعلیم چھوڑ دیں گے، زیادہ سے زیادہ اپنے والدین کے عتاب کا شکار ہوں گے۔ اگر میرے گھر والوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو تم یقین کرو سرمد، میں ابو سے یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ ابو میں سرمد کو چاہتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری شادی اس سے کر دیں۔ ابو پوچھیں کہ سرمد کیا کرتا ہے، اس کا گھر بار کیا ہے، اس کا مستقبل کیا ہے تو میں ان سے کہہ سکتی ہوں کہ ابو ہم دونوں بہت غریب ہیں،

لیکن آپ سے ایک وعدہ کرتے ہیں کہ ہم شدید محنت کر کے اپنی محبت کو پروان چڑھائیں گے۔ اپنا گھر بسائیں گے اور اسے چلائیں گے۔ اس پر بھی اگر ابو کہیں خبردار لڑکی، اس کے بعد اگر تو نے سرمد کا نام لیا تو میں ابو سے کہوں گی کہ ابو آپ لوگ میرے لئے آسمان کا درجہ رکھتے ہیں، میں سرمد کا نام زور سے نہیں لوں گی، لیکن آہستہ آہستہ اس کا نام لینے سے نہیں چوکوں گی اور اگر آپ مجھے سرمد کی زندگی میں شامل کرنا نہیں چاہتے تو آپ مجھ سے زیادہ بہتر سوچ رہے ہوں گے، میں آپ سے تعاون کروں گی۔"

"یار میں یہ چائے کی پیالی اپنے سر پر مار لوں گا۔"

"خون نکل آئے گا۔ چلو اٹھو چائے کے پیسے دو، بہت زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، بابا نے ہمارے ذہنوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔"

"بیٹھو نا ابھی چائے دانی میں کافی چائے ہے، یہ ویٹر ہم پر مہربان ہے، ایک ایک پیالی چائے کے پیسے لیتا ہے کئی کئی پیالی چائے لے آتا ہے۔ پلیز آدھی پیالی چائے مجھے اور دو۔"

"دو پی چکے ہو۔"

"آدھی اور پلیز، رومانہ! میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں تمہاری شخصیت مجھے دیوانہ کئے ہوئے ہے۔ کس قدر بولڈ ہو تم، یقین کرو اگر ہمیں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا موقع ملا تو ہم آئیڈیل میاں بیوی ہوں گے۔"

رومانہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "واہ کیا دقیانوسی جملہ استعمال کیا ہے۔ میاں بیوی۔"

"یار ہوتے تو ہیں نا، ویسے تمہارا کیا خیال ہے، کیا تمہارے والدین یہ بات مان جائیں گے؟"

"ابو بے چارے ہمیشہ میرے لئے پریشان رہتے ہیں، میں نے کئی بار امی اور ابو کی باتیں سنی ہیں۔ بعض اوقات تو ابو بڑے بددل ہو جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ عمر نہیں رہی ورنہ کسی بینک میں ڈاکہ ڈالنے کے بارے میں سوچتا، ساری زندگی قلم گھسیٹتا رہا ہوں، سوائے روٹی کپڑے کے اور کچھ نہیں مل سکا۔ ہم تو جیسی بھی گزارنا تھی گزار چکے، رومانہ کیلئے

کیا کروں؟"

"بھائی کو پالئے، بیٹی کی فکر کیوں کرتے ہیں۔" امی اس بارے میں جواب دیتیں اور ابو تلملا کر رہ جاتے۔

"بس یوں کہئے کسی بھی گھر میں ایک تکلیف کا درخت ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں تکلیف کے درخت نادر چچا ہیں، بعض اوقات تو بڑا ہی پریشان کرتے ہیں۔"

"ہاں تم نے پہلے بھی نادر چچا کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کچھ کرتے دھرتے نہیں، بس ایسے ہی چار سو بیسا سی کے کام کرتے رہتے ہیں، کسی سے قرض لے کر کچھ کر لیا، قرض خواہ گھر تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر تمہارے ابو انہیں سر پر کیوں سوار کئے ہوئے ہیں؟"

"اس لئے کہ دادی نے مرتے وقت نادر چچا کو ابو کی گود میں دے دیا تھا۔ دادا تو پہلے ہی مر چکے تھے۔ انہوں نے نادر چچا کو ابو کی گود میں دیتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا غلط کام کر رہی ہوں، یہ ذمے داری تمہاری نہیں ہے۔ میں تو یتیم خانے تک نہیں جا سکتی، تم اگر اسے یتیم خانے تک پہنچا سکو تو پہنچا دینا، نہ پہنچانا چاہو تو جو روکھی سوکھی ملے وہ اسے بھی کھلا دینا۔ زندگی ہوگی تو بچ جائے گا۔ ابو نے دادی اماں سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ نادر چچا کو اپنی اولاد سمجھیں گے۔ یہ ہے نادر چچا کی کہانی، بس بگڑتے چلے گئے اور آج یہ نوبت ہے کہ چار سو بیسا سی کرتے کرتے دل نہیں بھرا، وہ تو یہ کہیں کہ ابو کا تعلق ایسے شعبوں سے رہا ہے کہ اپنی جان پہچان سے کام نکال لیتے ہیں ورنہ چچا تو جیل میں ہوتے۔ ابو بے چارے ان کیلئے "خدا نہ کرے"۔ رومانہ نے دلسوزی سے کہا۔

☆ ☆ ☆

سید علی درحقیقت برے آدمی نہیں تھے۔ نوجوانی کی عمر میں بہت ہی شرافت سے زندگی گزاری۔ چھوٹے بھائی کی ذمے داری ان کے کاندھوں پر تھی اور وہ روایتی قسم کے بڑے بھائی تھے۔ نادر علی کو وہ بری صحبتوں سے نہیں بچا سکے، لیکن نادر خود بھی بڑے بھائی سے بہت محبت کرتا تھا، حالانکہ ہر قسم کا نشہ کر لیا تھا لیکن بھائی کے سامنے کبھی سگریٹ تک نہیں پی۔ سید علی کی زندگی بری نہیں کٹی تھی، حمیدہ بیگم البتہ ذرا مختلف قسم کی خاتون تھیں اور

بات بات پر ناک بھوں چڑھانے کی عادی۔ ویسے تو انہیں سید علی سے کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن مالی حالات بہتر نہ ہونے کی وجہ سے وہ بددل ہی رہتی تھیں۔ سید علی کو پولیس کی نوکری مل گئی۔ وہ تھانے میں محرر کی حیثیت سے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، تھوڑا عرصہ سکون سے گزارا، پھر حمیدہ بیگم کی شہ پر انہوں نے رشوت لینا شروع کر دی۔ بہرحال غلط پیسہ بھی کسی کسی کو ہی راس آتا ہے۔ دھر لئے گئے ایک بار ایس ایس پی بہت ہی سخت انسان تھے۔ ایس ایس پی نے معطل نہیں کیا بلکہ سروس ہی ختم کر دی۔ سید علی کو پولیس کی ملازمت سے نکال دیا گیا، پتہ نہیں اسے تقدیر کی اچھائی کہا جا سکتا ہے یا گھر والوں کی تقدیر کہ دوسری ملازمت بھی اسی طرح کی ملی۔ ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کے پیشکار لگ گئے۔ شروع میں توبہ تلا کر کے اچھا وقت گزارا، حالانکہ نام کے ساتھ بدنامی کا داغ لگا ہوا تھا لیکن تقدیر مہربان تھی کہ اتنی اچھی نوکری مل گئی۔ کوئی سات سال تک انہوں نے یہ ملازمت کی۔ کھانچے تو پہلے ہی شروع ہو گئے تھے، لیکن پکڑے بہت بعد میں گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے رشوت خور قرار پائے اور جن لوگوں نے ان کے پہلے جرم سے پردہ پوشی کی تھی انہوں نے ہی شدید مخالفت کی اور یہ نوکری بھی ہاتھ سے گئی مگر بھلا ہو عرفان احمد ایڈووکیٹ کا، اس ملازمت کے دوران ہی عرفان احمد سے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ خود انہوں نے عرفان احمد کی کئی بار مدد کی تھی، چنانچہ جب یہ ملازمت بھی ہاتھ سے گئی تو عرفان نے انہیں اپنے ہاں ملازم رکھ لیا اور کئی کام ان کے سپرد کر دیئے۔ وہ عرفان احمد کے اسٹینو بھی تھے اور دفتری امور کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ عدالتی معاملات سے چونکہ بہت اچھی واقفیت تھی اس لئے عرفان احمد کے لئے کام کی شے بن گئے۔

بہرحال گزارا ہو رہا تھا۔ اس گھر میں نادر جیسا جرائم پیشہ آدمی موجود تھا۔ حمیدہ بیگم ہر حالت میں بہتر زندگی کی خواہش مند تھیں۔ سید علی بھی کوئی بہت اعلیٰ کردار کے مالک نہیں تھے، اسی گھر میں رومانہ جیسی لڑکی بھی تھی جو ان سب سے مختلف مزاج رکھتی تھی۔ نرم خو، نرم طبیعت اور خاصی حد تک بولڈ، لیکن بہرحال والدین کے زیر اثر تھی اور ماں باپ کی عزت کرتی تھی۔ باپ سے کبھی کھل کر تو کچھ نہ کہا لیکن چونکہ باپ کے ماضی کے بارے میں معلوم تھا اس لئے یہ ضرور کہتی رہی۔

"ابو! آپ ایک بیٹی کے باپ ہیں، بدنامی آواز دے کر نہیں آتی۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ خدا کیلئے آپ صرف ضرورت پوری کرنے کی بات کریں، اس کے آگے کچھ نہ سوچیں، ہر چیز کے لئے اللہ مالک ہے۔"

"بیٹا، میرے لئے دنیا کی سب سے قیمتی چیز تیرا مستقبل ہے، میں چاہتا ہوں کہ تو ایک اچھی زندگی بسر کرے۔"

"خدا کی قسم ابو! پتہ نہیں کیوں مجھے تقدیر پر ضرورت سے زیادہ ہی بھروسہ ہے آپ یقین کیجئے اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی کرے گا، ٹھیک ہی کرے گا۔"

بہر حال یہ اس گھرانے کی پوری تفصیل ہے۔ بات آگے یوں بڑھتی ہے کہ سید علی ایک دن عرفان احمد ایڈووکیٹ کے وسیع وعریض کمرے میں اپنی کونے کی میز پر بیٹھے کچھ ضروری کاغذات کمپیوٹر میں محفوظ کر رہے تھے اور پوری طرح اس میں منہمک تھے کہ چپڑاسی نے کارڈ لا کر عرفان احمد کو دیا، عرفان احمد اس وقت فارغ بیٹھے پائپ کے کش لگا رہے تھے۔ گاڑھے گاڑھے دھوئیں کی لکیریں ان کے منہ سے خارج ہو رہی تھیں۔ بہت بڑے وکیل تھے۔ پرسنالٹی بھی شاندار تھی، ہر طرح کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے اور ہمیشہ مہنگے سودے کیا کرتے تھے۔ کارڈ پڑھ کر انہوں نے کہا۔

"ہاں میں انہی کا انتظار کر رہا تھا، بلاؤ انہیں۔"

کی بورڈ پر سید علی کی انگلیاں چل رہی تھیں لیکن ان کے کانوں نے عرفان احمد کے الفاظ بھی سنے تھے۔ ایک انگڑائی لے کر انہوں نے شیشے کے اس پار نظر ڈالی۔ سامنے ہی گرین چوک تھا، زبردست ٹریفک چل رہا تھا۔ یہ عمارت شہر کے انتہائی مصروف علاقے میں تھی اور اس کی چوتھی منزل پر عرفان احمد کا یہ دفتر واقع تھا اور جس جگہ سید علی کی میز تھی وہاں سے باہر کا منظر بہت صاف نظر آتا تھا۔ ایک نگاہ شیشے کے اس پار ڈالنے کے بعد سید علی پھر کی بورڈ کی جانب متوجہ ہو گئے۔ البتہ انہوں نے دروازہ کھول کر اندر آنے والے کو بھی دیکھا تھا۔ عرفان احمد ذرا مغرور قسم کے آدمی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے آدمی کا کھڑے ہو کر استقبال نہیں کرتے تھے، لیکن آنے والے کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ عرفان احمد کو بھی اٹھ کر کھڑا ہونا پڑا۔

"میرا نام آذر غیاث غوری ہے اور آپ کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے آپ شہر کے مشہور ترین قانون دان ہیں۔ آپ کے بارے میں کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ عرفان احمد اپنی لائن سے ہٹ کر بھی بہت سے افراد کی مدد کر چکے ہیں اور میرے کام کیلئے آپ سے بہتر آدمی اور کوئی نہیں ملے گا۔"

"بڑے اچھے الفاظ آپ نے میرے بارے میں استعمال کئے، غوری صاحب شکریہ۔ تشریف رکھئے۔"

آنے والا کرسی لے کر بیٹھ گیا، پھر اس نے کہا۔

"آپ نے مجھے وقت دینے کا وعدہ کیا تھا، چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے واقعی وقت دیں کوئی اور مصروفیت قریب نہ آنے دیں۔"

"فکر نہ کریں یہ وقت آپ ہی کیلئے ہے۔"

"جی بے حد شکریہ۔"

آذر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خوبصورت بریف کیس کو سامنے رکھا اور تالے کے نمبر ملانے لگا۔ پھر اس نے بریف کیس کھول کر ایک فائل نکالی۔ بریف کیس کو برابر کی سیٹ پر رکھا اور فائل کو درمیان سے کھول کر عرفان احمد کے سامنے کر دیا۔

"یہ کچھ تھوڑے سے کاغذات ہیں، آپ انہیں میرے تعارفی کاغذات سمجھئے، ایک طویل عرصہ باہر کی دنیا میں گزارا ہے اور اس کے بعد جب وطن یاد آیا آپ یہ کہہ لیجئے کہ تمام خواہشیں پوری ہو گئیں، اعضاء تھک گئے، گوشہ نشینی کا خیال آیا تو وطن واپس آ گیا کہ اس سے بڑی پناہ گاہ یا آپ اسے آخری آرام گاہ کہہ لیجئے اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ باہر کا کاروبار فروخت کر دیا اور خدا کے فضل سے اپنی یہ ساری کمائی وطن منتقل کر لی۔ عرفان صاحب! انسان زندگی میں بہت کچھ کر لیتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسے سچی خوشی مل جائے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دنیا کا کامیاب ترین انسان ہے، کہیں نہ کہیں غم کی گرہ ہوتی ہے۔ میں آپ کو اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میرا ماضی یا پھر آپ یہ کہہ لیجئے کہ بچپن دکھوں اور تکلیفوں میں گزرا ہے۔ نوجوانی کی عمر میں ایک فرنگی جہاز کے ذریعے ملک سے باہر نکل گیا۔ بہت عرصے تک شدید عذاب میں گرفتار رہا۔ چھ سات سال

ملک سے باہر گزارے تھے کیونکہ غیر قانونی طور پر باہر گیا تھا اس لئے ایک دفعہ دھر لیا گیا سزا ہوئی اور اس کے بعد مجھے میرے وطن واپس بھیج دیا گیا۔ تھوڑے سے پیسے کما لئے تھے، اس دوران اور انہیں محفوظ بھی رکھا تھا، بعد میں یہ پیسے منگوا لئے اور یہاں اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا، ایک چھوٹے سے کاروبار کی داغ بیل ڈالی، پھر شادی کر لی۔ حالات بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔ کاروبار نے بھی فروغ پایا لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ایک بیٹا میری ذمہ داری بنا کر چھوڑ گئی تھی، افسر غیاث غوری میری آنکھوں کا تارا تھا، اسی کے سہارے زندگی گزارنے لگا، تعلیم دلائی جو کر سکتا تھا وہ کیا اس کے لئے، لیکن پھر اس نے ایک خانہ بدوش لڑکی سے شادی کر لی۔ میں تو اپنا حسین مستقبل تعمیر کر رہا تھا بیٹے کے ذریعے، میرا خیال تھا کہ اس کے ذریعے میں اپنا ایک خاندان بناؤں گا، لیکن وہ خانہ بدوش لڑکی میری امیدوں پر اوس بن کر گری اور میرا بیٹا مجھ سے چھن گیا، میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس لڑکی کو طلاق دے دے، لیکن وہ پوری طرح اس کے ٹرانس میں تھا، وہ خانہ بدوش لڑکی بہت حسین تھی، اس کا نام سورا تھا، غرضیکہ میرے بیٹے سے میرے اختلافات شدید تر ہوتے چلے گئے اور اس نے میرا گھر چھوڑ دیا۔ میں نے بھی اپنا دل سخت کر لیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میرے اور اس کے یکجا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر وہ سورا کو اپنی زندگی سے نکال دے تو میرے اور اس کے درمیان مفاہمت ہو سکتی ہے۔ بہر حال وکیل صاحب، بہت عرصے تک میں اپنے بیٹے کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ واپس نہیں آیا۔ میں نے اس کی خبر گیری رکھی تھی۔ وہ بدبخت خانہ بدوشوں کے قبیلے میں جا کر رہنے لگا۔ میں نے تو اسے زندگی کی ہر خوشی دی تھی لیکن اس نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، اتنا بددل ہوا میں کہ میں نے اپنا سارا کاروبار بند کر دیا، اپنے اثاثے جمع کئے اور پھر ملک سے باہر نکل گیا۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو مجھے میرے بیٹے کے بارے میں اطلاعات دیتے رہتے تھے، مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہے اور شہر میں ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہ رہا ہے۔ پھر اس کے بعد میرے بیٹے کا انتقال ہو گیا، میں اپنے تاثرات آپ سے بیان نہیں کر سکتا اور نہ ہی مجھے اداکاری کرنا آتی ہے، بہت دکھ ہوا تھا مجھے۔ بہت غمزدہ ہو گیا تھا میں، لیکن اب میرا کوئی واسطہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ سورا یا اس کی

بیٹی سے، بہر حال یہ عمر طویل پتہ نہیں کیسے کیسے احساسات میں مبتلا کر دیتی ہے۔

وکیل صاحب! شانیہ، سورا کی بیٹی میری پوتی جوان ہو گئی ہو گی۔ بہت عرصے سے میرا بیٹا خوابوں میں آ رہا ہے، وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں، وکیل صاحب ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا پاپا، شانیہ۔۔۔ اور میرے دل کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ اس نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے مجھ سے اپنی بیٹی کی سرپرستی مانگی تھی۔ وکیل صاحب بس پتہ نہیں غلطی کون کرتا ہے۔ بہر حال غلطی انسان ہی کرتا ہے، مجھے بار ہا یہ احساس ہوا کہ اتنا سخت نہیں ہونا چاہئے تھا مجھے اپنے بیٹے کے سلسلے میں۔ جو کچھ کر لیا تھا اس نے اسے قبول کر لیتا، ماں باپ بچوں کو کیا نہیں دیتے لیکن عمر کا ایک دور ہوتا ہے جب انسان اپنی انا میں ڈوب جاتا ہے اور جب انا کے تار ٹوٹتے ہیں تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے کیا کچھ کھو دیا۔ وکیل صاحب ایک بار پھر میں نے اپنا کاروبار ختم کیا اور اپنے وطن کا رخ کیا۔ معلومات کرنے پر مجھے پتہ چلا کہ میرے بیٹے نے سورا اور اپنی بیٹی شانیہ کو قبیلے سے الگ کر لیا تھا اور نور پور کے نواح میں کوئی گھر لے کر رہنے لگا تھا۔ ایک آدمی کا نام میرے علم میں آیا تھا۔ یہ اسی قبیلے کا ایک فرد تھا۔ اس کا نام ہاشا تھا۔ ہاشا قبیلے سے الگ ہو گیا تھا اور اس نے بھی میرے بیٹے کے ساتھ ہی وقت گزارا تھا۔ وکیل صاحب' یہ چند نام ہیں۔ سورا کے بارے میں مجھے نہیں معلوم۔ شانیہ کے سلسلے میں بس اتنا پتہ ہے کہ وہ زندہ ہے۔ میرا بیٹا اسی کیلئے میری سرپرستی چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں وکیل صاحب کہ یہ آپ کا کام نہیں ہے، نجانے کہاں کہاں جھک مارتا پھرا ہوں۔ یہاں ایک کوٹھی خرید لی ہے میں نے اور اس میں تنہا دو تین ملازموں کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ وکیل صاحب کھلے دل سے بتایئے کیا آپ میری پوتی کی تلاش میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

عرفان احمد بڑے غور سے غیاث غوری کی بات سن رہے تھے، کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

"پہلا سوال میں آپ سے کرتا ہوں کہ آپ کے ذہن میں یہ بات کیسے آئی کہ اس سلسلے میں کوئی وکیل مدد کر سکتا ہے؟ کسی گمشدہ شخص کی تلاش کے لیے تو پولیس سب سے

زیادہ موزوں رہتی ہے۔"

غیاث غوری کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ "گیا تھا میں ایک پولیس آفیسر کے پاس!"

"پھر کیا ہوا؟"

"جو ہوا بتانا نہیں چاہتا۔" غوری نے کہا اور عرفان احمد چونک پڑا۔

"کیوں، کیوں نہیں بتانا چاہتے، پلیز بتایئے۔"

"نہیں، رہنے دیجئے۔ بس یوں سمجھ لیں مجھ سے تعاون نہیں کیا گیا۔ مذاق اُڑایا گیا میرا۔"

"ہوں چلیئے ٹھیک ہے، مجھے بتایئے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"میں نے اپنی پوری داستان آپ کو سنا دی ہے۔ یہ فیصلہ آپ کریں کہ آپ میرے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں جتنے اخراجات ہوں گے، میں خوشی سے ادا کروں گا مع آپ کی فیس۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے لئے کام کرنے کو تیار ہوں میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے کس طرح کام کا آغاز کرنا ہے آپ کی پوتی شانیہ کی تلاش اب میرا کام ہوگا۔"

غیر ممالک میں طویل وقت گزارنے کے باوجود مجھے اپنے وطن کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ وہاں بھی اہل وطن سے ملاقات ہوتی رہتی تھی اور ان سے وطن کی کہانیاں سننے کو ملتی رہتی تھیں۔ یہاں پرائیویٹ جاسوسی کے ادارے نہیں ہوتے جبکہ باہر کی دنیا میں یہ بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اسی لئے میں نے پولیس سے رابطہ کیا لیکن پہلے ہی مرحلے پر میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا، تب میں نے سوچا کہ کسی معروف اور قابل وکیل سے رجوع کیا جائے۔ کیونکہ آگے چل کر اگر میری تقدیر ساتھ دے اور میری پوتی مجھے مل جائے تو مجھے اپنی دولت بھی اس کے نام منتقل کرنا ہوگی اور اس کیلئے مجھے کسی وکیل کی خدمات درکار ہوں گی۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ بے شک۔۔۔ آپ، آپ پورے اعتماد کے ساتھ مجھے وہ وقت تاریخیں اور سن بتایئے جب آپ بیٹے سے جدا ہوئے، اس کی شادی کی اور آپ کو

اپنی پوتی کی پیدائش کے بارے میں اطلاع ملی۔" غیاث غوری عرفان احمد کو پوری تفصیل بتانے لگا۔

☆ ☆ ☆

سید علی کے ذہن میں ایک چھناکا ہوا۔ کچھ دیر کیلئے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ان کے دماغ پر ضربیں پڑ رہی تھیں۔ ایک ہتھوڑی ان کے دماغ پر ٹھک ٹھک کر رہی تھی اور ایک نام ابھر رہا تھا۔

"ہاشا۔۔۔ ہاشا۔۔۔ ہاشا۔۔۔!" ان کی انگلیاں اب بھی کمپیوٹر کے کی بورڈ پر چل رہی تھیں لیکن ان کی پانی بھری آنکھیں مانیٹر پر نظر آنے والی تحریر نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔ وہ اپنی پریکٹس کے مطابق کام تو کر رہے تھے لیکن آذر غیاث غوری کی پوری کہانی انہوں نے سنی تھی۔ دل بے ایمان ہوتا ہے۔ ایک لمحے کیلئے یہ کہانی سن کر انہوں نے سوچا تھا کہ کاش کسی طرح یہ دولت مند شخص ان کے ہاتھ لگ جائے، ان کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنالے اور رومانہ کا مستقبل سنور جائے۔ ایک احمقانہ خیال اس کہانی کو سننے کے بعد ان کے ذہن میں کئی بار آیا تھا کوئی ایسی تدبیر ہو کوئی ایسی ترکیب ہو کہ آذر غیاث غوری رومانہ کو اپنی بیٹی سمجھ لے۔ ایک احمقانہ تصور تھا جو بار بار ان کے ذہن پر ٹھک ٹھک کر رہا تھا، بس نجانے کیوں یہ کہانی ان کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ آخر غیاث بہت دیر تک عرفان احمد کو اپنی بپتا سناتا رہا۔ عرفان احمد کو اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ تگڑی آسامی ہے، اس کے علاوہ آذر غیاث نے اپنے کاغذات بھی انہیں دکھائے تھے جو یقینی طور پر اس کی جائیداد کے کاغذات تھے۔

بہرحال عرفان احمد نے کہا۔ "آذر غیاث صاحب! جب آپ نے یہ ذمے داری میرے سپرد کی ہے تو پھر آپ کو مکمل طور پر مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا، ایسے کام جلد نہیں ہوتے، وقت لگتا ہے ان میں اور پھر میں سب سے بڑی بات آپ کو یہ بتا دوں کہ کسی اور سے یہ تذکرہ بالکل نہ کیجئے گا، بہت سی مجرمانہ کارروائیاں شروع ہو سکتی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہوں، سب کچھ ہی تو کھو دیا میں نے۔ اصل میں وکیل صاحب! انسان کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، کسی بھی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو، وہ حقیقتوں سے بھٹک جائے تو پھر اسے نقصان اٹھانے

پڑتے ہیں۔ میری عمر کا وہ دور سنہری دور تھا، چاروں طرف سے میری پذیرائی ہوتی تھی۔ بیٹے کے دکھ کو نہ سمجھ سکا اور اسے کھو دیا اور اب وہ آنسو بھری آنکھوں سے مجھ سے التجا کرتا ہے تو میرا کلیجہ کٹتا ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو کوئی بدترین سزا دے ڈالوں۔''

''نہیں جذباتی نہ ہوں غوری صاحب! صبر سے کام لینا ہوگا آپ کو اور بڑا ہی اچھا ہوگا اگر حق دار کو حق رسید ہو جائے۔ آپ مطمئن رہیں میں نے تمام تر تفصیلات لکھ لی ہیں میں آپ کی فائل تیار کرائے دیتا ہوں اور اس کے بعد میں کام کا آغاز کردوں گا۔''

''یہ کچھ تھوڑی سی رقم ہے ابتدائی ضروریات کیلئے، باقی جو کچھ بھی ہوگا میں اس کیلئے خلوص دل سے حاضر ہوں۔''

''بہت شکریہ، آپ اطمینان رکھیں۔'' عرفان احمد نے نوٹوں کی وہ بڑی گڈی اٹھا کر میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا اور پھر کھڑے ہو کر غیاث غوری صاحب سے مصافحہ کیا اور غیاث غوری باہر نکل گئے۔ سید علی اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے، لیکن کام کیا ہو رہا تھا آنکھوں کا پانی یہ دیکھنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے خود کو سنبھال لیا جبکہ عرفان احمد سامنے رکھے ہوئے پوائنٹس پر غور کر رہے تھے، پھر انہوں نے اچانک ہی سید علی کی طرف دیکھا اور بولے۔

''سید صاحب!''

''جی سر۔۔۔!'' سید علی نے ہاتھ روک کر کہا۔

''آیئے ذرا تھوڑی سی ڈکٹیشن لے لیجئے، آپ کو ایک فائل تیار کرنا ہے میرے اس نئے کلائنٹ کی۔''

''جی سر۔۔۔!'' سید علی شارٹ ہینڈ بک لے کر عرفان احمد کے سامنے پہنچ گئے۔ عرفان احمد نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گئے۔

''ہاں لکھئے۔'' عرفان احمد وہ تمام ضروری امور لکھوانے لگے جو ان واقعات سے منسلک تھے، فارغ ہونے کے بعد انہوں نے کہا۔

''یہ پوری تفصیل کمپوز کر کے اس کے پرنٹ نکال لیجئے اور فائل بنا کر مجھے دے دیجئے۔''

''جی سر۔۔۔!'' عرفان احمد نے بجھا ہوا پائپ اٹھایا اور سونے کے لائٹر سے اسے سلگانے لگے جبکہ سید علی اپنی میز پر پہنچ کر پوری طرح مستعد ہو گئے اور وہ رپورٹ ٹائپ کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ساری رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ دماغ تھا کہ ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ چار بجے کے بعد تو سر میں درد شروع ہو گیا تھا، لاکھ کوشش کر رہے تھے کہ نیند آ جائے لیکن آنکھوں میں نیند کا نام ونشان نہیں تھا۔ منصوبے ذہن کے ہر دریچے سے داخل ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ عرفان احمد کی کوئی پانچ لاکھ روپے کی رقم بینک میں جمع کرانے گئے تھے، بینک اوپر کی منزل میں تھا، کاؤنٹر بنا ہوا تھا، دونوں طرف نیچے جانے کیلئے زینے تھے، اس وقت وہ اپنی رقم جمع کرا رہے تھے جب انہوں نے ایک بزنس مین کو دیکھا جو نوٹوں کی گڈیاں رومال میں لپیٹے ہوئے غالباً انہیں جمع کرانے کیلئے ہی آیا تھا۔ وہ گڈیاں اس نے کاؤنٹر پر رکھیں۔ اسی وقت کسی کام سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ساتھ سو سو کے دو نوٹ نکل آئے جو نیچے گر گئے۔ وہ شخص انہیں اٹھانے کیلئے جھکا تو ہوا کے ایک جھونکے نے نوٹ اڑا دیئے اور نوٹوں کا مالک ان دو سو روپے کے نوٹوں کے پیچھے دوڑ پڑا، نوٹ سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے تو وہ شخص بھی ان کے پیچھے پیچھے نیچے اتر گیا۔ رومال میں بندھی ہوئی گڈیاں سید علی سے دو فٹ کے فاصلے پر رکھی ہوئی تھیں اور کسی کو ان کے بارے میں علم نہیں تھا، سید علی کی پاس بک بھی انہیں مل گئی تھی، اگر چاہتے تو گڈیاں بغل میں دبا کر دوسری طرف کے زینوں سے نیچے اتر جاتے۔ ایک لمحے کیلئے دل میں خیال بھی آیا تھا لیکن اس خیال کے ساتھ ہی بدن پر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔ اس دن بھی جب گھر پہنچے تو ساری رات جاگتے رہے، صبح کے وقت تھوڑی سی آنکھ لگی تو عالم خواب میں انہوں نے وہ گڈیاں اپنے قبضے میں دیکھیں اور بری طرح اچھل پڑے۔ پھر پورا دن افسردگی میں کٹا کہ ذرا سی ہمت کر لیتے تو کئی لاکھ روپوں کے مالک بن جاتے۔ کوئی کلیم نہیں کر سکتا تھا کہ نوٹوں کی وہ گڈیاں انہوں نے اٹھائی تھیں، آج رات بھی ان پر وہی کیفیت طاری تھی، لیکن یہ ساری صورت حال خاصی خراب تھی، صبح کو حمیدہ بیگم نے ان کی شکل دیکھی تو بولیں۔

"اللہ خیر، کیابات ہے، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں منہ اترا ہوا ہے۔"
"بس وہ نیند نہیں آئی رات کو۔"
"اللہ خیر۔۔۔کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"
"نہیں بھئی، چلو ناشتہ تیار کرو، ذرا نہالوں کسل دور ہو جائے گی۔" سید علی نے کہا اور اس کے بعد اٹھ کر غسل خانے چلے گئے۔ ناشتے پر رومانہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ سید علی صاحب نجانے کیوں غور سے رومانہ کو دیکھتے رہے اور پھر رومانہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
"کیا بات ہے ابو! آپ آج مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں؟"
"نہیں بیٹا! ہاں، بس وہ سوچ رہا ہوں کہ آخر وہ کونسا ذریعہ ہو کہ میں تمہیں شہزادیوں جیسی زندگی دے سکوں۔"
"چھوڑیئے ابو! شہزادیوں کی کہانی پرانی ہوگئی۔ سب مر کھپ گئیں، انسان عام آدمیوں کی طرح رہے تو زیادہ خوش رہتا ہے۔"
"نہیں بیٹا! یہ تمہاری سوچ ہے، باپ کی سوچ اس سے مختلف ہوتی ہے۔" رومانہ ہنس کر خاموش ہوگئی تھی

بہر حال تیاری کر کے آفس پہنچ گئے۔ عرفان احمد کے ساتھ کورٹ جانا تھا۔ چنانچہ فائل وغیرہ اکٹھی کر کے نوٹس تیار کیئے اور اس کے بعد کورٹ چل پڑے، وہاں معاملات خوش اسلوبی سے نمٹائے، لیکن ذہن میں وہی جوار بھاٹا اٹھا ہوا تھا۔ وہ سوچتے رہے تھے اور ان کے ذہن میں نجانے کیا کیا تدبیریں اور ترکیبیں آتی رہی تھیں۔ سمجھدار آدمی تھے، عرفان احمد کو شبہ نہیں ہونے دیا۔ دوپہر کے بعد آفس آئے اور تمام ضروری رپورٹیں تیار کرنے لگے۔ چار بجے کے بعد عرفان احمد نے کہا۔
"سید صاحب! میں جا رہا ہوں، آپ باقی تمام کام سنبھال لیجئے اور پانچ بجے گھر چلے جایئے، کل اتوار ہے، پرسوں آپ سے ملاقات ہوگی۔"
"جی سر۔۔۔!"
"تمام چیزیں سنبھال کر رکھ جایئے گا۔"

"جی آپ اطمینان رکھئے۔" سید علی نے کہا اور پھر انہوں نے شیشے کے دیدبان سے گرین چوک کے پارکنگ پلاٹ سے عرفان احمد کی کار باہر نکلتے ہوئے دیکھی جسے وہ خود ڈرائیور کر رہے تھے، اس کے بعد انہوں نے کمپیوٹر کی میموری میں وہ رپورٹ تلاش کی جو آذر غیاث غوری کے سلسلے میں تیار کی گئی تھی اور اس کے بعد اس کے مزید دو پرنٹ نکال لئے انہیں فولڈ کر کے احتیاط سے اپنے لباس کے اندرونی حصے میں رکھا اور پھر باقی کے دفتری کاموں میں مصروف ہوگئے۔ وقت مقررہ پر انہوں نے ساری فائلیں بند کیں۔ انہیں احتیاط سے رکھا اور باہر نکل آئے۔ پھر بس نے انہیں ان کے گھر کے دروازے پر اتار دیا اور وہ گھر کے اندر داخل ہوگئے، رومانہ کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ کالج سے تو واپس آگئی تھی، کہنے لگے۔
"حمیدہ! میں ذرا اندر کام کر رہا ہوں۔ تم چائے مجھے اندر ہی پہنچا دو۔"
کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر آفس کا کام وہ گھر پر لے آیا کرتے تھے۔ حمیدہ بیگم نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ چائے آئی تو انہوں نے چائے کا کپ لے کر حمیدہ بیگم سے معذرت کی اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے وہ کاغذ نکال کر سامنے پھیلا لئے تھے۔ سوچوں کے دائرے پھیلتے سکڑتے رہے اور ان کا ذہن ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا۔ کیا کریں؟ کیسے کریں؟ پھر اچانک ہی ان کے ذہن میں چھناکا ہوا تھا، ایک نام ان کے ذہن میں آیا تھا نادر۔۔۔۔۔۔ چھوٹا بھائی جو اچھا خاصا جرائم پیشہ بن چکا تھا، جس کے بارے میں کئی بار ان کے علم میں باتیں آئی تھیں اور انہوں نے جدوجہد کر کے نادر کو قانون کے شکنجے میں جانے سے بچایا تھا، وہ اپنے قانون شکن بھائی سے سخت نالاں تھے۔ نادر کبھی ان کے سامنے گردن نہیں اٹھاتا تھا، بس یہی اس کی خوبی تھی۔ کافی احترام کرتا تھا بڑے بھائی کا، لیکن ظاہر ہے جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ ترک نہیں کر سکتا تھا، شام کو انہوں نے نادر سے کہا۔
"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے ایک ضروری کام ہے۔"
"جی بھائی جان! جیسا آپ کا حکم، کتنے بجے چلنا ہے؟"
"بس رات کا کھانا کھانے کے بعد نکلیں گے۔"

"جی بہتر۔" رات کا کھانا کھانے کے بعد سید علی، نادر کو ساتھ لے کر چل
پڑے، انہوں نے ایک ایسے جھونپڑا ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جہاں بہت زیادہ رش نہیں ہوتا تھا
نادر کسی قدر حیران نظر آ رہا تھا، اس نے جھونپڑا ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا میری کوئی شکایت ملی ہے، آپ کو بھائی جان؟"

"نہیں نادر! آج مجھے تم سے کچھ کام ہے۔"

"سر آنکھوں پر، آپ حکم دیجئے۔"

"آج میں تم سے وہ کام کرانا چاہتا ہوں جس کیلئے تمہیں ہمیشہ سرزنش کرتا رہا
ہوں۔" سید علی نے کہا اور نادر کی آنکھوں میں حیرانی ابھر آئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے بھائی
کو دیکھ رہا تھا۔

سید علی جھجک رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کچھ
دیر کے بعد انہوں نے کہا کہ "بات اصل میں یہ ہے نادر کہ میں نے زندگی میں زیادہ
ٹیڑھے میڑھے راستے نہیں اپنائے، بیٹی اور بیوی کے علاوہ تم بھی میری ذمے داری تھے،
یقین کرو اگر کبھی اوپر کی کچھ آمدنی حاصل کر لی تو ضمیر پر ایک بوجھ رہتا تھا۔ دنیا ایک ہی
بات کہتی تھی کہ سید صداقت علی وقت بہت بدل گیا ہے۔ اب اگر تم عزت اور شرافت کی
بات کرتے ہو تو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔ عزت دار کون ہیں، پذیرائی کس کی ہوتی ہے۔
کسی ایک شعبہ کا نام نہیں لیا جاتا، لیکن خیر چھوڑو ان باتوں کو میرا مطلب یہ کہ آج بھی نیکی
سچائی اور شرافت کو بنیادی حیثیت دیتا ہوں، لیکن بیٹا کچھ بھلا نہیں ہوا، سو مرتبہ نوکری سے نکا
لا دیا گیا۔ بات وہی کی وہی رہی۔ میں سوچتا ہوں اکلوتی بیٹی کے لیے اور خود تمہارے لیے
کچھ بھی نہیں کر سکا جو کرنا چاہیے تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے نادر کہ کوئی ذریعہ ہاتھ آتا
ہے، لیکن انسان اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ ان دنوں میرے ساتھ کچھ ایسی صورت
حال ہے، بہت غور کرنے کے بعد میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔"

"جب آپ یہ بات محسوس کرتے ہیں بھائی جان! پھر مجھے یہ بتائیے کہ کیا میں
آپ کا بیٹے کی طرح احترام نہیں کرتا۔ میں نے سینکڑوں بار آپ سے یہ بات کہی ہے کہ
مجھے اپنا بیٹا ہی تصور کریں، زندگی بھر آپ کے سامنے کبھی سرکشی نہیں کروں گا بتائیے کیا بات

ہے؟"

"یہ بات تمہیں معلوم ہے کہ میں مرزا عرفان احمد کے ساتھ کام کرتا ہوں۔
مرزا عرفان احمد کے پاس ایک صاحب آذر غیاث غوری کے نام سے آئے"۔ سید علی
صاحب نے پوری تفصیل سے ساری بات سنا دی اور نادر حیرت سے سید علی کا منہ دیکھتا رہا۔
سید علی نے کچھ لمحہ کے لیے خاموشی اختیار کی نادر نے کہا۔

"مگر بھائی جان! ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟"

"تم کر سکتے ہو نادر! جو آئیڈیا میرے ذہن میں آیا ہے وہ بہت عجیب ہے بلکہ
ایک طرح سے اگر یہ کہوں کہ ایک ڈرامہ سا ہے تو غلط نہیں ہوگا ہمیں کئی افراد کو اس کام
میں شامل کرنا ہوگا میرے ذہن میں رومانہ ہے۔"

"رومانہ۔۔۔!" نادر اچھل پڑا۔

"ہاں نادر علی! ہاشا نامی کسی شخص کو تیار کیا جائے اور نور پور کے نواحی علاقوں میں
سے کسی ایسی جگہ کی نشان دہی کی جائے جہاں ایک لڑکی جس کا نام شانیہ ہے، رہتی ہے یہ
شانیہ غیاث غوری کی پوتی ہے۔ آذر کے بیٹے افسر غیاث کی اولاد، سمجھ رہے ہو نا میری
بات؟"

"جی، جی۔۔۔!"

"ذرا تفصیل سے۔۔۔۔ وہ لڑکی رومانہ ہوگی۔" سید علی نے کہا اور نادر اچھل
پڑا۔

"رو۔۔۔رو۔۔۔رومانہ ہماری رومانہ؟"

"ہاں رومانہ اس لڑکی کا کردار ادا کرے گی ہم جس طرح بھی ممکن ہو سکے گا
رومانہ کو غیاث کے پاس پہنچائیں گے۔ لمبی پلاننگ کرنی پڑے گی۔ نادر کم از کم میں یہ سمجھتا
ہوں کہ تم ایسے کاموں کے ماہر ہو۔"

"ایک بات بتائیے بھائی جان! آپ کو خدا کی قسم سچ بتائیے گا۔"

"ہاں پوچھو!"

"کیا میرا مذاق اڑا رہے ہیں یا کوئی امتحان لے رہے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ

کرتا ہوں کہ اس کے بعد کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ آپ کو میری قسم ہے بھائی جان! آپ میرا امتحان لے رہے ہیں؟''

سید علی نے گردن جھکالی اور آہستہ سے بولے۔

''نہیں نادر! میں بالکل سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں ایک داؤ لگا دینا چاہتا ہوں۔ ناکام رہا تو جو بھی حشر ہوگا میرا، اسے برداشت کرلوں گا' مکمل طور پر ساری ذمے داری اپنے سر لوں گا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی' پیدا ہوا، جوانی آئی، شادی ہوئی، والدین کا انتقال ہوا دل نے ہمیشہ یہی چاہا کہ تھوڑی سی اچھی زندگی ملے، جدوجہد کرتے کرتے بوڑھا ہوگیا، بس تن کے کپڑے اور پیٹ کی روٹی کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ رومانہ بھی مجھے بہت پیاری ہے اتنی پیاری کہ میرے خواب اس کے مستقبل سے سجے ہوتے ہیں۔ عالم خواب میں، میں رومانہ کو اچھی زندگی گزارتے دیکھتا ہوں اور جب حقیقت کی دنیا میں آتا ہوں تو ہاتھ ملنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ میرے وسائل نہیں ہیں بہت دنوں تک کوشش کرتا رہا ہوں کچھ حاصل نہیں ہوا، ہوسکتا ہے اس طرح کچھ بات بن جائے۔''

''اگر یہ بات ہے بھائی جان! تو آج آپ اپنے اس کھوٹے سکے کو چلا کر دیکھ لیجئے۔ سچ کہہ رہا ہوں بھائی جان! کہ ایک بار آزما لیجئے، آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ آپ کا یہ نامعقول بھائی کیا چیز ہے۔ بھائی جان آپ کا کہنا بالکل درست ہے۔ یہ دنیا بڑی عجیب و غریب جگہ بن کر رہ گئی ہے، آپ اپنی شرافت کا ڈھول اپنے گلے میں ڈال کر پیٹتے پھریئے، لوگ صرف آپ کو ایک ڈھولکی ہی سمجھیں گے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''دیکھو بات خطرے کی ہے۔ جس شخص نے اتنی دولت کمائی ہے اور جو زندگی کے ان تمام نشیب وفراز سے گزرا ہے وہ احمق نہیں ہوگا۔ بے شک میں غیاث غوری کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا' لیکن جو کاغذات آذر غیاث غوری نے وکیل صاحب کو پیش کیے ہیں۔ ان سے مکمل طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ باہر کی دنیا میں اس کا کاروبار تھا۔ اسے فروخت کرکے وہ یہاں آگیا ہے اور اس نے ایک عظیم الشان دولت یہاں منتقل کرالی ہے، جس کی واحد وارث اب اس کی پوتی شانیہ ہوگی، ان کاغذات کو دیکھنے سے اس کی زبردست دولت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وکیل صاحب اور غیاث غوری ان

دونوں کو مقابلے پر رکھنا ہے ہمیں اور کامیابی حاصل کرنی ہے۔''

''آپ نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے، میں اپنی تجویز پیش کروں گا، مجھے چوبیس گھنٹے دیجئے اور ساری کہانی کی تفصیل مجھے فراہم کردیجئے۔''

''وہ کہانی میرے پاس موجود ہے جو رپورٹ میں نے وکیل صاحب کے لیے تیار کی ہے اس کے دو پرنٹ میں نے اپنے لیے حاصل کرلیے ہیں۔''

''رات کو میں ان کا جائزہ لوں گا' بس آپ یوں سمجھے کہ اگر آپ کچھ کرنے پر آمادہ ہیں تو پھر یہ ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔'' نادر نے کہا اور سید علی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو ہوں بلکہ تمہارے شانہ بشانہ ہوں۔''

''فکر نہیں کریں بھائی جان! آج تک اور کیا کیا ہے ایسے ایسے پوے جمع کر رکھے ہیں جو آسمان میں سوراخ کردیں۔''

نادر علی نے فخریہ کہا اور سید علی فکرمندانہ انداز گردن ہلانے لگے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد نادر علی نے اپنا منصوبہ سید علی کو پیش کردیا۔ ''بہت سادگی سے کام کریں گے بھائی جان! بھابی کو بھی اس کام میں شریک کرنا پڑے گا اور یہ ذمے داری آپ کی ہوگی۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں میں سارا ذمہ لیتا ہوں آپ کو میں شریک نہیں کروں گا۔ آپ بالکل اجنبی بنیں گے۔ بس آپ کا کام یہ ہوگا کہ وکیل صاحب جو کررہے ہیں اس کی رپورٹ مجھے ملتی رہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوئی تو آپ سنبھال لیجئے گا، باقی سب خیر ہے۔''

''پروگرام کیا ہے تمہارا؟''

''بھائی جان! اس کیلئے ہمیں سب سے پہلے رومانہ کو تیار کرنا ہوگا، بلکہ رومانہ کو ٹریننگ دینا ہوگی، یہ کام بھی میں کرلوں گا، میرے پاس بہت سے ایسے کردار ہیں جو ضرورت کے تمام معاملات سنبھال لیں گے۔ مثلاً ہمیں ایک ہاشا تیار کرنا ہوگا، سمجھ رہے ہیں نا، ایک ایسا بوڑھا جسے ایک کچی آبادی سے برآمد کیا جائے گا۔ آپ ایک بڑے اخبار میں ہاشا کے بارے میں اشتہار دیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ہاشا کا کوئی وجود ہے تو اسے ذہن میں رکھا جائے۔ بس آپ یوں سمجھ لیں کہ آپ مجھے اس بارے میں اطلاع دیتے

رہیں گے۔ ہاشا کو وکیل صاحب تک پہنچایا جائے گا اور وکیل صاحب اس سے سوالات
کریں گے۔ ہاشا کی ٹریننگ میں کرلوں گا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں اور اس کے بعد ہم نور
پور کے نواح میں ایک ایسا گھر دریافت کریں گے جہاں سورا اور اس کی بیٹی رہتی ہے، ہم
سورا کو بھی راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔ کیونکہ اگر سورا کو ہم آذر غیاث کے گھر تک پہنچائیں تو
ایک ایسا کردار وہاں مستقل رہے گا جس سے ہر وقت خطرہ لاحق رہے گا۔ سورا بھی مرگئی، رہ
گئی صرف شانیہ جسے ہم وہاں سے برآمد کریں گے اور شانیہ کا کردار رومانہ ادا کرے گی۔"

"نادر علی! مجھے رومانہ سے خطرہ ہے۔"

"بھائی جان! آپ صرف ایک بات دیکھ لیجئے، میں جو کروں مجھے کرنے دیں
اس میں کوئی بڑی مداخلت نہ ہونے پائے۔"

"میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔" سید علی نے کہا۔

☆ ☆ ☆

رومانہ کے قدم رک گئے۔ سرمد نے چونک کر اسے دیکھا، رومانہ بوڑھے فال
والے کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہے رومانہ! آج پھر سوجھی ہے۔" سرمد نے بیزاری سے کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے سرمد! کہ بابا کے سامنے رکھے سارے لفافے کھول کر دیکھ
لوں یقین کرو اس دن کی تحریریں میرے دل پر نقش ہوگئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے آجاؤ" سرمد نے کہا۔ طوطے نے لفافہ اٹھایا۔ رومانہ نے تحریر
پڑھی، لکھا تھا۔

"ایثار یہ نہیں ہے کہ چھوٹا موٹا پہن لیا جائے، روکھی سوکھی کھالی جائے، ایثار یہ
ہے کہ اپنی خواہشات، مسرتوں اور چاہتوں کی قربانی دی جائے"۔ رومانہ نے عجیب سی
نگاہوں سے سرمد کو دیکھا تو سرمد بولا۔

"جی فرمایئے۔" پھر اس نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر بابا کو دیئے اور بولا۔

"آیئے کل کی نصیحتیں کل کے لئے چھوڑ دی جائیں، آج کیلئے اتنا کافی ہے۔"

"چلو۔" رومانہ نے اس کے ساتھ کالج کیفے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے

کہا، پھر بولی۔

"سرمد! تم اس بابا کو کیسے سمجھتے ہو؟"

"ولی، درویش، قطب ابدال یا۔۔۔"

"اگر کچھ کم سمجھ رہا ہوں تو آگے آپ بتا دیجئے۔"

"مذاق مت اڑاؤ، عجیب و غریب تحریریں ہیں اس کی، ان میں فال والی بات کیا
ہے؟"

"نہیں ہے نا، بس کمانے کھانے دو بیچارے کو، اپنا حصہ تم نے ادا کر دیا۔ کبھی دل
چاہے اور جیب میں زیادہ پیسے ہوں تو ایک دو فال اور کھلوا لینا۔"

دونوں کالج کیفے میں جا بیٹھے۔ سرمد نے کہا۔

"رومانہ! تقریباً پندرہ دن تک میں کالج نہیں آسکوں گا۔"

رومانہ چونک پڑی اس نے سرمد کو دیکھا، پھر بولی۔

"کیوں؟"

"بس ایک کام آن پڑا ہے، آؤٹ آف سٹی جا رہا ہوں، واپس آکر بتاؤں گا
کہ صورت حال کیا ہے۔ ابھی تذکرہ بھی نہ کرتا لیکن میری گمشدگی سے تمہیں پریشانی ہوتی
اس لئے بتا رہا ہوں۔"

"اتنے سارے دنوں کیلئے۔" رومانہ نے کہا۔

"ہاں رومانہ، سوچتا ہوں تو بڑے عجیب عجیب احساسات ہوتے ہیں۔ واقعی
ایثار صرف یہ نہیں ہوتا کہ روکھی سوکھی کھالی جائے، موٹا جھوٹا پہن لیا جائے، میں پندرہ دن
کیلئے تمہیں الجھن میں نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

"کمال کی بات ہے، الجھن تو تمہارے ان الفاظ سے ابھی شروع ہوگئی۔"

"چھوڑو یار چائے پیتے ہیں۔"

سرمد آج پورا دن ہی عجیب سے موڈ میں رہا تھا۔ رومانہ نے کئی بار سرمد سے پوچھا
"کہ مسئلہ کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"کہ بالکل ذاتی سی بات ہے، براہ کرم میری واپسی کے بعد ہی مجھ سے

پوچھنا۔" رومانہ خاموش ہوگئی تھی، لیکن کالج کیفے سے اٹھنے کے بعد سے گھر تک اور گھر آنے کے کاموں میں مصروف ہوکر وہ سرمد کے الفاظ میں ہی گم رہی تھی۔ پھر اس کے بوجھل خدشات کی پہلی تصویر سامنے آ گئی۔

حمیدہ بیگم بیٹھی ہوئی تھیں اور کچھ عجیب سے تاثرات تھے ان کے چہرے پر۔ سید علی بھی موجود تھے، نادر البتہ کہیں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ ویسے بھی ضروری نہیں ہوتا تھا کہ وہ ناشتہ یا کھانے پر موجود ہو' کبھی وقت پر آ گیا تو کھانے میں شریک ہو جاتا ورنہ جب آتا حمیدہ بیگم اسے کھانا گرم کر دیتی یا پھر یہ ذمہ داری رومانہ نبھا جاتی۔ ایک بار پھر رومانہ نے اجنبی سی کیفیت محسوس کی اور سید علی کو دیکھتی ہوئی بولی۔

"آج سارا ماحول ہی الجھن کا شکار ہے، آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"بیٹا! اپنی اندرونی کیفیت کا جائزہ لے رہا ہوں' ایسا لگتا ہے کہ جیسے بڑی بیماری کا شکار ہونے والا ہوں' طبیعت کچھ عجیب عجیب سی ہو رہی ہے۔"

"ابو چلئے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔"

"ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا! ڈاکٹر تم خود ہو اس وقت علاج تم کر سکتی ہو' رومانہ یقین کرو' ہمیں اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے لیکن یہ آرزو نہ جانے کیوں اب عمر کی اس منزل پر آ کر انتہائی شدید ہو گئی ہے کہ تمہارے لیے اچھا گھر تلاش کروں۔ وقت اور ماحول کو دیکھتا ہوں تو کچھ ایسے واقعات سامنے آ جاتے ہیں جن سے طبیعت وحشت کا شکار ہو جاتی ہے میں سوچتا ہوں کہ کیسے کیسے لوگ بیٹیوں کے معاملہ میں اتنی زبردست الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو میں کیا اور میری اوقات کیا۔"

"ویسے ابو! ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"کہو نہیں مانوں گا برا۔"

"ابو! بات یہ ہے کہ بزرگ اپنی اولاد پر اعتماد نہیں کرتے' اور سوچتے ہیں اور خاص طور پر بیٹیوں کے معاملے میں کہ اس کا ہاتھ پکڑا کر اسے صحیح جگہ نہ بٹھا دیا تو پتہ نہیں یہ گر کر کہاں گم ہو جائے گی۔ ہمیں تقدیر پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

"بیٹا! کتابی باتیں کر رہی ہو۔ کاش تم میری آنکھوں سے حقیقت کی دنیا کو

دیکھتیں۔ وکیل صاحب عدالت میں کیس لڑتے ہیں اور میں لرزتا رہتا ہوں۔ اس سے پہلے زندگی بھی یہی تھی' محکمہ پولیس میں تھا' تو ایسے واقعات نگاہوں کے سامنے آتے تھے کہ تم سوچ نہیں سکتی اور پھر ان سب کا نچوڑ ایک ہی ہوتا تھا' اگر تمہارے پاس دولت ہے تو تم بیٹی کو اچھا گھر دے سکتے ہو ورنہ پھر زمانے کی ٹھوکریں ہوتی ہیں اور۔۔۔ ماں باپ کی بے بسی۔"

"خدا کرے ایسا نہ ہو مگر بیٹا! باپ کے سینے کیا تمہاری سوچوں کی جگہ پا سکتے ہیں تمہارے پاس چاردیواری کا تجربہ ہے اور میرے پاس جلے ہوئے جسم' وہ تیزاب پڑے ہوئے چہرے، جنہیں دیکھا نہیں جا سکتا' صرف اور صرف دولت کا شکار، بیٹا! بہت دن سے یہ دھواں سینے میں سلگ رہا تھا۔ نادر کھوٹا سکہ ایک ناکارہ وجود اسے ماں کی وصیت کی زنجیر اس گھر میں روکے ہوئے تھی ورنہ کسی بھی لمحہ میں اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا لیکن بس قدرت کے معاملات ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی ذریعہ کوئی نہ کوئی وسیلہ، کسی نہ کسی شکل میں پیدا ہو جاتا ہے اور انسان کی ساری سوچیں سوکھے پتوں کی طرح اڑ کر کہیں سے کہیں چلی جاتی ہیں۔ نادر نے کافی دن پہلے مجھ سے کہا تھا کہ بھائی جان اتنے الجھے الجھے کیوں رہتے ہیں۔ کچھ ایسی ہمدرری سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ میں پگھل کر موم ہو گیا اور میں نے اسے اپنی بپتا سنا دی' وہ خاموش ہو گیا اور آخر کار اپنی سوچ کے مطابق وہ سمندر کی گہرائیوں سے ایک موتی نکال لایا اور اس نے میرے سامنے اپنی تجویز پیش کی' بیٹا! ہمیشہ اس کے عمل کے خلاف رہا ہوں' کبھی اس کے مزاج سے اتفاق نہیں کیا' لیکن یہاں آ کر جس کردار کا مظاہرہ کیا اس نے نہ صرف مجھے متاثر کیا بلکہ میں اور حمیدہ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔"

"میں تو پہلے بھی آپ سے کہتی تھی ابو! وہ اتنے برے نہیں ہیں۔"

"مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا ہے' نادر تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے' بیٹی میں اور حمیدہ اس سے متفق ہو گئے ہیں۔ تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا' حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ تم نادر کی تجویز کی سخت مخالفت کرو گی لیکن بیٹا! یہ مخالفت مناسب نہیں۔"

"کیا تجویز ہے ابو! آج میرا ذہن پوری طرح پریشانی کا شکار ہو رہا ہے ہر طرف سے الجھی ہوئی کہانیاں سننے کو مل رہی ہیں۔"

"ہر طرف سے۔۔۔؟"

"میرا مطلب ہے آپ کی طرف سے۔" رومانہ نے بات بناتے ہوئے کہا ورنہ اسے سرمد کی بات یاد آ گئی تھی۔ سید علی نے اسے کچھ نہیں بتایا البتہ نادر گھر واپس آ گیا تھا، رومانہ خود ہی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

"اس سے پہلے نادر چچا! کہ آپ مجھے بلائیں میں خود آ گئی ہوں، بتایئے کیا بات ہے۔"

"بھائی جان نے تمہیں کچھ اشارے دیئے؟"

"نہیں میرا ذہن سخت مشکل کا شکار ہے۔ آپ بتایئے پلیز کیا بات ہے؟"

"بیٹھو رومانہ! بڑے غور سے سننا میری باتیں، سمجھنا انہیں اور اس کے بعد فیصلہ کرنا، دیکھو بیٹا! میں نے گھر میں کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، لیکن ظاہر ہے میرے جو راستے ہیں گھر والے اس کی پذیرائی نہیں کر سکتے۔ یہ سب اچھے لوگ ہیں، میں برا آدمی ہوں، لیکن بیٹا میرا بھی تو کوئی نہیں ہے تم لوگوں کے سوا، بھائی جان جس الجھن کا شکار ہیں، میں اس الجھن کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں رہا ہوں، دیکھو بیٹے جس کے جو راستے ہوتے ہیں وہ انہی پر عمل کر کے اپنا کام کر سکتا ہے۔ اب میں ذرا تفصیل سے بتا رہا ہوں، ایک شخص ہے جس کا نام آذر غیاث غوری ہے، بیرون ملک سے یہاں آیا ہے، بہت دولت مند ہے، اس کی زندگی سے ایک کہانی چمٹی ہوئی ہے، میں تمہیں اس کے بارے میں تفصیل بتاتا ہوں۔"

نادر علی بڑی باریک بینی سے رومانہ کو وہ تفصیل سنانے لگا، اس نے اس کہانی کے ایک ایک پہلو کو بڑی ہوشیاری سے اجاگر کیا، رومانہ حیرت اور دلچسپی سے یہ ساری تفصیل سن رہی تھی، نادر علی خاموش ہوا تو وہ دلچسپی سے بولی۔

"یہ تو بالکل کوئی فلمی کہانی معلوم ہوتی ہے یا ٹیلی ویژن کی کوئی سیریل، مگر، مگر آپ کیا سوچ رہے ہیں نادر چچا۔۔۔؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں رومانہ کہ وہ لڑکی شانیہ کوئی اور نہیں تم ہو، تمہیں شانیہ کی شکل میں آذر غیاث کے پاس پہنچنا ہے اور شانیہ کا کردار ادا کرنا ہے۔"

رومانہ ہنس پڑی پھر بولی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں نا؟"

"نہیں رومانہ! بالکل مذاق نہیں کر رہا، یہ سب کچھ کرنا ہے، ہر قیمت پر۔"

"یعنی میں شانیہ بن کر اس شخص کے گھر پہنچ جاؤں اور اس سے کہوں کہ میں شانیہ ہوں اس کی پوتی، نادر چچا میں اتنی بڑی اداکارہ نہیں ہوں۔"

"میں تمہیں تربیت دوں گا، میں تمہیں اس سے بھی بڑی اداکارہ بنا دوں گا۔"

"نا بابا نا، میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی اگر اسے پتہ چل گیا۔ اصل شانیہ اسے مل گئی تو کیا ہو گا؟"

"بیٹا! اسے پتہ چلے گا نہ اصل شانیہ اسے ملے گی۔"

"کیوں نہیں ملے گی، اگر وہ تلاش کرتا ہے تو کیوں نہیں ملے گی؟"

"اس لئے کہ میں ان سب کو ختم کر چکا ہوں۔" نادر علی نے سفاک لہجے میں کہا اور پہلی بار رومانہ کے بدن میں لرزشیں پیدا ہو گئیں۔

"ختم۔۔۔یعنی قت۔۔۔قتل؟"

"ہاں، میں ان سب کو قتل کر چکا ہوں۔"

"نادر چچا! آپ۔۔۔۔آپ قاتل بھی ہیں۔"

"میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں رومانہ اسے مجھ تک محدود رہنے دو، تم اس گھر میں جاؤ گی، تمہیں پتا نہیں کہ کتنی بڑی دولت کی مالک بن جاؤ گی، تمہیں ہر قیمت پر اس شخص کو یہ یقین دلانا ہو گا کہ تم اس کی پوتی شانیہ ہو، میں تمہیں اس کہانی کے ہر پہلو سے آگاہ کر دوں گا اور بیٹا! تمہیں یہ کرنا ہے اور چونکہ تم اس وقت ایسے گہرے راز سے واقف ہو چکی ہو جس کا تعلق میرے لئے بھی زندگی اور موت کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے کل سے تم کالج نہیں جاؤ گی بلکہ میں بھائی جان کی اجازت سے تمہیں ایک اور جگہ لے جاؤں گا جہاں میں تمہاری تربیت کروں گا۔"

رومانہ نے پہلی بار چچا کو اجنبی نگاہوں سے دیکھا، نادر علی کی کہانیاں تو وہ بہت سن چکی تھی، لیکن اس وقت جو نادر علی اسے نظر آ رہا تھا وہ درحقیقت ایک بھیانک اور سفاک مجرم تھا، وہ لرز کر رہ گئی، دیر تک خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"کیا ابو بھی آپ سے اتفاق کر رہے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔۔میں نے ان سے بھی یہی بات کہہ دی ہے کہ بھائی جان یہ سب کچھ رومانہ کیلئے کر رہا ہوں میں، اگر آپ نے بھی میری نیت پر شک کیا تو پھر ایک آخری جرم کروں گا اور آخری جرم کے بارے میں میں ابھی بتاؤں گا نہیں، لیکن رومانہ وہ آخری جرم اس گھر کی مکمل تباہی ہوگی۔ سوچ لینا اور میری ہدایت ہے کہ دروازے سے باہر قدم مت رکھنا اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

یہ کہہ کر نادر علی اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ رومانہ کے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا، وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔ نادر علی آخر میں بہت خونخوار ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ہمیشہ رومانہ سے شفقت کا اظہار کیا تھا، کبھی اس سے سخت نہیں ہوا تھا۔ گھر والوں سے وہ ہمیشہ ہی نرم رہتا تھا اور ان کی عزت کرتا تھا، لیکن ایک شخص جو اندر سے مجرم ہو کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتا ہے، کیا واقعی اس کیلئے برے وقت کا آغاز ہو گیا ہے۔ حمیدہ بیگم سے اس نے کہا۔

"امی! یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں کیا آپ اس سے اتفاق کرتی ہیں؟"

"رومانہ! میں نے ساری زندگی تمہارے ابو کی اطاعت کی ہے، جب مجھے رخصت کیا گیا تھا تو میری ماں نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا! دنیا کی ریت یہی ہے، شوہر کی خوشی ہی نجات کا راستہ ہوتی ہے۔ تم کبھی ایسا نہ کرنا کہ اپنے شوہر کو ناراض کر کے وقت گزارنے کی کوشش کرو، مجھے بتایا تھا سید صاحب نے ، میں خود حیران تھی لیکن بیٹا ان کی سوچ تمہارے حق میں ہے، راستہ بے شک غلط ہے لیکن جو کچھ کر رہے ہیں وہ تمہارے لئے ہی کر رہے ہیں۔"

"امی! میں آج آپ کو ایک بات بتاؤں، آپ خدا کیلئے میرے مستقبل سے خوف زدہ نہ ہوں، بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے اپنی زندگی کیلئے ایک ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے، وہ بھی ہم جیسا ہی ہے اور امی سچ بتاؤں مجھے ریشم کے لحاف نہیں چاہئیں، مجھے فوم کے گدے نہیں چاہئیں، یہ ٹوٹی ہوئی چارپائیاں میرا مزاج ہیں، امی مجھے اپنے گھر سے رخصت کریں تو کسی ایسی ہی جگہ کریں، جہاں ہمارے گھر جیسی چارپائیاں موجود ہوں، میں ریشم

کی سیج پر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔"

"یہ فلمی باتیں مت کرو بیٹا! روشنی بہر حال زندگی ہوتی ہے، تاریکیوں میں آدمی مجبوراً جی لیتا ہے، جب روشنی کو قریب سے دیکھو گی تو اس کی اصل حیثیت معلوم ہوگی۔"

"آپ لوگ پوری طرح شکار ہو چکے ہیں، میرا خیال ہے ابو سے بات کرنا بھی بیکار ہے کیونکہ انہوں نے جس لہجے میں مجھے نادر چچا کی بات ماننے کیلئے کہا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی نادر چچا سے متفق ہیں۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔"

"مگر مجھے سوچنا ہوگا امی! مجھے سوچنا ہوگا۔۔۔۔کہ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں، میری بھی اپنی زندگی کا مسئلہ ہے۔"

"میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ہم سب سے تعاون کرو۔"

"کمال ہے امی! مجھے آپ لوگوں کے اس ڈرامائی کھیل پر یقین نہیں آ رہا۔"

"آ جائے گا یقین، سب کچھ ہو جاتا ہے۔" نادر کی آواز دروازے سے باہر سنائی دی تھی اور رومانہ ایک دم ساکت ہو گئی تھی، لیکن نادر دروازے سے اندر نہیں آیا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں اس کے اندر آنے کا انتظار کرتی رہیں لیکن پھر کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ رومانہ پر یہ وقت بہت بھاری گزر رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے، کیا ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ پورا گھرانہ ہی مجرم بن جائے۔ امی ابو، نادر چچا تو خیر تھے ہی غلط آدمی، بہت سے واقعات ان کے بارے میں رومانہ کے کانوں تک پہنچے تھے، لیکن گھر میں سب نادر چچا سے محبت کرتے تھے ان کی برائیوں کے باوجود انہیں گھر میں ایک لاڈلے بیٹے جیسا مقام دیا جاتا تھا اور اب نادر چچا نے یہ جو سب کچھ کیا تھا وہ بڑا ہی سنسنی خیز تھا، پھر اسے سرمد کا خیال آیا اور پھر وہ ان تحریروں پر غور کرنے لگی۔ کیا وہ تحریریں پیشگوئی تھیں ان کے تاریک مستقبل کی۔ وہ تحریریں تو اس کے ذہن سے چپک گئی تھیں اور وہ رات کو اپنے بستر پر لیٹ کر انہی کے بارے میں غور کرنے لگی۔ فال کھلوائے تھے انہوں نے اپنے لئے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا، وہ بڑی عجیب و غریب چیز تھی۔ ایثار یہ نہیں کہ موٹا جھوٹا پہن لیا جائے، روکھی سوکھی کھالی جائے۔ ایثار یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کی اور مسرتوں اور چاہتوں کی قربانی دی

جائے، کیا یہی وہ قربانی ہے جو مجھے دینی ہے، کیا بوڑھا بابا واقعی کوئی درویش تھا جس نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا اور اس کے سامنے رکھی تحریروں میں رومانہ کی کہانی درج تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک دردناک چیخ فضا میں ابھری اور رومانہ کی آنکھ کھل گئی۔ مدھم مدھم روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نگاہیں ایک اجنبی چیز پر جاٹکیں، ایک بار پھر وہی چیخ کانوں میں ابھری، لگ رہا تھا کہ کسی کی گردن پر چھری پھیری جارہی ہو، وہ دہشت سے کانپ اٹھی، جس چیز پر نگاہیں جاکر جمی تھیں وہ مٹی کے تیل کی لالٹین تھی۔ یہ لالٹین ان کے اپنے گھر میں تو نہیں تھی۔ اس نے دہشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس بھیانک چیخ نے ہی اعصاب کشیدہ کردیئے تھے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ بان کی ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، جس کمرے میں وہ لیٹی تھی اس میں بان کی چارپائی تو نہیں ہوتی تھی، اب اتنے خراب حالات بھی نہیں تھے ان کے، سید علی نے سب کو جمع کرلیا تھا گھر میں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اس چارپائی اور سرہانے رکھے ہوئے تکیے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا پھر یہ لالٹین جو کارنس پر رکھی ہوئی تھی۔ بھیانک چیخ تیسری بار سنائی دی تو وہ بستر سے نیچے اتر آئی۔ دروازہ دیکھا اور اس کے قریب پہنچ گئی، اسے کھولنے کی کوشش کی تو دروازہ باہر سے بند تھا، اس کے حلق سے ایک کرب زدہ چیخ نکلی۔

"دروازہ کھولو، کون ہے باہر، دروازہ کھولو۔"

کوئی دو منٹ تک دروازہ پیٹنے کے بعد باہر سے ایک آواز سنائی دی۔

"دم لو بی بی، دم لو، مروت۔"

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک کرخت آواز تھی۔ پھر دروازہ کھلا اور رومانہ بمشکل اپنی چیخ روک سکی۔ بڑی بھیانک شکل تھی، لمبا تڑنگا ایک آدمی جس کے چہرے پر نوکیلی مونچھیں تھیں، آنکھیں چمکدار اور سرخی مائل۔

"کیا بات ہے؟"

"یہ۔۔۔مم۔۔میں۔۔۔میں۔۔۔مم۔۔۔میں میں کہاں ہوں؟"

صبح ہوجانے دو، سب پتہ چل جائے گا اور سنو اب اس کے بعد شور مت مچانا دروازہ بند کرو۔" اس نے کہا اور پھر رومانہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈی لگادی۔ رومانہ کا بدن پسینے میں تربتر ہورہا تھا، یہ کیا ہوا، کیا یہ کوئی خواب ہے دہشت سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ نجانے کس طرح وہ قدم اٹھا کر چارپائی تک آئی اور پھر اس پر لیٹ گئی۔ گزرے ہوئے واقعات ذہن میں چکرانے لگے اور صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے جو ایسے لمحات میں سہارا دیتی ہے، آنسو۔۔۔۔اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ رات موم کی طرح پگھل رہی تھی اور جب رات کا آخری پہر ختم ہوا تو رخنوں سے روشنی کی کرنیں اندر آنے لگیں، وقت کا تو صحیح اندازہ نہیں ہوا تھا، لیکن ساڑھے سات بجے کا وقت تھا جب دروازے پر آہٹیں ہوئیں اور پھر دروازہ کھل گیا۔ رومانہ نے سہمی ہوئی نگاہوں سے باہر دیکھا، وہ بھیانک شکل دن میں کیسی لگتی ہوگی، لیکن سامنے نادر علی کھڑا ہوا تھا۔

"چچا۔۔۔!" وہ چیخ کر باہر کی سمت بھاگی نادر علی نے اسے سہارا دیا، وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"ارے! رونے کی کیا بات ہے، یہ میری مملکت ہے، میرا گھر ہے رومانہ ہوش میں آؤ، چلو منہ ہاتھ دھولو، ناشتہ تیار ہے، مجھے پتہ ہے کہ تم صبح کو صرف چائے پیتی ہو، بڑی اچھی چائے بنوائی ہے تمہاری پسند کی، کڑک۔۔۔" نادر نے کہا اور اسے باہر نکال لایا۔ چھوٹا سا گھر تھا، تین چار کمرے تھے ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ سامنے باورچی خانہ تھا، گھر کا صحن کچا تھا، دالان میں دو تخت پڑے ہوئے تھے، نادر اسے ساتھ لے گیا، اس نے اس کا منہ ہاتھ دھلوایا، ایک گندا سا تولیہ اسے دیا تو اس نے تولیہ قبول نہیں کیا اور اپنے دوپٹے سے منہ پونچھ لیا۔ ایک موٹی سی بوڑھی عورت چائے لے آئی اور نادر نے اسے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ بوا رشیدہ ہے اسے دیکھ لو پہچان لو، بہت عرصے تک اس کا اور تمہارا ساتھ رہے گا۔"

رومانہ نے سہمی ہوئی نگاہوں سے بوڑھی کو دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ ''بالکل فکر مت کرو۔ کلیجے سے لگا کر رکھوں گی میں تمہیں۔''

''نادر چچا! یہ۔۔۔ یہ کونسی جگہ ہے؟''

''بتایا نا۔۔۔ کہ میرا ڈیرہ ہے ابھی تھوڑی دیر بعد بھائی جان بھی یہاں آئیں گے تم سے ملیں گے۔''

''نادر چچا! میں یہاں کیسے آ گئی؟'' وہ درد بھرے لہجے میں بولی۔

''میں لایا ہوں تمہیں لو چائے پیو، میں تم سے بہت سی باتیں کروں گا۔'' نادر نے نرمی سے کہا اور تخت کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔

''چائے اٹھالو بالکل مت ڈرو میں تمہیں ساری اونچ نیچ سمجھائے دیتا ہوں۔''

چائے رومانہ کی کمزوری تھی اور جو وحشت اس پر سوار تھی اس میں اسے صحیح فیصلہ کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس نے چائے اٹھائی اور اس کے بڑے بڑے گھونٹ لینے لگی، نادر نے آواز لگائی۔

''بوا رشیدہ چائے کی ایک پیالی اور یہ۔۔۔ دو تین پیالیاں پینے کے بعد ہوش میں آتی ہے۔''

''ابھی لائی نادر! پیالی خالی ہو گئی کیا؟'' رشیدہ کی آواز سنائی دی۔

''ہو جائے گی۔۔۔ ہو جائے گی۔''

''نادر چچا! میں یہاں کیسے آئی۔ کیا آپ مجھے بے ہوش کر کے یہاں تک لائے ہیں؟''

''ہاں مجبوری تھی، مگر میں تمہارا چچا ہوں، میں لایا ہوں تمہیں یہاں۔''

''میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو نادر چچا۔۔۔!''

''دیکھو تم تو پڑھی لکھی ہو، ہر اونچ نیچ سمجھتی ہو، میں تمہیں بتاؤں اس وقت نوے فیصد آبادی یہ سوچنا چھوڑ چکی ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ تم یہ بات بھی مان لو کہ دنیا کے بارے میں میرا تجربہ بھائی جان سے زیادہ ہے، بھائی جان محکمہ پولیس میں تھے، بڑے اچھے حالات پیدا کر سکتے تھے وہ، لیکن طریقہ کار نہیں آتا تھا انہیں۔ ان کی دوسری ملازمت

بھی خوش نصیبوں کو ہی ملتی ہے، مگر وہ اسے بھی نہ چلا سکے اور اب وہ بس سمجھو ملازمت کر رہے ہیں، کیا ملتا ہے انہیں تھوڑی سی تنخواہ، یہاں تو کوئی اور ذریعہ بھی نہیں ہے اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں یہ جو پروگرام بنایا گیا ہے، یہ بھائی جان نے ہی بنایا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جو کچھ وہ کر نہیں سکتے تھے انہوں نے اس کیلئے میرا سہارا لیا اور پھر اس سارے کیس کی کمانڈ مجھے دے دی اور اب میری تم سے درخواست ہے کہ میری محبت کو قائم رہنے دینا، تھوڑا سا دماغ ٹیڑھا ہو گیا ہے، جس دنیا میں زندگی گزار رہا ہوں وہاں ٹیڑھے دماغ کی بہت ضرورت ہوتی ہے، مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے تعاون کرو گی، اب تم میری بات سن لو، بھائی جان جو کچھ کرتے رہے وہ ایک الگ چیز تھی لیکن اندر سے وہ باپ رہے شوہر رہے اور سچی بات یہ ہے کہ بھائی رہے، ان کے دل میں یہ آرزو رہی کہ ہم لوگوں کو ایک اچھی زندگی دیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ تقدیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا، وہ کوشش کرتے رہے، کامیابی نہیں ہو سکی انہیں اور پھر انہیں یہ موقع ملا۔

''نادر چچا! مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''بیٹا تھوڑی سی تفصیل تمہیں بتائی جا چکی ہے، مزید میں اب تمہیں بتاؤں گا، میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں گھر سے ہٹا دوں گا، اب اس گھر سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے۔ جہاں تک رہا بھابی کا یا بھائی جان کا مسئلہ، تو سب اس منصوبے سے اتفاق کرتے ہیں، جب چاہو جس سے مل لو جسے چاہو بلا لو۔''

''مگر نادر چچا! مجھے گھر ہی میں کیوں نہیں رہنے دیا۔ یہ جگہ تو بہت خطرناک ہے۔''

''بہت مختصر وقت تمہیں یہاں گزارنا ہوگا۔''

''نادر چچا! یہاں رات کو کون چیخ رہا تھا؟''

''اوہو۔۔۔ ہاں مجھے اندازہ تھا کہ وہ چیخیں تمہاری نیندیں خراب کر دیں گی، بیٹا! یہاں مختلف قسم کے لوگ لائے جاتے ہیں جن کے دماغ درست نہیں ہوتے اور وہ ہمارے مقصد کی تکمیل نہیں کر پاتے، ان کی گردن پر چھری پھیر دینا ہماری مجبوری ہوتی ہے۔''

"قتل۔۔۔قتل۔۔۔"

"تم اس بارے میں نہ سوچو بیٹا! چلو ٹھیک ہے آئندہ یہاں ایسے کسی آدمی کو نہیں لایا جائے گا جسے ہم سزا دینا چاہتے ہوں، چائے پی لی تم نے، جاؤ اندر اپنے کمرے میں جاؤ مجبوری ہے جب تک تم ہماری بات سے متفق نہیں ہو جاؤ گی ذرا سختی ہی رکھنا پڑے گی تم پر، محسوس مت کرنا، سوری۔۔۔ کھانا وغیرہ بوا رشیدہ دیں گی تمہیں۔"

"آپ نے کہا تھا ابو یہاں آئیں گے۔"

"ہاں ہاں ہوسکتا ہے تمہاری امی بھی آجائیں، میرا مطلب ہے بھابھی۔"

"نادر چچا! میرا دل یہاں بہت گھبرا رہا ہے۔"

"اپنے دل کو سنبھال لو بیٹا! مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"مگر نادر چچا! آخر ان باتوں سے آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"جلد بازی مت کرو، سب پتہ چل جائے گا۔ چلو اٹھو۔"

نادر کا لہجہ کسی قدر کرخت ہو گیا اور رومانہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ وہ کمرے میں آ گئی اس نے باہر سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ وہ اندر آ کر بیٹھ گئی۔ اس طرح کے واقعات کے بارے میں صرف سنا ہی تھا یا پھر فلموں میں ایسے عقوبت خانے دیکھے تھے۔ وہ صرف فلمی باتیں ہوتی تھیں۔ آج وہ خود ایسا ایک کردار بن گئی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ اس نے پہلی بار ان ساری باتوں پر پوری سنجیدگی سے غور کیا۔ نادر علی چاہتا ہے کہ میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ادا کروں جو ایک کروڑ پتی دادا کی پوتی ہے اور جس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔

"خدا نہ کرے۔" اس کے منہ سے نکلا۔ پھر کیا ہوگا۔ پھر میں اس کروڑ پتی شخص سے اس کی دولت حاصل کر کے نادر چچا اور۔۔۔ اور۔۔۔ ابو امی۔۔۔۔ یہ نادر چچا تو ہیں ہی برے آدمی، ابو امی کو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے نادر چچا کو یہ اجازت کیسے دی۔ دوسری بات یہ کہ ایسا کب تک کرنا پڑے گا۔ یہ بہروپ مجھے کب تک بھرنا ہوگا اور اس سرمد کا کیا ہوگا؟ کیا اس سے مجھے رابطہ کی اجازت ہوگی مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا کردار اور حلیہ تبدیل ہو چکا ہوگا۔ ہائے میں تو کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کہ میں سرمد سے محبت کرتی

ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں نہ جانے کتنا وقت ہوا تھا۔ دروازہ کھلا اور رشیدہ نے اسے باہر آنے کے لیے کہا اسے سید علی کے سامنے پہنچایا گیا تھا۔ سید علی سر جھکائے پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔

"جی ابو۔۔۔! مجھے آپ کے لیے کتنے نوٹ چھاپنے ہوں گے؟"

اس انوکھے سوال پر سید علی چونک پڑے۔ انہوں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا پھر بولے۔

"اچھا سوال کیا ہے تم نے۔۔۔ مجھے تو ایک روپے کی بھی ضرورت نہیں ہے تم یہ سب کچھ کرنے سے نادر سے انکار کر دو۔"

"مطلب۔۔۔؟" وہ بولی

"مطلب میں بتاتا ہوں رومانہ!" نادر علی کی آواز سنائی دی۔ اس کی انٹری اس طرح ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ وہ اور سید علی چونک کر نادر علی کو دیکھنے لگے۔ جس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بولا

"بھائی جان گواہی دیں گے کہ میں نے ہمیشہ ان کا بیٹے کی طرح احترام کیا ہے۔ ان کے سامنے گردن جھکائے رکھی۔ میرے راستے ہمیشہ دوسرے رہے اور میں بھی بھائی جان کی طرح مظلوم زندگی گزارنے کا قائل نہیں رہا۔ ہاں میری تقدیر ذرا کمزور ہے بہت کچھ کرنے کے باوجود میں اپنی خواہش پوری نہ کر سکا' جو آج میرے سینے میں مچلتی ہے۔

جانتی ہو رومانہ! وہ خواہش کیا ہے ایک گرین کارڈ۔۔۔۔ میں امریکہ جا کر آباد ہونا چاہتا ہوں۔ کیا بھائی جان کے پاس وسائل ہیں کہ میری آرزو پوری کر سکیں ایک باپ کی حیثیت سے ہی سہی جس نے میری پرورش کی ہے۔

"کیا تم اس کالج کے لڑکے کے ذریعہ میری یہ خواہش پوری کر سکتی ہو بولو۔۔۔"

رومانہ بدحواس ہو گئی۔ یہ اشارہ صاف سرمد کی طرف تھا۔ نادر علی سرمد کو جانتا ہے۔ نادر علی چیل جیسی آنکھیں رکھتا تھا۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر بولا۔

"پریشان نہ ہو' میں نے بھائی جان کو اس لڑکے کا بتا دیا ہے جو ٹیوشنز پڑھا کر

اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہے اور حد درجے قلاش ہے لیکن تمہاری دوستی سے مالا مال ہے اور تم دونوں روز شام کو کیفے چائے پی کر اپنے اپنے گھر کو جاتے ہو۔ اس کا دماغ میں بہت پہلے ٹھیک کر چکا ہوں۔ بس یہ جائزہ لے رہا تھا کہ بات اس سے کس طرح آگے بڑھتی ہے مگر اب معاملہ ایسا نکل آیا ہے کہ وہ خود بخود زندگی سے نکل جائے گا؟“

رومانہ نے سہمی ہوئی نظر سے سید علی کو دیکھا وہ بدستور سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”دیکھو بیٹا! ہمارا کام ایسا ہی ہے۔ جرم کی دنیا میں ہوشیاری اور ہر بات سے خبر گیری ہی زندہ رکھتی ہے۔ تمہارے بارے میں بھی خبر گیری تھی، سو مجھے اس لڑکے بارے میں بھی معلوم ہو گیا۔ اب تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ میری تقدیر کے ستارے کچھ بدلے ہیں ایک روشنی نظر آئی ہے میری آرزو میرے خواب پورے ہوں گے اور وہ چراغ تمہارے ہاتھوں جلے گا۔ تمہارے ابو کو پیسے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے ہمیشہ معمولی زندگی گزاری ہے لیکن انہیں تمہاری، میری اور پیاری بھابی کی فکر ہے جن کی میں ماں جیسی عزت کرتا ہوں، لیکن میری آرزو میری دیوانگی ہے، اس کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میں نے اس کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔“

نادر علی جس طرح آیا تھا اس طرح واپس چلا گیا سید علی نے گہری سانس لی اور گردن اٹھا کر بولے۔

” وہ میرا بھائی ہے میں نے اسے اپنا بیٹا سمجھا ہے لیکن اب وہ بھائی ہے نہ بیٹا۔ کچھ نہیں ملتا بیٹے انسان کو، مجھے دیکھو، کس دل میں اچھی زندگی کی آرزو نہیں ہوتی۔ محکمہ پولیس میں لوگوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں، میں نے وہاں بھی کسی کے ساتھ سختی نہیں کی، لوگ ہزاروں مانگتے تھے میں نے سب کچھ دوسروں کی خوشی پر چھوڑ دیا۔ سب نے کمایا اور مجھے رشوت ستانی کے الزام میں نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہی سب کچھ پیشکار کی نوکری کے دوران ہوا۔ نادر علی امریکہ جانا چاہتا ہے، اسے لاکھوں درکار ہیں۔ میرے سامنے صرف تمہارا مستقبل تھا وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس میں ابتدا تو تمہارے شاندار مستقبل سے ہی ہوتی ہے۔“

”بیٹی کے سامنے ماضی کو قتل کر دیں گے آپ۔۔۔ ماں باپ کے رشتے کو ختم کر

دیں گے ابو۔۔۔ اپنی بیٹی کو بیٹی رہنے کا حق بیچ دیں گے آپ۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ ایسا کرنا پڑے گا۔ طریقہ کار وہ نہیں ہے جو میں چاہتا تھا لیکن ہو وہی رہا ہے۔ تم نے نادر کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تم نے اس کی بات نہ مانی تو وہ تمہاری امی کو قتل کر دے گا۔ وہ جنونی ہو چکا ہے رومانہ اور میں اب اسے نہیں روک سکتا۔ حالات بھی اسی طرح کے ہیں۔“

”میں اسے بھی قتل کر دوں گا جس سے یہ محبت کرتی ہے۔“ اچانک نادر کی آواز سنائی دی، نادر اندر داخل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی نظر آ رہی تھی۔ درحقیقت وہ ایک عجیب سی وحشت کا شکار تھا، رومانہ نے اسے دیکھا اور اس کے بدن میں لرزشیں دوڑ گئیں، نادر کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”ہاں رومانہ، میں بہت کام کر رہا ہوں اور ان دنوں زندگی نے ایک سنہری موقع دیا ہے تو میں نے اس سنہری موقع کو ہی اپنی زندگی بنا لیا ہے۔ اس کے علاوہ اب میں نے اپنی زندگی کیلئے کچھ باقی نہیں چھوڑا، معاف کرنا وہ کچھ کہنا پڑ رہا ہے جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ اس لڑکے کا نام سرمد ہے۔ معمولی سی حیثیت کا مالک ہے، ٹیوشنیں کر کے زندگی گزارنے والا۔ رومانہ! نوجوانی میں انسان اسی طرح بھٹک جاتا ہے۔ بے شک محبت کرنا، اپنے لئے زندگی کا ساتھ منتخب کرنا تمہارا حق ہے لیکن رومانہ! کبھی کبھی قربانی دینی پڑتی ہے اور یہ فضیلت بھی کسی کسی کو ہی ملتی ہے۔ تم ایک گھر کیلئے قربانی دے رہی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گی تو ساری آسائشیں تمہارے قدموں میں ہوں گی تب تم سوچو گی کہ بزرگوں نے وہی کیا جو بزرگوں کو کرنا چاہئے تھا، بے شک ہم تم سے تمہارے جذباتی تعلق کو چھین رہے ہیں لیکن رومانہ بے حد ضروری ہے۔ بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں، ہم وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ناکام رہے اور اگر تقدیر کے دیئے ہوئے اس موقع سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا تو اس کے بعد تقدیر ہمیں دوسرا چانس نہیں دے گی اور اب رومانہ! تم نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ میں کیا کروں گا۔ رومانہ! ہم تقدیر کے اس کھیل میں بھی ناکام رہے تو ہمیں اجتماعی خودکشی کرنا ہو گی۔ اس کے بعد ہمارا جینا بالکل بیکار ہو گا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے رومانہ! کتنا کچلا ہوا دل ہے میرا۔ بھائی جان کی میں نے ہمیشہ عزت کی

ہے۔میں سوچتا رہا ہوں کہ کاش بھائی جان اس قدر ذہین اور چالاک ہوتے کہ ہم لوگ اپنا ایک اچھا مستقبل بنا سکتے، میں نے تو ان کی اولاد ہی بن کر سوچا ہے ہمیشہ اور اب بھی یہی سوچ رہا ہوں، اتفاق ہے کہ ذریعہ تم بن گئی ہو، اب ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔اگر اس وقت میری مرضی کے مطابق سب کچھ نہ ہوا تو میں اخبارات کیلئے ایک نئی کہانی بن جاؤں گا۔میں آپ تینوں کو قتل کر کے خودکشی کرلوں گا۔یہ میرا فیصلہ ہے، آخری فیصلہ، رومانہ مجھے جواب چاہیئے۔"

رومانہ سب کچھ سن رہی تھی، اس کے کانوں میں جیسے تیزاب کی بوندیں ٹپکائی جارہی تھیں۔دماغ شدید جلن اور دکھن کا شکار تھا، دیر تک وہ سنسنی میں ڈوبی رہی اور پھر اس نے کہا۔

"مجھے کچھ وقت چاہیئے۔"

"وقت نہیں رومانہ! وقت اس لیے لیا جاتا ہے کہ سوچنے کا موقع ملے۔سنو اس وقت تم اپنی ساری سوچیں ہمیں دے دو فیصلہ ابھی ہونا چاہیئے مجھے معاف کیجیے گا بھائی جان! میں نے بھابی کو اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے میری مجبوری ہے اتنا ہی دیوانہ ہو چکا ہوں میں۔۔۔"

رومانہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چچا نادر کو دیکھنے لگی۔میں تمہیں بیٹی کہتا تھا بڑے پیار سے بیٹی کہتا تھا لیکن رومانہ اس وقت کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ تم صرف ایک مقصد ہو، صرف ایک مقصد۔۔۔" وہ جنونی لہجے میں بول رہا تھا۔

"اور میرے خواب۔۔۔" رومانہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"سوچ لو، سمجھ لو، جو خواب بند آنکھوں میں نظر آتے ہیں وہ فتور ہوتے ہیں دماغ کا، اب تم ہوش میں آگئی ہو اب خواب مت دیکھو، اپنے کل کے بارے میں سوچو جو روشنی سے بھرپور ہوگا۔تمھارے لئے نہیں ہم سب کیلئے۔سمجھی رومانہ! ہم سب کیلئے، جواب دو صرف ہاں یا نہیں میں جواب چاہیئے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں رومانہ! پلیز فیصلہ کرو میں اس زندگی سے اکتا گیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ میری گردن پر چھری پھیرنا چاہتے ہیں تو میں حاضر

ہوں۔"

نادر نے کہا۔"حالات کو آنے والے وقت پر چھوڑ دو۔جب ہمارا کام جائے گا تو میں تم سے ایک سوال کروں گا رومانہ! کہ بتاؤں وہ جذباتی کیفیتیں بہتر تھیں یا موجودہ وقت، میں ابھی تم سے اور کوئی بات نہیں کہوں گا، لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم نے ہمارے منصوبوں پر اسی طرح عمل کیا، اپنی تمام تر صلاحیت اس کام پر صرف کی جس طرح ہم چاہتے ہیں تو مستقبل تمہارا ابھی برا نہیں رہے گا، ہوسکتا ہے کہ ہم تمھارے خوابوں کو محفوظ کر دیں، آیئے بھائی جان۔۔۔!" نادر نے کہا اور سید علی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔وہ خطرناک شخص بنا ہوا تھا اب باہر آکر اس نے دروازہ بند کیا اور گھر سے ہی باہر نکل آیا۔

"معافی چاہتا ہوں بھائی جان! جانتا ہوں رومانہ کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے آپ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔مگر بھائی جان! کام ہو جائے تو وارے نیارے ہو جائیں گے ہم بعد میں اس شخص کے بارے میں بھی سوچیں گے جس کا نام سرمد ہے۔"

سید علی عجیب انداز میں گردن ہلانے لگے، جو کچھ کر رہے تھے اس پر دل بھی لرز رہا تھا چھوٹی موٹی رشوتیں لے لینا دوسری بات تھی لیکن اب جو خطرناک قدم اٹھا رہے تھے دیکھیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

☆ ☆ ☆

مرزا عرفان احمد تقریباً پانچ اشتہارات دے چکے تھے۔لیکن ابھی تک ہاشا نامی کسی شخص نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا عرفان احمد نے ہر قسم کی چالاکی سے کام لیا تھا انہوں نے اشتہارات میں لکھا تھا کہ ہاشا نامی شخص کے کچھ عزیز دوبئی سے آئے ہیں اور اس کے لیے کچھ تحائف لائے ہیں یہ تحائف ان کے پاس محفوظ ہیں ہاشا ان کے دفتر آکر یہ تحائف وصول کرلے لیکن اشتہارات دینے کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔چنانچہ نئی کوشش کے طور پر انہوں نے اپنے دو آدمیوں کو جو بہت ہی ذہین اور کھوجی قسم کے تھے، نور پور بھیجا کہ وہاں سے مزید معلومات حاصل کریں ان میں ایک کا نام ریاض اور دوسرے کا نام اطہر تھا۔ دونوں پڑھے لکھے تھے۔مرزا عرفان کو پورا یقین دلایا تھا وہ آخری حد تک کوشش کریں گے' یہ کام بیشک اپنی فیلڈ کا نہیں ہے لیکن آذر غیاث کے لیے وہ ہر طرح کے کام کریں گے'

انہوں نے بتایا تھا کہ ان کے آدمی نور پور معلومات حاصل کرنے گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ریاض اور اطہر بڑی ذہانت سے کام سرانجام دے رہے ہیں۔ نور پور کے نواحات کا انہوں ہر طرح سے جائزہ لے لیا تھا' ان کی جیپ دور دور تک بھٹکتی رہی تھی' پھر وہ اپنی تلاش سے مایوس ہو رہے تھے کہ ایک نواحی بستی میں انہیں ایک بوڑھا شخص نظر آیا جو راستہ کاٹ کر ان کے سامنے آ گیا تھا۔

''باباجی کیا خیال ہے یہیں مرنے کا ارادہ ہے یا اپنے گھر جا کر مرو گے؟''

''موت خود جانتی ہے کہ کسے کہاں مرنا ہے' تم مجھے مارنے کا دعویٰ کیوں کر رہے ہو۔'' بوڑھے کے الفاظ پر دونوں چونک پڑے تھے۔

''ارے نہیں نہیں باباجی! آپ اس طرح گاڑی کے سامنے آ گئے تھے' کہاں کے رہنے والے ہیں؟''

وہ سامنے بستی نظر آ رہی ہے نا تمہیں وہیں پیدا ہوا اور وہیں عمر گزر گئی ہے بس زندگی میں ایک بار شہر گیا تھا وہ اپنے جگری یار کے لیے۔ بڑی آرزو تھی اس کی ایک بار شہر آؤں' شہر اچھی طرح دیکھا بہت خوبصورت ہوتا ہے' مگر ہم دیہاتی لوگوں کی زندگی شہروں میں کہاں گزرے گی ایک بار بس ہاشا کی خوشی پوری کرنے کے لیے شہر چلا گیا۔ اس کے بعد سے یہیں رہتا ہوں اور اب موت کا انتظار کر رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ مجھ مار دو گے کمال ہے بھائی مار دو۔۔۔ ضرور مار دو۔''

ریاض اور اطہر باقی سب کچھ بھول گیے تھے' ان کے ذہنوں پر ہتھوڑوں جیسی ضربیں پڑ رہیں تھی۔۔۔۔ ہاشا ہاشا ہاشا۔۔۔

''کیا نام لیا باباجی!''

''ہاں بولو باباجی! شہر میں رہنے والے دوست کا کیا نام تھا؟''

''ارے بس سمجھ لو بڑا لمبا ساتھ رہا جوانی کا' کبھی نہیں بھول سکتا بڑا اچھا آدمی تھا حالانکہ خانہ بدوشوں کے قبیلے کا ایک بندہ ہے خانہ بدشوں کے ساتھ زندگی گزاری تھی' پر سب مر گئے تھے اس کے کوئی باقی نہ تھا' مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا جب خانہ بدشوں کا قبیلہ یہاں سے اٹھا تو وہیں رہ گیا۔ میں نے لاکھ کہا ہاشا میرے پاس تیرے لیے سب کچھ ہے'

دو روٹی اور دو کپڑوں کی بات ہے تو فکر مت کر میں تیرا خرچ اٹھاؤں گا' سب کچھ کروں گا تیرے لیے۔ لیکن وہ شہر چلا گیا اب تو بہت دن سے ادھر آیا بھی نہیں ورنہ وہی آتا ہے میرے پاس ہر بار کہتا ہے میرے ساتھ شہر چلو دونوں ساتھ رہیں گے۔''

''بڑی بات ہے ایسی دوستیاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔'' اطہر نے ریاض کو آنکھ مارتے ہو کہا۔

''باباجی! ویسے آپ نے زیادتی کی ہے۔ بڑی زیادتی کی ہے اپنے دوست کے ساتھ۔ آپ کو جانا چاہیے تھا دوست کے پاس جب ایک شخص اتنی محبت سے ملتا ہے آپ کو اس کا پتا تو معلوم ہو گا ہی؟''

''وہ آتا رہتا ہے یہاں۔۔۔''

''ہم لوگ شہر واپس جا رہے ہیں ۔یہ گاڑی ہمارے پاس ہے۔ آپ چلنا چاہو تو ہم آپ کے دوست کے پاس لے چلیں گے۔''

''ایں۔۔۔ اغوا کر رہے ہو مجھے؟'' بوڑھا چونک کر بولا۔

''آپ کا اچار ڈالنا ہے ہم نے باباجی! ہم آپکو اغوا کیوں کریں گے۔ لیجیے ایک تو محبت میں پیشکش کر دی اوپر سے آپ شک کر رہے ہیں۔''

''سوچ تو ڈال دی تم نے ہمارے دل میں ہم تمہیں سچ سچ بتا دیں ہمارے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ کوئی کام دھندہ کر نہیں سکتے اس عمر میں، یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس نہیں جاتا۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں آئیں چلیے' ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔''

بوڑھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ ادھر اطہر اور ریاض کا بس نہیں چل رہا تھا' کہ بوڑھے کو بازوؤں میں اٹھا کر دوڑ پڑیں اتنا بڑا کام ہو جائے گا۔ ان کے خواب خیال میں نہیں تھا بہت اہم ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اور اب کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

انہوں کہا۔ ''باباجی نام کیا ہے آپ کا؟''

''پتا نہیں بھائی! کیا نام ہے ہمارا مگر ساری بستی جموں چچا کہتی ہے اب پتہ نہیں

کیوں کہتی ہے،ہم نے تو کبھی سوچا نہیں۔"

"اچھا تو پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے۔۔۔"

"بھیا! دال میں کچھ کالا لگے ہے۔بات کچھ سمجھ میں نہ آوے ہے' کون اب اس دنیا میں اتنا اچھا رہا ہے کہ کسی کے کام آ جائے کہیں لے جا کر چھری وری تو نہیں پھیر دو گے ہماری گردن پر، تلاشی لے لو کوڑی نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جموں بابا! زمانہ اتنا برا ہو چکا ہے' اگر کسی کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے تو خود شرمندہ ہو جاتا کیونکہ دوسرا اس پر یقین نہیں کرتا۔"

"بندے تو بھلے لگتے ہو چلو ٹھیک ہے اب کونسا جینے کا شوق تمہاری مرضی ہے تو ٹھیک، چلتے ہیں تمہارے ساتھ۔ارے! ہم نے کونسے کپڑے بدلنے ہیں۔چلو کیا یاد کرے گا اپنا ہاشا بھی کہ ہم آئے تھے اس کے پاس۔اگر سچ مچ اس کے پاس پہنچ گئے تو بڑا خوش ہوگا بھیا دیکھ لینا۔"

"کسی کے دل کو ایک لمحہ کی خوشی دینا بڑی نیکی کا کام ہے بابا! آیئے بیٹھے۔" اور پھر انہوں نے سہارا دے کر بوڑھے کو جیپ میں بٹھایا تھا۔ادھر اطہر نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔شہر میں داخل ہونے کے بعد بوڑھا راستہ بتاتا رہا اور انہیں ایک کچی آبادی میں لے گیا پھر دور کے ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے بولا" وہ ہے ہمارے یار کا گھر گاڑی تو نہیں جا سکے گی تمہاری وہاں تک، پر ہمیں پہنچا دو ادھر بھائی۔۔۔!"

"ہاں ہاں ہم بھی تو ملیں آپ کے دوست سے، دیکھیں تو سہی کیسا آدمی ہے وہ۔اتنی اچھی دوستیاں کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں؟"

"چلو، مگر تم لوگ بھی سمجھ میں نہیں آئے، ہماری بستی میں گھوم رہے تھے پتہ نہیں کس کام سے وہاں آئے تھے، ہمارے پھیر میں پڑ گئے۔یہ بتا دو کہ مجھے یہاں لا کر تمہیں کیا فائدہ ہوا؟"

"کوئی نقصان بھی تو نہیں ہوا جموں بابا! ہمیں واپس بھی تو یہیں آنا تھا۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ ایک گھر کے دروازے پر پہنچ گئے جو ایک بوسیدہ سا بت کدہ تھا۔بوڑھے جموں بابا نے دروازے کی زنجیر بجائی تو کچھ ہی دیر بعد ایک اور مجہول

سے بوڑھے نے دروازہ کھول دیا، قد و قامت کا اچھا تھا لیکن عمر کا شکار ہو چکا تھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جموں کو دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اس سے لپٹ گیا۔

"ارے میرے یار۔۔۔۔!ارے میرے بھائی! ارے تو کیسے آ گیا خبر بھی نہ کی مجھے۔۔۔اندر آ جا۔۔۔آ جا۔"

اس نے اطہر اور ریاض کو نظر انداز کر دیا تھا جموں بابا بھی بھول گیا کہ کس کے ساتھ یہاں آیا ہے دونوں اندر گھس گئے اور اطہر اور ریاض دونوں احمقوں کی طرح ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔پھر اطہر نے آنکھ ماری اور دونوں کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔

کچے صحن میں ایک چارپائی پڑی تھی ہاشا اپنے دوست کی بڑی پذیرائی کر رہا تھا اس نے اپنے کندھوں سے کپڑا اتار کر چارپائی پر بچھا دیا اور بڑے پیار سے جموں بابا کو چارپائی پر بٹھایا۔

"افسوس ہے ہاشا بھائی! خالی ہی تیرے پاس چلا آیا ہوں بستی سے آتے ہوئے دکانیں تو کئی ہیں راستے میں مگر پاس کچھ نہیں تھا۔"

"ارے تو کیسی باتیں کرتا ہے، تیرا آنا میرے لئے اتنی خوشی بن گیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا ارے یہ دونوں کون ہیں؟"

ہاشا نے پہلی بار ریاض اور اطہر کی طرف رخ کر کے دیکھا اور جموں بابا چونک گیا۔

"ارے بھیا! بڑی خود غرضی ہے ہماری، ان دونوں کو تو بھول ہی گئے اے انہیں بٹھاؤ ہم اٹھ جاتے ہیں۔" جموں نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا جی! آپ بیٹھیے ہم چلتے ہیں بس، ہم تو یہ دیکھ رہے تھے کہ پرانی دوستی کیسی ہوتی ہے، واقعی آپ دونوں بہت اچھے دوست ہیں۔"

"پر یہ ہیں کون؟" ہاشا نے سوال کیا۔

"ہماری بستی میں گئے تھے کسی کام سے، مل گیا انہیں، شہر آ رہے تھے، کہنے لگے کہ آؤ تمہیں تمہارے دوست سے ملا دیں۔"

"بڑی مہربانی بھائی جی! بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو غریبوں کو اتنی عزت دیتے ہیں، اللہ تمہیں عزت دے۔"

"کوئی بات نہیں ہاشا بابا جی، ویسے آپ کرتے کیا ہیں؟"

"بس بھیا تھوڑی بہت محنت مزدوری کر لیتے ہیں، کبھی کچھ بیچ لیا۔ چار پیسے ضرورت پوری کر دیتے ہیں، اب ہمارا یار آیا ہے، شکر ہے کہ ہمارے پاس بیس روپے موجود ہیں۔"

"نہیں بابا جی آپ کا دوست آیا ہے، آپ خوب دوستی نبھائیں، یہ سو روپے ہماری طرف سے رکھ لیں۔"

"ارے نا بھیا نا۔۔۔۔کتنے احسان کرو گے ہمارے اوپر۔"

کوئی بات نہیں ہے۔" اطہر نے کہا اور جیب سے سو کا نوٹ نکال کر ہاشا کو دے دیا، پھر بولا۔

"ہم آتے رہیں گے، آپ کی جو بھی خدمت ہوگی، ہم کرتے رہیں گے ہاشا بابا۔۔۔!"

"ارے بھیا! فرشتے ہو کیا؟ کب اترے آسمان سے؟"

"چلتے ہیں، خدا حافظ۔" ریاض احمد نے ہنستے ہوئے کہا اور دونوں دروازے سے باہر نکل آئے۔

باہر آ کر ریاض بولا۔ "یار اطہر! کیا عجیب بات ہے، ویسے تو ہم نے اور بھی اس طرح کے بہت کام کیئے ہیں، لیکن ایسی انوکھی دوستی پہلے کبھی دیکھنے اور سننے کو نہیں ملی، بہرحال دونوں بڑے اچھے دوست ہیں، چلو عرفان صاحب کو اطلاع دیں۔"

"ایک منٹ، بہت جذباتی ہونا اچھی بات نہیں ہے ریاض! عرفان صاحب کو اطلاع دینے کیلئے ہم دونوں کو نہیں جانا چاہئے؟"

"مم۔۔۔میں، میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھا کرو، جلد بازی میں ہر کام خراب ہو جاتا ہے۔ اب یوں کرو کہ تم یہاں رک جاؤ، وہاں سامنے پیڑ کے نیچے، ہمارا موبائل فون پر رابطہ رہے گا۔ گاڑی میں تمہارے

پاس ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ نظر رکھو ان دونوں پر۔ کہیں نکل گئے تو سارا کیا دھرا چوپٹ ہو جائے گا، ایک آدمی کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔"

"ہاں واقعی اس بات کے امکانات ہیں کہ دونوں کہیں گھومنے نکل جائیں تو ہماری ساری محنت اکارت ہو جائے گی، کیسے جاؤ گے تم؟"

"یہاں آتے ہوئے میں نے سامنے سڑک دیکھی تھی، اس پر مجھے کوئی ٹیکسی یا رکشہ مل جائے گا، میرا خیال ہے اس وقت عرفان صاحب آفس میں ہی ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جیپ تک پہنچ گئے اور اس کے بعد ریاض وہیں جیپ میں بیٹھا رہا اور اطہر پیدل چل پڑا، دونوں خاصے محتاط معلوم ہوتے تھے۔ سڑک اب اتنی قریب بھی نہیں تھی۔ اطہر اگر چاہتا تو ریاض سے کہہ سکتا تھا کہ اسے سڑک تک چھوڑ دے لیکن جاتے ہوئے بھی اس نے ہدایت کی تھی کہ ایک لمحے کیلئے بھی اس دروازے کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے اور ریاض پوری مستعدی سے دروازے پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ ابھی تک کوئی اس کی جانب متوجہ نہیں ہوا تھا، لیکن ہاشا کو باہر نکلتے دیکھ کر اس کے بدن میں ایک دم سنسنی دوڑ گئی تھی، ہاشا کسی قدر لنگڑا کر چلتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھ رہا تھا، پھر کچی آبادی کی چھوٹی سی دکان پر جا کر وہ رک گیا۔ ریاض نے فوراً اپنی جگہ تبدیل کر دی اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جہاں ہاشا پہنچا تھا۔ بالکل قریب تو وہ نہیں جا سکا تھا لیکن اب ایک ایسی جگہ اسے مل گئی تھی جہاں سے وہ ہاشا کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ ہاشا نے دکان سے تھوڑے سے چاول خریدے اور کپڑے میں اس کی پوٹلی بنالی۔ پھر دال اور نمک وغیرہ خریدا، دکاندار کو پیسے دیئے اور اس کے بعد واپس چل پڑا۔ ریاض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ غریب دوست، دوسرے دوست کی خاطر مدارت کیلئے "شاپنگ" کرنے نکلا تھا۔ بہرحال ان دونوں کی دوستی نے ریاض کو خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ واپس اپنی جگہ پہنچ گیا جبکہ ہاشا اپنے گھر کے دروازے کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

ہاشا اندر داخل ہوا تو جموں بابا نے اسے چونک کر دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"ہاں کیا پوزیشن ہے؟"

"جیپ تھوڑی سی الگ ہٹ کر کھڑی ہوئی ہے، ایک آدمی نظر آیا جو ہم پر نگاہ رکھ رہا ہے۔ وہ اتنا تیز ہے کہ جب میں دکان پر پہنچا تو وہ اپنی جگہ سے دوڑتا ہوا ایسی جگہ آ گیا جہاں سے وہ مجھے دکان پر دیکھ سکے۔ بہرحال اب یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ لوگ ہماری سخت نگرانی کر رہے ہیں، دوسرا لگتا ہے چلا گیا، نظر نہیں آیا، آس پاس بھی کہیں موجود نہیں ہے۔"

"گڈ۔۔" جموں بابا نے کہا اور پھر لباس کے اندر سے موبائل فون نکال لیا۔ موبائل فون پر اس نے کوئی نمبر ڈال کیا اور فون کان سے لگا لیا، دوسری طرف سے آواز آئی تھی۔

"ہاں بولو۔"

"نادر علی کا کام ہو گیا ہے۔"

"ڈائیلاگ مت بول، اس وقت تم اسٹیج پر نہیں ہو۔"

"یار اتنا بڑا کام ہوا ہے اور تمہارا لہجہ ویسے کا ویسا ہی خشک ہے۔"

"بس مجھے تفصیل بتاؤ۔"

"بستی میں بھٹک رہا تھا میں، دونوں مجھے جیپ میں مل گئے۔ وہی جن کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا، بہرحال ان لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ انہوں نے خود ہی مجھے بستی سے شہر تک آنے کی پیشکش کی اور اب میں یہاں موجود ہوں اور میرا دوست ہاشا مجھے مل چکا ہے۔"

محتاط رہو، کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

"بالکل نہیں نادر علی! اتنے سے کام میں بھلا کیا گڑبڑ ہوتی، وہ بس ہمارے پیسے ہم تک نہیں پہنچے۔"

"مروت پیسے تمہارے گھر پہنچ جائیں گے، اپنے کام کو خوش اسلوبی سے انجام دو، ابھی سجاد کو زیادہ کام کرنا ہے، تمہاری تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"اے بھائی نادر! کردار میرا بھی پکا والا ہے، بعد میں پیسے کے لین دین میں گڑ

بڑ مت کرنا۔"

"فضول باتوں سے گریز نہیں کرو گے۔"

"کر لیا۔ پیسے گھر پہنچا دینا یار! بڑی تنگی ہے آج کل۔"

"ہو جائے گا، بالکل بے فکر رہو، باقی کا کام بھی سر انجام دے دو۔"

"پیسے اس کے بعد ملیں گے۔"

"پیسے آج ہی ملنے چاہئیں۔"

"یار! تو بڑا بے صبرا آدمی ہے، پیسے دو گھنٹے کے بعد پہنچ جائیں گے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"سجاد سے بھی کہہ دوں؟"

"کہہ دیا بابا! کہہ دیا، مجھے یہ احساس مت دلانا کہ تم دونوں کا انتخاب کر کے میں نے غلطی کی ہے۔"

"بس یار نادر علی! ذرا سی بات میں بگڑ جاتے ہو، دیکھو بھائی! بندہ لین دین کا کھرا ہو تو سارے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" دوسری طرف سے آواز آئی اور جموں بابا نے فون بند کر دیا۔

"اس وقت کے انداز میں بڑھاپے کی کوئی جھلک نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار! ہم لوگ اتنی محنت کر رہے ہیں اور بھائی نادر ہمیں برا بھلا ہی کہے جا رہے ہیں۔"

"اس کی عادت ہے چھوڑ یار! ویسے پیسے دے دے گا، دین کا برا نہیں ہے۔ بس اسی کو کہتے ہیں نا کہ بد اچھا بدنام برا۔" دونوں ہنسنے لگے۔

☆......☆......☆

مرزا عرفان احمد تھوڑی دیر قبل کورٹ سے واپس آئے تھے اور تھکن اتارنے کیلئے آرام کرسی پر دراز تھے کہ اطہر ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ اطہر کو دیکھ کر مرزا صاحب بری طرح چونکے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے تم۔۔۔تم۔۔۔واپس آ گئے خیریت؟"

"خوشخبری کے ساتھ سر!" اطہر نے مسکرا کر کہا۔

"واقعی۔۔۔؟ جلدی بتاؤ بھئی۔" مرزا صاحب کے لہجے سے خوشی پھوٹ پڑی۔

"جی سر۔۔!"

"کیا ہوا ایلڈ؟ کیسے ہوا؟ تم نے میری مایوسی دور کر دی ہے ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ ایک بڑی آسامی ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا صورت حال ہے۔" مرزا صاحب نے کہا اور اطہر انہیں پوری تفصیل بتانے لگا۔

"تم خود اس سے ملے؟"

"جی سر! اچھی طرح۔۔۔وہ سو فیصد خانہ بدوش قبیلے کا فرد معلوم ہوتا ہے۔"

"کمال ہے خوب کام بنا۔ دونوں ساتھ ہیں۔"

"جی سر! میں نے ریاض کو وہیں چھوڑا ہے تا کہ ان پر نگاہ رکھے، ہمارے لئے تو وہ بڑے قیمتی ہیں۔"

"بالکل بالکل۔۔۔غوری صاحب کی تو زندگی کا مقصد ہی ایک ہے اپنی پوتی کی تلاش۔ دن میں تین فون کرتے ہیں اور وقت بے وقت آ دھمکتے ہیں۔ ایک بار مجھے اپنی کوٹھی پر ڈنر دے چکے ہیں۔ لوگ بھی کمال کے ہوتے ہیں۔ یا تو۔۔۔ فرعونیت کی انتہا پر یا پھر "موم" ہوتے ہیں تو اس طرح کہ پانی کی طرح بہہ جائیں۔"

"اب کیا حکم ہے سر!؟"

"لے آؤ انہیں۔ صبر کرنا مشکل ہے۔ میں ان سے بات کر لوں پھر غوری صاحب کو بلا لوں گا، کوئی دقت تو نہیں ہوگی۔"

"دونوں کو لانا ہے؟"

"ہاں ہاں، دونوں کو ہی لے آؤ۔۔۔اور ذرا تصدیق ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے سر! میں چلتا ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" مرزا صاحب نے کہا اور اطہر سلام کر کے باہر نکل گیا۔ مرزا

عرفان احمد اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ وہ خود بھی بہت جذباتی ہو گئے تھے۔ آذر غیاث غوری نے کچھ اس طرح بے تکلفی اختیار کی تھی کہ مرزا صاحب ان کے دوست بن گئے تھے۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ غیاث غوری کو ان کی پوتی مل جائے۔ اب وہ بے چینی سے اطہر کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

ملازم نے آ کر پوچھا۔ "صاحب جی کھانا لگا دوں؟"

"ایں۔۔۔کھانا۔۔۔؟" وہ چونک کر بولے۔

"بالکل لگا دو۔ میں بھی بھوکا ہوں۔" دروازے سے غیاث غوری کی آواز سنائی دی اور مرزا عرفان احمد چونک پڑے۔ اس وقت غیاث غوری کی آمد انہیں بری لگی تھی کیونکہ ہاشا سے وہ اپنے طور پر بات کرنا چاہتے تھے لیکن اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے موڈ بحال کیا اور آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکتے ہوئے بولے۔

"لگا دو بھائی کھانا۔۔۔"

آذر غیاث مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور پھر کہنے لگا۔

"بے تکلفی کی معافی چاہتا ہوں مرزا صاحب! تفصیل بتا چکا ہوں۔ ویسے تو بہت سے افراد سے شناسائی ہو گئی ہے وطن آنے کے بعد لیکن شناسائی اور دوستی میں فرق ہوتا ہے نجانے کیوں میں آپ کو اپنا دوست سمجھنے لگا ہوں اور جب انسان ایسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو پھر اسے کسی معاملے میں تکلف نہیں کرنا چاہئے۔"

"آیئے بیٹھئے غوری صاحب! اور واقعی کھانا کھا لیجئے گا کیونکہ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی بھوک ایسی اڑے گی کہ کھانے پینے کا تصور بھی آپ کے ذہن میں نہ رہے گا۔"

آذر غیاث غوری چونک پڑا، پھر بھی اس نے غور سے عرفان احمد کی شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"غیر مناسب وقت پر آنے کا کوئی بدلہ تو نہیں لے رہے مرزا صاحب! کیسی بات کہہ دی ہے آپ نے، میں تو ویسے ہی تجسس کا مارا ہوا ہوں براہ کرم بتائیے۔ کیا مطلب ہے آپ کے ان الفاظ کا؟"

"کھانے کے بعد مناسب رہے گا؟"

"یار پلیز! اتنا سخت رویہ اختیار مت کرو، جو جملے کہے ہیں ان کی براہ کرم تشریح کردو۔"

"ہاشا مل گیا ہے غوری صاحب!" عرفان احمد نے کہا اور آذر غیاث غوری کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کک۔۔۔کیا؟" اس کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری۔

"ہاں! آپ کے آنے سے دو یا تین منٹ پہلے میرا ایک آدمی یہاں آیا تھا اور اس نے مجھے اطلاع دی۔ ارادہ تو میرا یہ تھا کہ پہلے ہاشا سے تمام تفصیلات معلوم کروں گا اور اس کے بعد آپ کو اِنفارم کروں گا لیکن بس ٹھیک ہے، آپ کے جذبات زیادہ سچے ہیں۔"

"آپ کو خدا کا واسطہ مرزا صاحب! مجھے ذرا سی کچھ اور تفصیل بتائیے، کہاں ملا ہاشا آپ کو؟"

"نور پور میں، میں نے اپنے دو آدمی وہاں بھیجے تھے جو وہاں کے چپے چپے پر ہاشا کی کھوج کر رہے تھے۔ پھر وہاں انہیں ایک ایسا شخص ملا جو وہاں کا قدیم باشندہ تھا اور ہر بات جانتا تھا، ہاشا اس کا دوست تھا، اس کا تذکرہ بس رواداری میں ہوگیا۔" مرزا عرفان احمد نے وہ ساری تفصیل جو اطہر احمد نے انہیں سنائی تھی بتادی۔ آذر غیاث غوری نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"آپ کا کہنا واقعی بالکل ٹھیک تھا۔ اس تفصیل کو سننے کے بعد بھلا بھوک کہاں قائم رہ سکتی ہے۔"

"مگر میری بھوک قائم ہے اور ملازم نے دو افراد کا کھانا لگایا ہوگا، اس لئے آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں گے؟"

"بلایا ہے آپ نے اسے؟"

"ہاں میں نے یہی سوچا تھا کہ پہلے ذرا تفصیلات معلوم کرلوں، اس کے بعد آپ کو زحمت دوں گا۔"

"ظلم کر رہے تھے آپ مرزا صاحب! میں بڑا ناراض ہوتا آپ سے، دونوں دوست مل کر معلومات حاصل کریں گے۔" آذر غیاث غوری نے بے تکلفی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ملازم نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تھی۔ دفتر سے ملحق ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنالیا گیا تھا، وہیں کھانا ایک میز پر بڑی نفاست سے لگا ہوا تھا، دونوں کھانے میں مصروف ہوگئے۔ آذر غیاث غوری بس چھوٹے چھوٹے نوالے لے رہا تھا، اس کے چہرے پر گہری سوچ کے آثار تھے۔ مرزا عرفان احمد ہمیشہ کھل کر کھانے کے عادی تھے۔ دو تین بار انہوں نے آذر غیاث کو ٹوکا تو آذر غیاث نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا جذباتی کیفیت ہے میری، ابھی تو میری پوتی مجھے نہیں ملی، خدا کرے کہ اس کیلئے کوئی دقت نہ ہو، لیکن ایک بات میں جانتا ہوں، جس دوست نے مرزا عرفان احمد کا نام لیا تھا، سب سے پہلا احسان تو اس نے میرے اوپر کیا تھا، کیا بات ہے آپ کی مجھے یقین ہے کہ آپ جیسا دوست میرا زندگی بھر کا ساتھی بن سکتا ہے۔"

"کھائیے کھائیے۔ مجھے بھی آپ نے اتفاق سے دوستی کے جال میں پھانس لیا ہے۔"

"اتفاق۔۔۔ہاں واقعی بہت بڑا اتفاق ہے یہ آپ دیکھئے کہ وہ شخص نور پور میں کس طرح ملا، اور اتفاق دیکھئے کہ وہ ہاشا کا دوست بھی تھا اور اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ ہاشا شہر میں رہتا ہے اور وہ آپ کے آدمیوں کو لے کر شہر بھی آگیا، قدرت جب کوئی کام بنانے پہ آتی ہے تو یہی اتفاقات انسان کی راہنمائی کا ذریعہ ہوتے ہیں جو درحقیقت اتفاقات نہیں ہوتے۔"

"کھانا کھاؤ یار! کھانا کھاتے ہوئے دماغ کھانا اچھی بات نہیں ہوتی۔" مرزا عرفان احمد نے کہا اور آذر غیاث نے ہنس کر کھانے کی جانب ہاتھ بڑھادیئے۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور پھر مرزا عرفان احمد کا اضطراب بڑھنے لگا۔ آذر غیاث بھی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا اس نے کہا۔

"جہاں سے ان لوگوں کو لایا جائے گا وہ بہت دور ہے کیا؟"

"ہاں ایک کچی آبادی ہے۔" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"یار! انہیں گاڑی پر بھیج دیتے۔"

"میں فون کرتا ہوں۔" مرزا عرفان احمد نے کہا اور موبائل فون پر اطہر سے رابطہ قائم کرنے لگا، فوراً ہی جواب ملا۔

"جی سر! اطہر بول رہا ہوں۔"

"اطہر! بہت دیر ہوگئی ہے۔"

"سر! ہم دفتر کے قریب ہی ہیں، میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کر رہا ہوں، ابھی پہنچے۔"

عرفان احمد صاحب نے موبائل فون بند کر دیا اور صورتحال آذر غیاث کو بتانے لگے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اطہر دو مجہول سے آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا آذر غیاث غوری اور مرزا عرفان احمد انتہائی گہری نگاہوں سے ان سادہ لوح افراد کا جائزہ لینے لگے۔

پھر ان دونوں میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "سرکار مائی باپ! ہم ایسی کرسیوں پر کبھی نہیں بیٹھے، آپ ہمیں نیچے بیٹھنے کا حکم دو۔"

"نہیں بابا! آپ ہمارے مہمان ہیں، ہمارے دوست ہیں اور دوست کو زمین پر نہیں بٹھایا جاتا، آپ آرام سے بیٹھئے۔"

دونوں سہمے سہمے سے انداز میں صوفوں پر بیٹھ گئے تھے۔ آذر غیاث غوری اور مرزا عرفان احمد غور سے ... جائزہ لے رہے تھے، پھر مرزا عرفان احمد نے کہا۔

"تم میں سے ہاشا کون ہے؟"

"سرکار مائی باپ! اس کا نام ہاشا ہے اور میرا نام جموں ہے، ہم اس کے دوست ہیں۔"

"کیا کھائیں پئیں گے آپ لوگ؟"

"نہیں مائی باپ! ہمیں کچھ نہیں چاہئے جو بھائی ہمیں یہاں لایا ہے اس نے بڑا احسان کیا ہے ہمارے اوپر۔ پورے سو روپے دیئے ہیں اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر لایا ہے یہاں تک۔ ہم اپنے دوست سے مل لئے بڑی خوشی ہوئی ہے ہمیں اور اسے بھی، کہہ رہا ہے کہ جموں بھیا! فرشتے اترے آسمان سے اور اب یہی بھیا ہمیں یہاں لایا ہے کہ چلو تمہیں

تھوڑا سا کام کرنا ہے انعام دلوائے گا ہمیں۔ سرکار جی! ہم تو بڑے غریب لوگ ہیں، کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے ہمارے پاس، آپ کی مہربانی سرکار جی!"

"ہاں۔۔۔ ہاں تمہیں اتنا انعام ملے گا کہ تم باقی زندگی آرام سے گزارو گے۔"

"مہربانی سرکار جی بڑی مہربانی۔۔۔" "لیکن ہاشا تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہو گا؟"

"کردیں گے سرکار جی! حکم کرو، ویسے ہمارے ہاتھ پاؤں تھک گئے ہیں اب، پھر بھی پوری پوری کوشش کریں گے کہ آپ کا کام کردیں۔"

"ہاتھ پاؤں کا کام نہیں ہے، بس تھوڑا سا یادداشت پر زور دینا پڑے گا۔"

"یاد۔۔۔ داشت۔۔۔" ہاشا نے فکر مند۔۔۔ نگاہوں سے جموں کو دیکھا تو مرزا عرفان احمد جلدی سے بولا۔

"مطلب یہ ہے کہ اپنے دماغ پر زور دینا ہوگا، کچھ سوچنا پڑے گا تمہیں۔۔۔۔"

"ارے وہ تو ہم کرلیں گے آسانی سے۔"

"تو میری بات سنو ہاشا! بہت پرانی بات ہے، تم اپنے قبیلے کے ساتھ رہتے تھے، کیا نام تھا تمہارے قبیلے کے سردار کا؟"

"گلو کہتے تھے، دادا گلو ہم اپنے قبیلے کے سردار کو۔" ہاشا نے کہا۔

"تمہیں اپنا قبیلہ چھوڑے ہوئے کتنا عرصہ گزرا؟"

"سرکار! ہمارے پاس دن اور مہینوں کا حساب نہیں ہوتا، پڑھے لکھے تھوڑی ہیں ہم لوگ۔"

"ہاں ٹھیک ہے، اچھا ایک بات بتاؤ، تمہارے قبیلے میں ایک بہت خوبصورت سی لڑکی سورا۔۔۔"

"راشوا کی بیٹی سورا؟ وہ جس نے باہر کے بابو سے شادی کرلی تھی؟"

"ہاں، اس کے باپ کا نام راشوا تھا نا؟"

"بالکل سرکار! ہاں پر اس کے ساتھ تو بڑا برا ہوا سرکار! محبت تو کرلی تھی اس نے شہری بابو سے، پر راس نہیں آئی اسے، بنگا نے تو پہلے ہی پیش گوئی کردی تھی، بنگا کی پیش گوئی

بابو جی غلط نہیں ہوتی تھی، بنگا نے کہا تھا کہ سورا قبیلے سے باہر شادی کر رہی ہے تو۔۔۔۔ یہ شادی راس نہیں آئے گی بن موت ماری جائے گی۔"

"اچھا! اب تم یہ بتاؤ کہ سورا نے شادی کر لی اس شہری بابو سے، پھر کیا ہوا؟"

"سرکار! ہمیں ساری باتیں معلوم ہیں، سورا نے شادی کر لی اور شہری بابو کے ساتھ چلی گئی۔ پر سرکار! اس کے بعد سورا کا خاوند مر گیا۔ سورا نے اس وقت ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ شانیہ نام رکھا تھا اس کا۔۔۔ شانیہ اور اس کی ماں بڑی بے کسی کی زندگی گزار رہے تھے، قبیلہ وہاں سے اٹھ گیا آگے بڑھ گیا، ہمارا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ہم قبیلے کے ساتھ لگے لگے پھریں۔

ہم نے بھی قبیلہ چھوڑ دیا اور سرکار وہیں نور پور میں رہنے لگے۔ وہیں ہماری یاری جموں سے ہوئی تھی، بس جموں کی وجہ سے ہی ہم نے قبیلہ چھوڑا تھا، بڑا پیار تھا ہمیں اس سے، بعد میں ہمارے من میں شہر میں رہنے کی سمائی اور ہم شہر آ گئے، وقت گزرتا چلا گیا اور سرکار! بوڑھے ہو گئے ہم، اب بڑے دنوں کے بعد اپنے یار سے ملاقات ہوئی ہے۔"

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں دوستی چیز ہی ایسی ہوتی ہے، اچھا ہاشا! ایک بات بتاؤ وہ سورا کی جو بیٹی تھی شانیہ، وہ کہاں گئی؟"

"اپنی خالہ شدلہ کے پاس ہے۔"

"ہے۔۔۔۔"

"ہاں سرکار! جوان ہو گئی ہے اب تو وہ۔"

"کیا نام بتایا تم نے اس کی خالہ کا؟"

"سرکار شدلہ، راشوا کی دو ہی بیٹیاں تھیں، ایک شدلہ اور سورا، شدلہ بڑا پیار کرتی تھی سورا سے، سورا مر گئی تو کافی دن تک وہ پاگل رہی، پھر اس نے سورا کی بیٹی اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لی اور آج تک اسی کے پاس ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہے؟" آذر غیاث غوری اپنا تجسس دبا نہ سکا، اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

"وہ سرکار! ہمارے قبیلے کی تھیں دونوں، ہم نہ جانیں گے تو اور کون جانے گا؟"

"کہاں ہیں دونوں، میرا مطلب ہے شانیہ اور اس کی خالہ شدلہ۔"

"ردھوا گاؤں میں رہتی ہیں وہ، ابھی میلے پر ملی تھیں ہمیں دونوں۔ شدلہ تو بالکل بڑھیا ہو گئی ہے، اس کی تو کھوپڑیا ہی کام نہ کرے سرکار! پتہ نہیں کیا کیا بڑبڑاتی رہتی ہے لیکن شانیہ بڑی اچھی بچی ہے۔"

"ردھوا گاؤں؟ یہ کہاں ہے؟ تم ہمیں اس کا پتہ بتا سکتے ہو۔"

"بتا دیں گے سرکار! ہمارا کیا ہے؟"

"ہاشا! تم ہمارے ساتھ چلو گے؟"

"جموں بھی چلے گا سرکار! اب جہاں ہم وہاں یہ۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہیں ہزاروں روپے انعام دوں گا ہزاروں۔۔۔۔"

"سرکار! دم نکل جائے گا ہمارا، ہم نے ہجار روپے کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھے۔"

"لو۔۔۔ یہ پانچ ہزار روپے ہیں، مگر ابھی تمہارا دم نہیں نکلنا چاہئے کیونکہ ابھی ایسے پانچ ہزار میں کئی بار دوں گا۔"

دونوں کانپ رہے تھے، نوٹوں کی گڈی ان کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی، وہ ایک دوسرے پر نوٹ پھینک رہے۔ جیسے ان کے ہاتھ جل رہے ہوں۔

آذر غیاث غوری کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اس نے کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے، یہ بتاؤ کب چل رہے ہو ہمارے ساتھ، گاؤں کا کیا نام بتایا تھا تم نے؟"

"سرکار! ردھوا گاؤں۔"

"ہاشا! بس تم تیاریاں کر لو تمہیں ہمارے ساتھ ردھوا گاؤں چلنا ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم سرکار!"

"اور سنو، جب تک ہم تمہیں ساتھ لے جانے کیلئے تیار نہ ہو جائیں تم اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں جائیں گے مالک۔ اب تو آپ کے نمک والے ہو گئے ہیں، نمک حلال۔۔۔"

☆......☆......☆

رومانہ نے نگاہیں اٹھا کر اس بوڑھی عورت کو دیکھا جو اس کے سامنے چائے رکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بوڑھی ایک ہمدرد عورت ہے۔

"خالہ جی!" اس نے پکارا اور عورت رک گئی۔

رومانہ جب بھی اسے اس طرح مخاطب کرتی تھی، عورت کے چہرے پر کرب کے نقوش ابھر آتے تھے۔

"خالہ جی! کوئی کام کر رہی ہیں؟"

"نہیں بیٹی! بولو کیا بات ہے؟"

"خالہ جی! آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں بولو؟"

"بیٹھ جائیے۔" رومانہ نے کہا اور عورت بیٹھ گئی۔

"آپ کا نام سچ مچ شدلہ ہے؟" بوڑھی عورت نے غم آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر بولی۔

"تمہارا نام شانیہ ہے۔"

"نہیں۔ میرا نام تو۔۔۔"

"میرا نام بھی شدلہ نہیں ہے۔"

"ایک بات پوچھوں۔ مجھے تو میرے چچا نے اپنا مطلب پورا کرنے کیلئے نام بدلنے پر مجبور کر دیا ہے، تمہاری کیا مجبوری ہے؟"

بوڑھی عورت نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولی۔ "پتہ نہیں میری کیا مجبوری ہے بیٹی! مجھے بڑی بڑی باتیں کرنا نہیں آتیں، بس اتنا ہی کہوں گی کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بنائے ہوئے کھلونوں سے کھیلتا ہے کوئی کمزور کوئی طاقتور، کوئی معذور کوئی توانگر، کوئی سمندر تو کوئی سوکھا نالہ۔۔۔ مرضی اس کی مالک ہے وہ۔"

"مجھے اپنے بارے میں بتائیے۔" اسی وقت باہر کچھ آہٹیں سنائی دیں۔۔۔ اور پھر دروازہ زور سے کھلا۔ باہر جو کوئی بھی نظر آیا تھا اسے دیکھ کر دونوں بری طرح سہم گئی

تھیں۔

☆......☆......☆

آنے والا نادر علی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر خباثت ہی خباثت تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں خون چمکتا رہتا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور اندر داخل ہو گیا، پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"دیکھو! مجھے چھپ کر باتیں سننے کی عادت نہیں ہے، مگر کیا کروں مجبوری ہے، تمہاری جگہ اگر اور کوئی ہوتا تو میرے اس منصوبے میں مجھ سے آگے بڑھ کر کام کر رہا ہوتا۔ میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ میری اپنی بھتیجی جسے میں اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہوں، مجھے ایک ظالم درندہ اور اپنا دشمن تصور کر رہی ہے، بیٹا ایسی بات نہیں ہے۔ کوئی تجربہ نہیں تمہیں زندگی کا۔ فاقوں سے گزرتے ہوئے دن رات، ضرورتوں کو ترستے ہوئے معصوم بچے جب نگاہوں کے سامنے آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ جینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ کیا ضرورت تھی کسی عسرت زدہ گھرانے میں شادی کرنے کی، بھائی صاحب بیچارے ایک شریف اور ناکام انسان ہیں۔ انہوں نے زندگی میں کچے داؤ کھیلے ہیں اور ہمیشہ ناکامیوں کا سامنا کیا ہے۔ ہمیں جو یہ موقع ملا ہے، یہ ہماری تقدیریں بدل دے گا۔ رومانہ! تم جس عیش و عشرت کی زندگی میں داخل ہونے جا رہی ہو اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہو گا جب تم زندگی کو بھرپور نگاہوں سے دیکھو گی۔ وقت بدل جائے گا تمہارا۔ خیر! میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا اور تم مجھے کیوں کچی نظر آ رہی ہو، تمہارا فرض کیا ہے، کیا سمجھانا ہے تمہیں اس لڑکی کو۔"

"نہیں نادر! میں کہاں کچی ہوں؟" شدلہ جلدی سے بولی۔

"ہاں تمہیں کچا نہیں ہونا چاہئے، اب آخری مرحلہ چل رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کل تک تمہیں روانہ ہو جانا ہے اور اس کے بعد ایک ڈرامہ اسٹیج ہو گا۔ آخری بار میں تمہیں یقین دلاتا ہوں رومانہ کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جائے گا۔ میں تمہاری پشت پر ہوں جونہی یہ ڈراپ سین ہو گا میں تمہیں تمہاری خوشیاں واپس کر دوں گا۔ بہت سے کرداروں کی واپسی ہو گی۔ تمہارے ماں باپ اور شاید وہ نوجوان بھی جسے تم نے زندگی کا مرکز بنایا ہوا ہے

لیکن یہ اس وقت ہوگا جب تم میرے منصوبے میں پورا پورا ساتھ دوگی۔"

"تو میں نے آپ کو کب منع کیا ہے چچا جان!" رومانہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"یہ کیا سوگ منا رہی ہو تم! میں تمہارے چہرے پر وہی سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں جس کی تمہیں اب تک تربیت دی گئی ہے۔ چلو سبق سناؤ اپنا۔ یہ سمجھ لو کہ یہ تمہاری فائنل ریہرسل ہے اور اس کے بعد تمہیں اسٹیج پر آ جانا ہے۔ دنیا بھر کی نگاہوں کے سامنے۔ کہیں بھی اگر تمہارے کردار میں کوئی خامی نظر آئی تو سمجھ لو کہ اسٹیج پر انڈے اور ٹماٹر ہی پڑتے ہیں، لیکن جس اسٹیج پر تم شو کر رہی ہو، وہاں صرف اور صرف موت ملتی ہے، ناکامی کی صورت میں۔" نادر علی کے لہجے میں شدید غراہٹ پیدا ہوگئی اور رومانہ سہم گئی۔

"ہاں بے بی! تمہارے قبیلے کے سردار کا کیا نام تھا؟" نادر نے پوچھا۔

"گلو دادا۔" رومانہ نے جواب دیا۔

"اور تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟"

"سورا۔"

"یہ عورت کون ہے؟"

"میری خالہ شدلہ۔"

"تمہارے نانا کا کیا نام تھا؟"

"راشوا۔"

"تمہارے قبیلے میں ایک پیشن گو تھا اس کا نام کیا تھا؟"

"بنگا۔۔۔۔"

"ماں کی موت کے بعد تم نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں، اپنی خالہ کے پاس رہنے لگی۔"

"تمہاری خالہ کیا کرتی ہے؟"

"کاغذ اور سرکنڈے کے کھلونے بناتی ہے اور سر پر ٹوکری لے کر بستی بیچنے نکل جاتی ہے، میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔"

"ٹھیک، تو بیٹے اپنے سبق کو بھرپور طریقے سے یاد کر لو، تم جانتی ہو کہ کونسے جملے ادا کرتے ہوئے چہرے پر کیسے تاثرات ہونے چاہئیں۔ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ ہر بات کو اچھی طرح سمجھتی ہو۔ بس صرف اتنا ذہن نشین کر لو، کہ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہو رہی ہے، دنیا پتہ نہیں کیا کیا کرتی ہے، ہم تو صرف ایک شخص کی خواہش پوری کر رہے ہیں اور یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ جو کردار تم ادا کر رہی ہو ان کا اب اس دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔ ارے کوئی بھی دھوکا دے کر آذر غیاث غوری کو اپنے جال میں پھانس سکتا تھا، کیا سمجھیں تم؟"

"جی نادر چچا!"

"اور پھر ہم لوگ تم سے دور تو نہیں ہوں گے۔ میں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ میرے اور بھی ساتھی ہیں جو اس پورے کھیل کی نگرانی کریں گے، تمہیں کہیں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔"

"جی اچھا۔"

تو اب میں جاؤں، تمہارا سبق بالکل ٹھیک ہے۔"

"جی نادر چچا!"

اور نادر علی کمرے سے باہر نکل گیا۔ رومانہ کے حلق میں ایک گولہ سا پھنسا ہوا تھا۔ اتنا دباؤ تھا اس کے سینے میں کہ نادر علی کے جانے کے بعد اس سے برداشت نہ ہو سکا اور آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور بوڑھی عورت اسے رحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"نا بیٹی نا! روتے نہیں ہیں۔"

"ارے روتے نہیں ہیں تو پھر کیا کرتے ہیں خالہ جی! ذرا سوچو تو، یہ کیسی انوکھی ڈکیتی ہے۔ کسی کے گھر چور، ڈاکو آ جاتے ہیں، اس کا مال و اسباب چھین کر لے جاتے ہیں، اسے قلاش کر جاتے ہیں۔ دولت تو آنی جانی چیز ہے، محنت مزدوری کر کے وہ اتنی نہ سہی تھوڑی بہت دولت پھر کما لیتا ہے۔ جینا تو ہر انسان کو آتا ہے، لیکن مجھ سے کیا چھینا جا رہا ہے تم جانتی ہو خالہ جی! میری ماں، میرا باپ، میرا محبوب، میری شخصیت، میرا گھر، میری

دنیا، میرا ماحول، میرا کالج اتنا سب کچھ چھن گیا مجھ سے، میں جو رومانہ تھی کالج کی ایک لڑکی، آزادی سے زندگی گزارنے والی، ماں باپ کے پاس جو کچھ بھی تھا، میں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا تھا، میرے ابو مجھے کیا دینا چاہتے ہیں۔ جدائی، ایک قبیلے کے کسی شخص کی ولدیت جسے میں جانتی تک نہیں، مجھ سے میرے ماں باپ کا نام چھن رہا ہے۔ سب مجبور ہو گئے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ میں نے سرمد سے وعدہ کیا تھا کہ میں نے دنیا میں کوئی کام نہیں کیا، میں ایک بے بس اور کمزور سے لڑکی ہوں، لیکن تمہاری گردن نہیں کٹنے دوں گی۔ تم پھر شہید نہیں ہوگے، ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ مگر بدبخت نکلا سرمد ہی، ہمیشہ ہی سرکتا تا رہا ہے، ہائے میں کیا کروں خالہ جی! مجھے بتایئے میں کیا کروں۔ کل میں اپنی ماں کو ماں نہیں کہوں گی، باپ کو باپ نہیں کہوں گی، اپنے آپ کو رومانہ نہیں کہوں گی۔ میرا تو نام تک مجھ سے چھن گیا۔''

وہ روتی اور بلکتی رہی۔ بوڑھی عورت جو بہرحال انسان تھی، اپنے طور پر اسے تسلیاں دیتی رہی، اس نے کہا۔

''کرنا وہی ہے رومانہ جو نادر علی نے کہا ہے، میں اسے جانتی ہوں اچھی طرح، جنون میں دیوانہ ہو جاتا ہے، کچھ بھی کرسکتا ہے وہ۔''

''ہاں! میں وہی کروں گی جو نادر چچا نے کہا ہے، ہائے انہوں نے تو اپنا رشتہ تک مجھ سے چھین لیا۔'' رومانہ نے افسوس بھری آواز میں کہا۔

باہر نادر علی اور سید علی دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے۔ سید علی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رومانہ خاموش ہوئی تو نادر علی نے بھائی کو دیکھا۔ کندھے پر تھپکی دے کر وہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر انہیں دروازے کے پاس سے دور لے آیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں بھائی جان! آپ رو رہے ہیں؟''

''یار! اولاد ہے وہ میری، کیسا درد کیسا سوز ہے اس کی آواز میں۔''

''بھائی جان! میں آپ سے اتنا ہی عرض کرسکوں گا کہ ہر بڑے کام کو کرنے کیلئے دل پر تھوڑا سا جبر کرنا پڑتا ہے، آپ رومانہ کے مستقبل کیلئے ہی تو سب کچھ کر رہے ہیں، آپ خود روئیں گے تو اس کا کیا ہوگا؟''

''نہیں نادر علی! میں جانتا ہوں یہ پودا میں نے ہی لگایا ہے، لیکن بس ذرا سا مجھے معاف کردو اس سلسلے میں۔ کمبخت ماں باپ کا دل اولاد کے لئے نجانے کیا ہوتا ہے۔ تم یقین کرو، میں نے زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا، بہت سے ایسے مواقع ملے مجھے میں اگر چاہتا تو خطرہ مول لے کر دولت کمانے کیلئے کام کرسکتا تھا، بے شک وہ دولت بہت بڑی نہ ہوتی، لیکن میری زندگی میں رومانہ کے سوا اور کچھ ہے بھی تو نہیں۔''

''میں نہیں ہوں بھائی جان! مجھے بھی تو آپ نے رومانہ کے برابر ہی کا درجہ دیا ہے۔ میری آرزو، میری خواہش، زندگی میں ایک بار صرف ایک بار امریکہ کی شہریت مل جائے۔ گرین کارڈ مل جائے مجھے۔ باہر تک جانے کے راستے نکل آئیں تو بھائی جان مجھے یوں لگے گا جیسے میں نے زندگی میں سب کچھ حاصل کرلیا ہے۔ آپ یقین کریں رات کی تنہائیوں میں جب میں اپنے بستر پر لیٹتا ہوں تو میری آنکھوں میں صرف ایک ہی خواب ہوتا ہے، نیویارک، واشنگٹن، لاس اینجلس، شکاگو۔ ہائے بھائی جان! ہر جگہ گھومی ہے میں نے اپنے تصور میں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ میں تصور کی اس کی دنیا سے باہر آؤں، آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے بھائی کی یہ ایسی آرزو ہے جو اسے مرنے بھی نہیں دے گی، بھائی جان! خود کو سنبھالئے، ہمیں یہ ڈرامہ ہر صورت کرنا ہے اور اس کا اختتام آذر غیاث غوری کی موت پر ہوگا۔ لیکن اس وقت جب اس کی ساری دولت ہماری رومانہ کے نام منتقل ہو چکی ہو گی۔ پھر کیا ہوگا بھائی جان آپ کو اندازہ ہے نا۔''

سید علی نے آنکھوں کے آنسو پونچھ لئے پھر بولے۔

''تو ان دونوں کو کب روانہ کر رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے کل، وہاں جا کر بھی انہیں ایڈجسٹ ہونا ہے۔ انتظام تو میں نے سارے کر لئے ہیں کیونکہ بہرحال اس علاقے میں یہ دونوں نئے لوگ ہوں گے، لیکن ہمیں زیادہ وقت نہیں لگے گا، میں نے لوگوں کو مقرر کردیا ہے، وہ عام لوگوں کو ان دونوں سے دور رکھیں گے۔''

''نادر علی! میں نے صرف ایک خواب دیکھا تھا، بالکل خوابوں جیسی بات تھی لیکن میرے فرشتے ہی اس کی تکمیل کرسکتے تھے، تم نے تو کمال کر دکھایا، میں سخت حیران ہوں۔''

''وہ بات دراصل یہ ہے بھائی جان! کہ جرائم کی دنیا میں میری تھوڑی بہت شناسائی رہی ہے، لیکن کوئی بڑا جرم میں نے نہیں کیا، حالانکہ مجھے اس کے مواقع بھی ملے اور پیشکش بھی ہوئی، لیکن میں نے بڑا جرم اس لئے نہیں کیا کہ مجھے امریکا جانا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا جرم کرنے کے بعد مجھے جیل کی سزا بھگتنی پڑے اور اس طرح میرے خواب چکنا چور ہو جائیں۔ بہر حال آپ نے پہلی بار اپنے بھائی کو آزمایا اور میں آپ کی آزمائش پر پورا اتروں گا۔''

''یہ لوگ تم نے کہاں سے اکٹھے کئے، کیا یہ واقعی اپنا کردار نبھا سکیں گے؟''

''نبھا لیا انہوں نے بھائی جان! اب کیا رہ گیا ہے، آپ جانتے ہیں یہ کون لوگ ہیں۔ یہ اسٹیج کے بندے ہیں۔ اسٹیج پر ڈرامے کرتے ہیں۔ عام آدمی اتنا اچھا ڈرامہ تھوڑی کر سکتا تھا۔ میں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر ان کا انتخاب کیا، جو بندہ ہاشا کا رول کر رہا ہے اس کا نام سجاد ہے۔ دوست جموں کا کردار کرنے والے کا نام نیاز خاں ہے اور یہ عورت جو شدلہ بنی ہے اس کا نام نبیلہ ہے۔ میں نے سارے کرداروں کی خوب چھان بین کی ہے اور اچھی طرح انہیں ہوم ورک کرایا ہے۔ اب یہ سب اپنا رول بہترین طریقے سے ادا کریں گے۔ سجاد اور نیاز خاں کے چہروں پر میک اپ ہے، نبیلہ رومانہ کا میک اپ کرے گی اور پھر رومانہ بھی اپنے آپ کو رومانہ کہنا بھول جائے گی۔ اس کا نام شانیہ ہوگا صرف شانیہ۔''

''تمہاری بھابی کچی پڑ رہی ہے، کہتی ہے بیٹی سے دور نہیں رہ سکے گی۔''

''یہ تھوڑا وقت تو بھابی کو ایسے گزارنا ہی ہوگا، میں شدلہ کا کردار بھابی سے ادا کرا لیتا، لیکن اتنا آسان نہیں ہے یہ، وہ بندہ جس نے اربوں روپے کمائے ہیں بے وقوف نہیں ہوگا، شدلہ تو اسٹیج کی اداکارہ ہے، وہ اپنا کردار بہترین طریقے سے نبھائے گی، اگر میں یہ کردار بھابی کو دے دیتا تو بہت جلد بھانڈا پھوٹ جاتا۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' سید علی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''بہر حال کھیل کا آغاز میں نے ہی کیا، دیکھیں اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

☆......☆......☆

مرزا عرفان احمد کوئی معمولی ایڈووکیٹ نہیں تھے۔ زبردست پریکٹس چلتی تھی ان کی، آمدنی بھی اچھی خاصی تھی، اپنی فیلڈ میں ہی کام کرنا پسند کرتے تھے لیکن آذر غیاث غوری کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ کاروباری معاملات سے ہٹ کر بھی اس کی طرف توجہ دینے لگے۔ آذر غیاث بڑا یار باش قسم کا آدمی تھا۔ جہاں تک عرفان احمد کی ذاتی دلچسپی کا معاملہ تھا۔ تو آذر غیاث نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ یار مرزا جو دل چاہے لے لینا، مجھے کون سا پیسہ لے کر اپنی قبر میں جانا ہے، جو کہو گے دوں گا۔ فیس کیلئے نہیں دوستی کیلئے کام کرو۔ لین دین اپنے دماغ میں رکھ لینا، تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بہر حال مرزا صاحب اب اتنے چھوٹے انسان بھی نہیں تھے کہ ان باتوں کے باوجود پیسوں کے بارے میں سوچتے البتہ شانیہ کے بارے میں علم ہونے کے بعد آذر غیاث نے جس طرح مرزا کا پیچھا کیا تھا، اس نے مرزا عرفان احمد کو تھوڑا سا نروس کر دیا تھا۔

''میرے بھائی! تین دن کا وقت دے دو، کوئی کیس نہیں لڑوں گا، کم از کم دو ہفتے کے بعد کی تاریخ لے لوں گا مگر۔۔۔۔''

''مگر۔۔۔۔ یہ کام تو تمہارا اسسٹنٹ بھی کر سکتا ہے؟'' آذر غیاث غوری نے کہا۔

''تم یقین کرو اگر اسسٹنٹ وہ سب کچھ کر سکتا ہوتا جو مجھے کرنا ہے تو میں ضرور ساری ذمے داریاں اسے سونپ دیتا، لیکن کچھ معاملات میں۔۔۔۔''

''بس یار! میرے دل کو لگی ہوئی ہے، جب تک پتہ نہیں چلا تھا اس وقت تک کوئی بات نہیں تھی، لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میری لخت جگر حیات ہے اور میں اس کی صورت دیکھ سکتا ہوں تو یوں سمجھ لو کہ صبر نہیں ہو رہا مجھ سے۔ تمہارے بغیر جانا نہیں چاہتا ورنہ اڑ کر پہنچ جاتا۔ نکالو جلدی وقت نکالو، ان دونوں کو ایک لمحے کیلئے مت چھوڑنا اگر وہ ہاتھ سے نکل گئے تو سمجھو کہ ہم ڈوب گئے، میرا مطلب ہے میں ڈوب گیا۔'' مرزا عرفان احمد ہنسنے لگے۔

پھر انہوں نے کہا۔ ''یہ ذمے داری مجھ پر چھوڑ دو، ایسا کرتے ہیں پرسوں کا وقت

نکال لیتے ہیں، میں کل خصوصی طور پر کورٹ جا کر پیش کاروں سے کہوں گا کہ میرا مسئلہ سنبھال لینا، کچھ ایسی ہی ایمرجنسی آ گئی ہے۔ اصل میں عدالت کے معاملات ہیں جن لوگوں کے کیس میرے پاس ہیں ناتم خود سوچو ان کے دل کو بھی لگی ہوتی ہے، میری طرف سے لاپروائی انہیں میرا دشمن بھی بنا سکتی ہے۔''

''سب جانتا ہوں ایک ایک بات معلوم ہے، لیکن بس کیا کروں۔'' مرزا عرفان احمد نے آذر غیاث کو تسلیاں دیں اور آذر غیاث نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے، بہرحال جس تن لاگے سو تن جانے۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھتا ہوں۔'' عرفان احمد نے واقعی کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا تھا۔ اطہر اور ریاض دونوں اس کچی آبادی میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک لمحے کیلئے بھی اس گھر کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ ادھر سجاد اور نیاز خان جو دونوں اسٹیج کے اداکار تھے، بڑے خوش اور مسرور تھے، انہوں نے اسٹیج کے شو چھوڑے ہوئے تھے، کیونکہ جانتے تھے کہ اسٹیج کی آمدنی سے زیادہ یہاں آمدنی ہونے کی توقع ہے۔ نادر سے ان کی گہری شناسائی تھی اور نادر نے انہیں رقم بھی پہنچا دی تھی جو بہرحال اسٹیج کی آمدنی سے کہیں زیادہ تھی۔ چنانچہ وہ بھی انتظار کر رہے تھے اور دونوں ہی مطمئن تھے۔

آخر کار وہ وقت آ گیا جب مرزا عرفان احمد، آذر غیاث غوری، اطہر اور ریاض ان کے ساتھ سجاد اور نیاز خان، ہاشا وغیرہ کے روپ میں نور پور چل پڑے۔ مرزا عرفان احمد، آذر غیاث غوری کے گہرے دوست بن چکے تھے۔ دونوں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ آذر غیاث نے کہا۔

''ایک بات بتاؤ مرزا! اگر وہ لڑکی ہمارے ساتھ آنے پر تیار نہ ہوئی تو کیا کرو گے؟''

''تم بالکل بے فکر رہو۔ اول تو وہ تیار ہو جائے گی اور اگر نہ ہوئی تو اسے اٹھوا لیں گے۔''

''ارے بب۔۔۔ باپ رے۔۔۔ اگر انہوں نے مزاحمت کی تو۔''

''میرے پیارے بھائی! میرے پاس مکمل انتظام ہے تم فکر مت کرو۔''

''ٹھیک ہے، خدا کرے ہمیں کامیابی حاصل ہو جائے۔''

ایک انتہائی قیمتی اور شاندار لینڈ کروزر میں یہ لوگ سفر کر رہے تھے اور یہ لینڈ کروزر آذر غیاث غوری کی تھی۔ اس کی دولت کا اندازہ تو مرزا عرفان احمد کو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بہرحال وہ لوگ راستہ بھی پوچھتے جا رہے تھے۔ اس وقت ڈرائیونگ اطہر کر رہا تھا، اطہر نے ہاشا سے کہا۔

''ہاشا! ردھوا گاؤں نور پور سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''ہم بتاتے ہیں جی! آپ نور پور سے سبل کی طرف چلو گے اور سبل سے گھوڑا کھائی، بس جیسے ہی گھوڑا کھائی ختم ہو گی، رادھوا آ جائے گا۔''

''نور پور تک تو میں تمہیں آرام سے لئے جا رہا ہوں، بس وہاں سے تم بتانا۔''

''ٹھیک ہے جی!'' ہاشا نے کہا۔

بہرحال یہ سفر دلچسپ بھی تھا اور سنسنی خیز بھی۔ عرفان احمد اچھی طرح جانتے تھے کہ اس وقت آذر غیاث غوری کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی لیکن سنسنی خیز لمحات آہستہ آہستہ قریب آتے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

رومانہ کو اب قرار آ گیا تھا۔ اس کے کام کے آغاز کے آخری لمحات جا رہے تھے۔ نادر علی اور سید علی دونوں اپنی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ دونوں کو یہ احساس تھا کہ رومانہ اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے، باقی تمام لوگ الرٹ تھے، یہاں تک کہ سید علی کی بیوی رومانہ کی ماں تک بہترین تعاون کر رہی تھی۔ رومانہ بھی اب خاصی حد تک سنبھل گئی تھی، لیکن نجانے کیوں سید علی کے ذہن میں ایک ہلکی سی خلش تھی۔ بیٹی کے الفاظ انہیں رہ رہ کر یاد آ رہے تھے اور کبھی کبھی تو انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے انہوں نے بیٹی کی گردن دبا دی ہو۔ بیوی سے انہوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''خدا کی قسم! اگر مجھے یہ احساس ہوتا کہ رومانہ ہماری ان کاوشوں کو اس طرح محسوس کرے گی تو میں اس سارے منصوبے پر لعنت بھیج دیتا، کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

"نادر بھیا سے بات کرو۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ جسے اصل کام کرنا ہے وہی سب سے کمزور دکھائی دے رہی ہے۔"

"میں نادر سے کہتا ہوں کہ اسے وہاں لے جانے سے پہلے ایک بار یہاں لے آئے، ہم اسے سمجھاتے ہیں۔"

سید علی نے نادر سے یہ بات کہی تو نادر علی نے کہا۔ "آپ لوگ جس طرح چاہیں اسے سمجھالیں، اسے یہاں نہ لائیں بلکہ میرے ساتھ چلیں۔ وہاں اس کا میک اپ ہو چکا ہے اور وہ روانگی کیلئے بالکل تیار ہے۔ باقی ریہرسل ہو رہی ہے۔ بہترین پرفارمنس ہے اس کی۔ پہلے سے کسی قدر بہتر حال میں ہے بلکہ میرا خیال ہے بھابی کو بھی اب لے چلتے ہیں، ان سے مل کر وہ زیادہ مطمئن ہو جائے گی۔"

سید علی کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔ "ٹھیک ہے جیسا تم پسند کرو۔"

"آخری لمحات جا رہے ہیں بھائی جان! اس کے بعد آپ بھی خوبصورت زندگی گزاریں گے اور میں امریکہ کی فضاؤں میں سانس لوں گا۔۔۔ امریکہ۔۔۔ ہا۔۔۔!"

سید علی نے بیوی کو تفصیل بتائی تو وہ بولی۔ "یہ کیا کیا تم نے سید علی! خدا کی قسم اس کے سامنے جاتی ہوں تو خود کو مجرم سمجھتی ہوں۔"

"مجھے احساس ہے۔ اصل میں ہم فیصلہ کرنے میں جلد بازی کر بیٹھے، مجھے یوں لگا تھا جیسے ہم اچانک دولت کے ڈھیر پر جا بیٹھے ہوں حالانکہ خود ہمیں اس دولت کی ضرورت نہیں تھی۔"

"اب یہ بتاؤ مجھے کیا کہنا ہے اس کے سامنے جا کر۔۔۔؟"

"یہی کہ اب اس کی کامیابی میں ہی ہماری زندگی ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ بہرحال جو کچھ ہم کرنے جا رہے ہیں وہ ایک خطرناک کام ہے اگر حقیقت منظر عام پر آ گئی تو سارے کے سارے دھر لئے جائیں گے۔ بعد میں کیا ہو گا یہ اللہ ہی جانتا ہے۔"

بہرحال وہ سب رومانہ کے سامنے پہنچ گئے، رومانہ کو دیکھ کر سید علی اور ان کی بیوی دنگ رہ گئے تھے۔ رومانہ ایک غریب لڑکی نظر آ رہی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں میں مٹی۔ چہرے کے نقوش اور چمکتا دمکتا رنگ ماند کر دیا گیا تھا۔ میک اپ مین کا تعلق تھیٹر سے ہی

تھا۔ نادر علی کو تھیٹر والوں سے اپنے تعلقات کا بڑا فائدہ ہوا تھا۔ سارے کے سارے کردار اس نے وہیں سے جمع کر لئے تھے اور وہ اس کیلئے بڑے شاندار ثابت ہو رہے تھے، میک اپ مین نے خالہ شدلہ اور شانیہ کو درحقیقت ردھوا گاؤں کا مکین ہی بنا دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس وقت رومانہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ماں کو دیکھا تو بے اختیار کھڑی ہو کر آگے بڑھی۔ پھر نادر علی کی طرف دیکھا تو نادر علی نے جلدی سے کہا۔

"رومانہ! دیکھو اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ اس معاملے میں گردن پھنسا بیٹھے ہیں، اب دو ہی صورتیں ہیں کہ ہم شاندار طریقے سے کامیاب ہو جائیں یا پھر ساری زندگی جیل میں چکی پیسیں۔"

"چچا جان! آپ نے میری ماں کو۔۔۔؟"

"نہیں بھابی سے پوچھ لو، میں نے تو صرف تمہیں آمادہ کرنے کیلئے بھابی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا لیکن میں ان کا اسی طرح احترام کرتا ہوں رومانہ! جس طرح پہلے کرتا رہا تھا۔ ہاں یہ موت اور زندگی کا معاملہ تھا۔ اگر تم اس سارے کام کیلئے تیار نہ ہوتیں تو میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ ہم سب کو اجتماعی خودکشی ہی کرنا ہوگی۔ بھابی کو میں نے بڑے احترام سے رکھا ہے اور اس وقت تک رکھوں گا جب تک تم ہم سے تعاون کرتی ہوگی۔ ہاں اگر تم نے اپنے پر پرزے نکالے تو بیٹا مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" سید علی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو وہ آگے بڑھ کر بولی۔

"رومانہ! میں بھی اب ان دونوں سے اتفاق کر رہی ہوں، بیٹا! تمہارے باپ نے جو کچھ کیا ہے تمہارے اعلیٰ مستقبل کے خیال سے کیا ہے۔ البتہ ان کے نظریے سے مجھے آج بھی اختلاف ہے، بیٹی کو اچھی زندگی دینا چاہتے تھے تو پھر بیٹی کو اپنے آپ سے اتنا دور کیوں کر دیا۔ جو بھی ہمارے پاس تھا وہی دے کر اس کے مستقبل کا آغاز کر دیتے۔"

"میری بات سنو، اب مجھے اتنا برا بھی قرار نہ دو۔ وقت آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم بھلا اس سے کون سے دور ہوں گئے۔"

"معافی چاہتا ہوں بھائی جان! میں بیچ میں مداخلت کر رہا ہوں میں یہ بات رومانہ سے بھی کہہ چکا ہوں۔ دیکھو رومانہ! ہم کوئی بڑا جرم نہیں کریں گے، آذر غیاث غوری

عمر رسیدہ آدمی ہے۔ میں اس کی شخصیت کا تجزیہ بھی کر چکا ہوں۔ محبت کو ترسا ہوا ہے۔ بیٹے کو زندگی سے محروم کرنے کے بعد اس کے دل میں بڑا گداز پیدا ہو گیا ہے اور اب وہ اپنے بیٹے کی بیٹی یعنی اپنی پوتی کو دنیا کی ہر آسائش دے دینا چاہتا ہے۔ تمہارا کام یہ ہوگا کہ اس کی پوتی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہو، اس کے اثاثوں پر نظر رکھو، سب کچھ تمہارا ہی ہوگا، درمیان میں تم ہمیں بڑی بڑی رقمیں دیتی رہو گی اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب آخر کار وہ ہم سے دور ہو جائے گا، یہ تم مجھ پر چھوڑ دو کہ ایسا کیسے ہوگا۔ سب کچھ تمہارا ہوگا اور رومانہ اس وقت تمہاری ماں تمہارا باپ، میں، سب تمہارے اپنے ہوں گے، سمجھ رہی ہو نا تم، تمہیں ہم سے بھرپور تعاون کرنا ہے، بھائی جان! رومانہ کی تربیت بالکل مکمل ہے اور بس آپ یہ سمجھئے کہ کچھ گھنٹوں کے بعد ہم اسے ردھوا منتقل کر دیں گے۔''

''ردھوا میں تم نے انتظام کر لیا ہے ناں؟''

''جتنے اعلیٰ پیمانے پر میں کام کر رہا ہوں بھائی جان! آپ یقین کریں کوئی پہلو میں نے کمزور نہیں چھوڑا ہے۔ ردھوا کی آبادی میں یہ ماں بیٹیاں دوسروں سے الگ تھلگ رہیں گی، وقت بھی تو انہیں صرف چند گھنٹوں کا ہی گزارنا ہوگا، اس کے بعد تو آذر غیاث انہیں اپنے گھر لے ہی آئے گا، وہ جھونپڑا ایک بھاری رقم دے کر خالی کرایا گیا ہے اور جھونپڑے کے مالکان کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ ہم ایک فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔ سادہ لوح دیہاتی مطمئن ہو گئے ہیں، بھائی جان! ابھی تک کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اپنی ماں سے باتیں کر لو اس کے بعد تمہیں روانہ ہو جانا ہے۔''

وہ لوگ رومانہ اور اس کی ماں کو کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل آئے، شدلہ باہر موجود تھی۔

''صاحب جی! مجھے کتنے دن تک یہ کام کرنا ہوگا؟''

''دیکھو نبیلہ! اسٹیج پر کام کر کے تمہیں جو کچھ ملتا ہے اس سے چار گنا روزانہ کے حساب سے تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا، موبائل فون پر تم ان سے معلومات بھی حاصل کر سکتی ہو موبائل تمہیں مہیا کر دیا جائے گا، جتنا عرصہ بھی گزرے تم سمجھ لینا ایک ایسے اسٹیج پر کام کر رہی ہو جو پبلک کے سامنے نہیں بلکہ ایک گھر میں ہے۔ ایک ایسی خوبصورت کوٹھی

میں جہاں اٹھنے بیٹھنے کا تم نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا، مگر تمہیں اداکاری لاجواب کرنی ہے اور تمہاری ہی زیر نگرانی رومانہ بھی کام کرے گی۔ تم اسٹیج کی منجھی ہوئی اداکارہ ہو، ہم نے تم پر بلاوجہ ہی بھروسہ نہیں کیا ہے۔''

''پیسے ملتے رہنے چاہئیں صاحب جی! ایک بات میں اور بتائے دیتی ہوں، جب میرا دل گھبرا جائے گا تو میں وہ جگہ چھوڑ بھی سکتی ہوں۔''

''ہم تمہارے لئے اس کا بھی انتظام کر دیں گے نبیلہ! کوئی بھی بہانہ بنا کر تم وہاں سے نکل سکتی ہو، مگر تھوڑا وقت تو گزارنا تاکہ رومانہ کو بھی تسلی رہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' نادر علی اور سید علی نے کھیل مکمل کر لیا تھا اور اس عجیب و غریب داستان کے دوسرے دور کا آغاز ہونے میں اب کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

لینڈ کروزر ردھوا گاؤں میں داخل ہو گئی۔ بہت ہی پسماندہ لیکن اچھی خاصی آبادی والی بستی تھی۔ تقریباً سارے ہی مکانات کچے نظر آ رہے تھے۔ کہیں تھوڑی بہت جگہ اینٹوں کا استعمال کر لیا گیا تھا۔ سڑکیں جوہڑ بنی ہوئی تھیں، غالباً کچھ گھنٹے پہلے بارش ہو چکی تھی۔ آوارہ کتے، آوارہ بچے، ننگ دھڑنگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے، آذر غیاث غوری نے منہ پر رومال رکھ لیا تو عرفان احمد نے ہنس کر کہا۔

''یہ بھی زندگی کا ایک رخ ہے غوری صاحب!''

''ہاں اندازہ ہو رہا ہے۔''

''اندازہ ہونا چاہئے، یہ آپ کا اپنا وطن ہے۔''

''یار! وطن پرستی کے موضوع پر تقریر مت شروع کر دینا اس وقت میں بڑا جذباتی ہو رہا ہوں۔''

آذر غیاث غوری نے کہا اور عرفان احمد ہنس کر خاموش ہو گیا۔ ہاشا راستے بتاتا جا رہا تھا، پھر اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ادھر بھیا جی! ادھر۔۔۔۔'' اشارہ ایک ایسے جھونپڑے کی طرف تھا جو ذرا الگ تھلگ بنا ہوا تھا، اس کے آگے احاطہ تھا اور اس احاطے کے اندر تین اونچے اونچے

درخت نظر آرہے تھے۔ان درختوں کے سائے میں ہی جھونپڑا بنا ہوا تھا، وہاں ہاشا نے لینڈ کروزر رکوالی اور نیچے اتر آیا، پورا گروپ سنسنی محسوس کر رہا تھا، تقریباً سبھی کو کہانی معلوم تھی، ہاشا آگے بڑھا اور اس نے آواز دی۔

"شدلہ! اری او شدلہ! کیا تو اندر ہے ری؟" پھر وہ احاطے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے کیلئے کوئی ایسا دروازہ نہیں تھا جسے رکاوٹ تصور کیا جاسکے۔ باقی لوگ بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے احاطے میں داخل ہو گئے۔تبھی اندر کے کچے جھونپڑے سے ایک عورت نمودار ہوئی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس، بال بکھرے ہوئے، تھوڑی سی جھکی ہوئی تھی۔

"کا ہے چیخے جارہا ہے بھائی! کون ہے؟"

"بھائی! بھی کہتی ہے اور پوچھ بھی رہی ہے کہ کون ہے، ارے بہنوں کے تو دل دھڑکتے ہیں بھائیوں کی خوشبو سے۔"

"کوئی بھائی وائی نہیں ہے میرا۔ تو کون ہے؟" عورت نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"ارے بھیا تو بھول گئے ہم کا مے، اے ری شدلہ! ہاشا ہوں میں۔"

"ارے ہاشا! تو ہے۔۔۔تو۔۔۔تو شہر میں رہتا ہے رے، ادھر کدھر سے آگیا مجھے کچھ کم نظر آنے لگا ہے ہاشا! پہچان نہیں سکی تھی تجھے۔ اری شانی! او شانیہ! ارے بیٹا! ذرا چار پائی بچھا دے، دیکھ ماما آیا ہے تیرا، ہاشا آیا ہے ہاشا۔۔۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

سب کے دھڑکتے دل اور متجسس آنکھیں اندرونی دروازے پر لگ گئیں۔تب انہوں نے ایک انتہائی خوبصورت نقوش کی مالک لڑکی کو باہر آتے ہوئے دیکھا۔وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔مگر اس کی دلکشی نے ان میلے کچیلے کپڑوں میں چار چاند لگا دیئے تھے، قدرتی طور پر پیازی ہونٹ کپکپا رہے تھے، آنکھوں کے کٹوروں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔اس کی مہین آواز ابھری۔

"کون ہے خالہ! ارے ماما جی۔۔۔ارے ماما جی۔۔۔" وہ تیزی سے ہاشا کی طرف بڑھی اور ہاشا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جموں ماما تم بھی آئے ہو۔" وہ بولی اور جموں نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

لڑکی نے ابھی تک ان لوگوں کو نہیں دیکھا تھا۔اس نے جلدی سے درختوں کے نیچے پڑی ہوئی دو چار پائیاں بچھائیں، آذر غیاث غوری پتھرایا ہوا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔تب شدلہ نے بھی ان دونوں کو دیکھا اور بولی۔

"ہاشا! کون آیا ہے تیرے ساتھ؟"

"بتاؤں گا اور چار پائی منگوا لے۔" ہاشا نے کہا لیکن اس سے پہلے ہی شانیہ ایک طرف دوڑ گئی تھی، پھر اس نے دو مزید چار پائیاں لا کر بچھا دیں۔

مرزا عرفان احمد نے کہا۔ "آیئے غوری صاحب!"

اطہر اور ریاض وغیرہ پیچھے ہی کھڑے رہے تھے۔آذر غیاث غوری کے بدن میں حرکت ہوئی پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھے اور اس طرح چار پائی پر بیٹھ گئے جیسے قدموں میں جان ہی نہ ہو۔ ان کے چہرے کے تاثرات بڑے غمناک تھے۔غالباً شانیہ کے روپ میں انہیں اپنے بیٹے کی جھلک نظر آرہی تھی۔دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر مرزا عرفان احمد نے اس خاموشی کو توڑا۔

"بیٹی تمہارا نام شانیہ ہے۔"

"جی صاحب جی!" شانیہ نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" مرزا عرفان نے شدلہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"خالہ ہے ہماری صاحب جی!"

"نہیں، میرا مطلب ہے اس کا نام کیا ہے؟"

"بڑوں کا نام نہیں لیتے صاحب جی! پھر بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں، شدلہ ہے اس کا نام۔۔۔" شانیہ نے شرمائی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"اچھا اچھا، بیٹی تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟"

"سب کے نام پوچھ رہے ہیں صاحب جی! یہ بتائیں آپ ہمارے مہمان ہیں، ہم آپ کیلئے کیا لے کر آئیں؟"

"نہیں بیٹا! ابھی کچھ نہیں، بتا دیں گے ہم تمہیں۔"

شدلہ نے کہا۔ ''ستو بنالانا شانیہ، مہمانوں کے لئے۔ ماما آئے ہیں تیرے۔ یہ بڑے لوگ معلوم ہوتے ہیں، پھر بھی ہم کیا کریں، ہم تو ستو ہی پلا سکتے ہیں۔''

''بہن! ہم ستو ضرور پئیں گے، لیکن ابھی تھوڑی دیر رک جاؤ، ہمیں ذرا شانیہ سے کچھ باتیں کر لینے دو اگر تمہاری اجازت ہو تو۔۔۔۔''

''ہاں جی! کیوں نہیں۔ ضرور کرو بات۔'' شدلہ نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! تم نے اپنی ماں کا نام نہیں بتایا۔''

''سورا، سورا تھی میری بہن، مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''شدلہ بہن! آپ ساری باتیں ہمیں شانیہ ہی سے پوچھنے دیں۔''

''کیوں بابو صاحب! مجھے بھی تو بتا دیں۔''

''ہاں کیوں نہیں ابھی بتائیں گے اور جو کچھ ہم بتائیں گے اسے سن کر تم اتنی خوش ہو جاؤ گی کہ ہمیں ہزاروں دعائیں دو گی۔'' مرزا عرفان احمد نے نرم لہجے میں کہا۔

''ہاں بیٹی! تمہاری ماں کا نام سورا تھا اور باپ کا نام؟''

''وہ جی ہمارے ابا کا نام، ابا کا نام۔۔۔۔'' شانیہ کی آواز بھرا گئی۔

پھر اس نے کہا۔ ''ان کا جی افسر غیاث تھا، سب انہیں افسر کہتے تھے۔''

''اور بیٹا! دادا کا نام معلوم ہے؟''

''معلوم ہے جی!''

''کیا نام تھا؟''

''آذر غیاث غوری۔'' شانیہ نے کہا اور عرفان احمد نے پتھرائے ہوئے آذر غیاث کی طرف دیکھا، وہ جیسے سکتے میں تھا۔

''بیٹا! تمہارے ابو کا کیا ہوا؟''

''اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

''تمہیں تمہارے دادا کا نام کس نے بتایا؟''

''ابو نے، ماں نے۔''

''تمہاری ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔''

''ہاں صاحب جی! ابو کی موت کے بعد وہ بڑی بیمار ہو گئی، پھر ٹھیک ہی نہ ہو سکی بیچاری، کہتی تھی کہ اس کا دل ابو کے بغیر نہیں لگتا۔'' شانیہ کی آواز مسلسل بھرائی ہوئی تھی۔

''تمہارے نانا کا کیا نام تھا بیٹا؟''

''راشوا جی۔۔۔۔ راشوا۔۔۔۔'' شانیہ نے بتایا۔

عرفان احمد نے ایک بار پھر آذر غیاث غوری کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

''بیٹا! تمہیں معلوم ہے تمہارا تعلق ایک قبیلے سے تھا؟''

''ہاں جی کیوں نہیں معلوم، گلو دادا ہی تو ہمارے قبیلے کا سردار تھا۔''

مرزا عرفان احمد ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے آذر غیاث کی طرف رخ کر کے کہا۔ ''غوری صاحب! آپ کی پوتی۔۔۔۔''

پھر مرزا عرفان احمد شانیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

''بیٹا! تمہیں اپنے باپ کا چہرہ یاد ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' شانیہ نے کہا اور اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ پھر وہ بار بار آذر غیاث غوری کو دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں ہیجان اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ مرزا عرفان احمد غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔۔۔؟''

''کچھ نہیں، ستو بنا کر لاؤں؟''

''رکو۔۔۔ تم جس چہرے کو بار بار دیکھ رہی ہو، کیا اس میں تمہیں اپنے باپ کی نشانیاں ملتی ہیں؟''

''ہاں۔۔۔ ہاں، مگر۔۔۔ مگر۔۔۔'' شانیہ کی سانسیں بے پناہ تیز ہو گئی تھیں۔

''یہ تمہارے دادا ہیں بیٹا! تمہارے ابو کے والد جو ملک سے باہر چلے گئے تھے۔'' شانیہ کے ہاتھ ہیجانی انداز میں اوپر اٹھے اور پھر نیچے ہو گئے، لیکن آذر غیاث غوری اب اپنے جذبات کو دبا نہیں سکے تھے، وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے شانیہ کو لپٹا لیا۔

''میری بچی! میری جان! میری زندگی! میری بیٹی! میرے بیٹے کی نشانی! میں

تیرا بدنصیب دادا ہوں میں ہی ہوں وہ قاتل جس نے تیری ماں اور تیرے باپ کو اپنے جنون کی نذر کر دیا۔ بیٹا! میں ہی ہوں وہ بدنصیب تیری تلاش میں بھٹک رہا تھا شانیہ! میں تجھے تلاش کر رہا تھا بیٹا! اب تو مجھے مل گئی ہے تجھے میرے ساتھ رہنا ہوگا، میرے پاس رہنا ہوگا میری جان۔ میں اپنے بیٹے اور بہو کو تو نہیں پا سکا لیکن بیٹا! تو اب میرے درد کا درماں بنے گی، چلے گی نا میرے ساتھ، بول چلے گی نا میرے ساتھ۔'' شانیہ نے بھی اپنائیت کے ساتھ آذر غیاث غوری کے سینے میں اپنا سر چھپایا ہوا تھا، وہ آواز سے نہیں رو رہی تھی لیکن اس کے ہلتے ہوئے بدن سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے، آذر غیاث غوری نے اس کا چہرہ سامنے کیا تو اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے، انہوں نے دوبارہ اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا، اسی وقت شدلہ پھٹ پڑی۔

''نہیں جانا ہمیں کہیں بابوجی! ہمارا یہ ٹوٹا پھوٹا گھر ہی ہمارے لئے سب کچھ ہے ہوگے تم افسر بابو کے باپ، ارے ہاں پہلے تو ماردیا دونوں کو، ظلم کیا، ارے کیا ہوتا اگر محبت سے سر پر ہاتھ رکھ دیتے اور جب دونوں مرکھپ گئے ہیں تو آئے ہو احسان کرنے ہم پر۔ نہیں چاہئے ہمیں تمہارا یہ احسان، نہیں چاہئے بابو صاحب! کوئی نہیں جائے گا، نہیں جائے گی یہاں سے شانیہ کہیں، ہم انہی آبادیوں میں پلے بڑھے ہیں۔ انہی میں زندہ رہ سکتے ہیں، ارے ہاں! بہن ماردی ہماری اور اب پوتی کو لینے آئے ہیں، نہیں جانا ہمیں۔''

''ارے ارے شدلہ! شدلہ! کیا کہہ رہی ہو، کیسے روک سکتی ہو تم خون کو خون سے ملنے سے۔'' ہاشا نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ہمارا بھی تو خون ہے، ہماری بھی تو بہن قربان ہوئی ہے، نہیں جائیں گے ہم لوگ، نہیں چھوڑوں گی میں اسے۔ لو۔۔۔ ساری زندگی اسے پالا پوسا اور اب آ گئے لینے''

''نہیں شدلہ بہن! تم بھی میری بیٹی کی طرح ہو، ہم اسے اکیلے تھوڑی لے جائیں گے، تم بھی جاؤ گی ہمارے ساتھ۔''

''ہاں شدلہ! راج کرے گی تیری بھانجی، راج محل میں رہے گی، ایسی باتیں مت کر، یہ بڑے لوگ ہیں، قانون ان کے ساتھ ہوتا ہے، تو قانون سے لڑ سکتی ہے کیا اور پھر تو بھی تو ساتھ جا رہی ہے۔'' جموں نے کہا۔

''عجیب بات ہے بھیا! پہلے تو کوئی قانون نہیں آیا ہمارے پاس، ساری زندگی لٹا دی ہم نے اور اب آ گئے یہ قانون ساتھ لے کر، ارے بھیا! ہمارا بھی تو کوئی حق ہے، ایسا مت کرو بابوجی! ہمیں ہمارے اس جنگل میں رہنے دو، تمہارے شہر میں آ کر ہم مرجائیں گے۔''

''تم نہیں مروگی شدلہ! عیش و آرام سے رہوگی، ضد مت کرو، تم نہیں جانتیں کتنے بڑے آدمی سے مخاطب ہو تم۔۔۔۔''

''ارے ہاں بھیا! بہت بڑے آدمی ہیں یہ، بیٹا ماردیا، بہو ماردی، ایسے ہی ہوتے ہیں بڑے آدمی؟''

''اس بڑھیا کو سمجھاؤ'' عرفان احمد نے ناخوشگواری سے کہا۔

اسی وقت شانیہ بول اٹھی۔ ''میں جاؤں گی خالہ! میں اپنے دادا جی کے ساتھ جاؤں گی، ضد مت کر، جانا ہے ہمیں۔''

شدلہ نے شانیہ کی طرف دیکھا، پھر گردن ہلا کر بولی۔ ''ٹھیک ہے، گھٹنے پیٹ ہی کی طرف مڑتے ہیں۔''

''ستو بنا لاؤں دادا جی؟'' شانیہ نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں بیٹی! ہم تمہارے ہاتھوں سے ستو پئیں گے اور اس کے بعد چلنا ہے تمہیں ہمارے ساتھ۔ شدلہ بہن! تم جو اپنا تھوڑا بہت سامان ساتھ ہے سمیٹ لو، کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ میں مہیا کروں گا تمہیں، پھر بھی اگر کچھ کپڑے وپڑے باندھنا ہوں تو باندھ لو ورنہ اس گھر کو ہم تالا لگائے دیتے ہیں۔''

شدلہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اطہر اور ریاض باہر چلے گئے تو سجاد نے نیاز خان سے کہا۔

''آؤ جموں بھیا ہم بھی باہر چلتے ہیں۔'' دونوں گردن ہلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔

شدلہ، شانیہ کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی تھی۔ مرزا عرفان احمد نے آذر غیاث غوری کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت بڑی بات ہے غوری صاحب! اس طرح ایک گمشدہ بچی کا مل جانا، ویسے آپ کا کیا خیال ہے، آپ کا دل اس بچی کو پوتی کی حیثیت سے قبول کرتا ہے۔"

آذر غیاث غوری نے چونک کر مرزا عرفان احمد کو دیکھا اور بولے۔ "میں سمجھا نہیں۔"

"بھائی ہمیں بڑے بڑے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بڑے بڑے عظیم منصوبے بنائے جاتے ہیں، بہرحال ہوا سب کچھ قاعدے قانون کے مطابق ہے، لیکن پھر بھی ایسے ہی یہ سوال میرے ذہن میں آ گیا۔"

"وہ میرا خون ہے اور کمبخت زمانہ کتنا ہی بدل جائے، سائنس کتنی ہی ترقی کر جائے، خون آواز دیتا ہے، خون پکارتا ہے، خون خون کو پہچان لیتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے ہماری ذمے داری ختم ہوئی۔" مرزا عرفان احمد نے ہنس کر کہا۔

"نہیں مرزا جی! آپ کو تو ہر لمحہ قدم قدم پر میرا ساتھ دینا ہوگا، یہ کیسے کہتے ہیں آپ کہ میری ذمے داری ختم ہوگئی؟"

"یار! تم بہت بڑے آدمی ہو، کہیں یہ مت سمجھ بیٹھنا کہ میں کسی لالچ سے تمہاری دوستی قبول کر رہا ہوں۔"

"آنے والا وقت تمہیں بتا دے گا مرزا عرفان احمد کہ آذر غیاث غوری کیا چیز ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب یہ بھی مت سمجھ لینا کہ اس ساری کاوش کی میں کوئی فیس نہیں لوں گا، بھائی وکیل ہوں اپنے پیشے سے ناانصافی نہیں کروں گا۔"

مرزا عرفان احمد نے کہا۔ اسی وقت شانیہ نقشین کٹوروں میں ستو بنا کر لے آئی۔ آذر غیاث غوری نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ ایک عجیب سا تاثر اس کے چہرے سے چھلکا تھا لیکن صرف ایک لمحے کیلئے۔۔۔

پھر شدلہ بھی شانیہ کے پیچھے باہر آ گئی تھی، اس نے کہا۔ "لو بھیا! ستو پی لو، کٹورے ہمارے پاس تین ہی ہیں، تم پی لو گے تو انہیں لا کر دوں گی وہ گئے کہاں ہیں؟"

"باہر ہیں آ جاتے ہیں ابھی۔۔۔" آذر غیاث غوری نے ستو کا کٹورا

اٹھا لیا، لیکن مرزا عرفان احمد کہنے لگے مجھے ذرا پرہیز ہے، وقت سے کھاتا پیتا ہوں۔ تم اور ستو بنا لاؤ تو ان لوگوں کو بھی دے دیا جائے۔"

شدلہ نے گردن ہلا دی تھی۔ باہر سجاد نیاز خان سے کہہ رہا تھا۔

"نیاز خان، قیامت ہوگئی ہے قیامت۔۔۔"

"کیا ہوا؟" نیاز خان نے چونک کر پوچھا۔

"ارے بھائی! اس لڑکی کی ایکٹنگ دیکھ رہے ہو، یہ بات تو ظاہر ہے کہ یہ نقلی لڑکی ہے اور اسٹیج کی بھی نہیں ہے۔ چلو شدلہ تو پرانی گھاگ اداکارہ ہے۔ ہم دونوں بھی اللہ کے فضل سے بہت عرصے سے اسٹیج پر کام کر رہے ہیں مگر اس لڑکی کی ایکٹنگ دیکھ رہے ہو جو شانیہ بنی ہوئی ہے، یار! کیا ایکٹنگ کر رہی ہے۔ قسم ایمان کی اگر یہ اسٹیج پر آ جائے تو اسٹیج کوئین بن جائے۔ کیا زبردست اداکاری کی ہے اس نے پوتی ہونے کی۔ کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی ہے اور وہ نہیں ہے جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے۔"

"نادر علی بڑی اونچی چیز ہے بھائی! کہیں سے چھانٹ کر ہی لایا ہے اسے بھی۔ ہم تینوں سے تو وہ کام لے ہی رہا ہے مگر لڑکی، تم ٹھیک کہتے ہو، آفت ہے آفت۔"

"یار! کمال ہے، ویسے نادر علی ہماری مٹھی میں آ گیا ہے، جو کھیل اس نے کھیلا ہے اس کے ذریعے ہم اس سے اچھی خاصی رقم بٹور سکتے ہیں۔"

"نادر علی کو اچھی طرح نہیں جانتے تم شاید؟" نیاز خان نے کہا۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے، ایسے پیٹ کھولے گا کہ انتڑیاں باہر نکلیں گی تو پتہ چلے گا کہ پیٹ میں چاقو لگے ہیں۔"

اسی وقت شدلہ باہر آئی تھی۔ وہ بولی۔ "آ جاؤ بھیا! ستو تیار ہوگئے ہیں۔"

"چلو یار! ستو پئیں، نیت خرابی کی باتیں مت کرو۔" نیاز خان نے سجاد کو سمجھایا۔ دونوں اندر آ گئے۔ یہ تھوڑی بہت خاطر مدارت ہوئی، ایک زبردست ڈرامہ اسٹیج ہو رہا تھا جس کی مثال ڈراموں کی تاریخ میں شاید پہلے کبھی نہیں ملتی۔ تھوڑی دیر کے بعد لینڈ

کروز رشہر کی جانب واپس جا رہی تھی۔ مرزا عرفان احمد نے پچھلی سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ اطہر کر رہا تھا۔ برابر کی سیٹ پر آذر غیاث غوری پوتی کو کاندھے سے لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ شانیہ کا سر اس کے شانے سے ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ان بند آنکھوں میں نجانے کون سی کہانیاں جنم لے رہی تھیں کون جانے۔۔۔۔؟

☆......☆......☆

سید علی دفتر سے گھر واپس لوٹا تو اس کی بیوی نے دروازہ کھولا تھا۔ سید علی نے ایک نگاہ بیوی کے افسردہ چہرے پر ڈالی پھر اندر داخل ہو گیا۔ گھر کی فضا اب مستقل سوگوار تھی، دونوں میاں بیوی مسکرانا بھول گئے تھے۔ سید علی بہت سی باتیں سوچ کر آیا تھا کہ بیوی کو کس طرح سمجھائے گا لیکن بیوی کے چہرے کو دیکھ کر اس کا بھی دل بھر آیا۔۔۔ اندر آ کر اس نے کہا۔

''یہ سب ٹھیک ہے بھاگوان۔۔۔!''

''کیا۔۔۔؟''

''اپنا چہرہ دیکھ رہی ہو۔۔۔''

''کیا رکھا ہے اس نحوست بھرے چہرے میں جو اسے دیکھوں۔'' بیوی نے جواب دیا۔

''کوئی دیکھے تو کیا کہے گا۔۔۔!''

''سب نے دیکھ لیا ہے اور جسے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا ہے۔''

''میری بات سنو، کیا تم مجھے مجرم کہنا چاہتی ہو۔''

''نہیں۔''

''آخر ایک دن اسے گھر سے جانا تھا۔''

''کہاں۔۔۔؟'' بیوی نے طنز بھرے لہجے میں کہا اور سید علی کی آنکھیں جھک گئیں۔ بڑا گہرا طنز تھا اس ''کہاں'' میں۔ بیوی خاموش نہ ہوئی، اس نے بدستور سوال دہرایا۔

''بتایا نہیں آپ نے۔ کہاں جانا تھا اسے۔''

''اپنے گھر۔۔۔ سسرال۔۔۔؟''

''وہ سسرال گئی ہے؟''

''وہاں بھی چلی جائے گی اور بڑی شان سے جائے گی۔''

''آپ بھیجیں گے اسے۔ آپ جا کر زور دیں گے آذر غیاث غوری پر کہ اب اس کی شادی کر دو۔ بتایئے سید علی آپ جا کر کہیں گے۔ اب تو وہی اس کی تقدیر کا مالک ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ سمجھا کرو۔''

''سمجھ کر ہی تو بول رہی ہوں۔ ایسا عجیب کھیل کسی باپ نے اپنی بیٹی کے ساتھ نہ کھیلا ہوگا۔ کیسا بے مقصد جرم کیا ہے آپ نے سید علی۔۔۔۔''

''یہ سب بے مقصد نہیں ہے میں اسے شہزادیوں جیسی زندگی دینا چاہتا ہوں بہت جدوجہد کی میں نے، کچھ نہیں کر سکا بس اس کے بعد جو کچھ کر سکتا تھا کر ڈالا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری بیٹی کو شہزادیوں جیسی زندگی مل گئی ہے تم کیا سمجھتی ہو آذر ہمیشہ اسے اپنے گھر میں بٹھائے رکھے گا ارے بادشاہوں نے بھی اپنی بیٹیاں رخصت کی ہیں بیٹیاں تو گھر میں رہنے کی چیز ہی نہیں ہوتیں۔ اگر وہ اس گھر سے رخصت ہوتی تو زیادہ سے زیادہ کسی دفتر کی کلرکی کرنے والے شخص سے اس کی شادی ہوتی کوئی معمولی سا آدمی ہی ہو سکتا تھا جو اسے قبول کرتا لیکن اب وہ جس گھر میں جائے گی ایک ارب پتی باپ کی بیٹی کی حیثیت سے جائے گی۔ تم میرے جذبات کو نہیں سمجھ رہی میں جو کر سکتا تھا کر ڈالا ہے۔''

''اس کی خوشی کے بغیر، اسے مجبور کر کے، اس کے ساتھ زبردستی کر کے، اس سے ماں کا میکہ چھین کر، آذر غیاث غوری اسے سب کچھ دے دے، اس کا میکہ تو نہیں دے سکتا آپ بتایئے سید علی۔۔۔۔؟''

''دیکھو بابا! میں نے جو کچھ کیا ہے خلوص نیت سے کیا ہے، میں بس جنون کا شکار تھا ارے میرے جذبے کو تو دیکھو میں باپ ہونے کی حیثیت سے اپنی بیٹی کو بہت اچھی زندگی دینا چاہتا تھا۔ اپنی جدوجہد میں ناکام ہو کر میں نے یہ فیصلہ کر ڈالا۔ فیصلہ بے شک مجرمانہ تھا، لیکن میرے جذبے مجرم نہیں تھے۔ دیکھو میری مدد کرو، مجھے حوصلہ دو، اگر اتنی

ضد کرنی تھی تو اس وقت کرتیں جب میں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔اب سب کچھ ہو چکا ہے،اپنے آپ کو سنبھالنا ہے۔اپنے اردگرد کے ماحول کو سنبھالنا ہے،اسی میں اس کا تحفظ ہے،میری مدد کرو براہ کرم میری مدد کرو۔'' سید علی کی آواز بھرا گئی۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی،سید علی نے ایک نگاہ بیوی پر ڈالی اور پھر خود اٹھ کر دروازہ کھولا تو نادر علی سر جھکائے مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔سید علی نے دروازہ بند کر دیا تھا۔نادر علی نے دونوں میاں بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھابی یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ایک بہت بڑا کام کیا ہے ہم نے۔ہم سب کی جدوجہد نے ہماری تقدیر کے راستے کھول دیئے ہیں۔آپ کی بیٹی اب بادشاہ زادی ہے۔ دولت ہی اس دور کی شہنشاہ ہے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ انسان سڑکوں پر گھسٹ رہا ہے،مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے،غربت بڑھتی جا رہی ہے،ایسے میں اگر اتنا بڑا کام ہو جائے تو معمولی بات نہیں ہے۔اچھی سی چائے بنوالیجئے بھائی جان! آپ کے چہرے پر بھی افسردگی نظر آ رہی ہے۔بابا یہی تو چاہتے تھے آپ لوگ۔میں نے کتنی محنت کی ہے اور کتنے جتن کئے ہیں اور آپ کو پتہ نہیں ہے،وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے؟''

''کون لوگ؟''

''اسٹیج کے اداکار ہیں،سجاد اور نیاز علی،برسوں سے اداکاری کر رہے ہیں، دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ گئے ہیں،کہہ رہے تھے کہ یہ لڑکی اداکاری میں بڑے بڑوں کو مات دے سکتی ہے۔کیا شاندار اداکاری کر رہی ہے۔اس سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ اب اس نے اس ماحول کو قبول کر لیا ہے اور بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے اور سمجھ میں آنی بھی چاہئے تھی۔بس اب تو سمجھ لیجئے وارے نیارے ہو جائیں گے ہم سب کے بھائی جان۔بڑی آرزو ہے ایک بار،بس صرف ایک بار امریکہ پہنچ جاؤں،آپ لوگ بجائے اس کے کہ اس طرح دکھی ہوتے رہیں میرا خیال ہے ہنسی خوشی سارے کام کیجئے گا، پڑوسیوں کو آپ نے یہی بتایا ہے نا کہ وہ کینیڈا چلی گئی ہے؟''

''ہاں،لیکن لوگ بیوقوف نہیں ہیں۔سب سے ہی سلام دعا رہی ہے ہماری۔کبھی اس سے پہلے کینیڈا کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔اچانک ہی ہم جب لوگوں کو یہ کہتے ہیں کہ وہ

اپنے ماموں کے پاس کینیڈا چلی گئی ہے تو لوگوں کو یقین نہیں آتا۔''

''لوگوں پر لعنت بھیجیں جی! اپنا کام جاری رکھتے ہیں۔ایسا کریں کہ تھوڑے دن خاموشی اختیار کرتے ہیں۔اس کے بعد سمجھائیں گے کہ کام شروع کر دے۔دیکھیں مقصد تو یہی ہے نا ہمارا،ہاتھ صاف کرنا،پتہ چلانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا کہ تجوری کس طرف ہے اور مال کس طرف ہے۔''

''کیا بات کر رہے ہو تم نادر علی!''

''کون سا کام؟''

''میرا مطلب یہ ہے اسے اس بات پر آمادہ کرنا۔''

''ہاں کیوں نہیں،میں اس سے یہی کہوں گا کہ پیاری بیٹی چچا کی آرزو پوری کر دے،اتنی دعائیں ملیں گی تجھے کہ۔۔۔کہ۔۔۔'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

تھوڑی دیر کیلئے فضا میں خاموشی رچی رہی پھر وہ بولا۔''بس جلدی سے یہ کام ہو جائے۔''

''ویسے اتنی جلد بازی بھی اچھی نہیں ہوگی۔تھوڑے سے پاؤں جم جائیں اس کے وہاں اس کے بعد ہی۔'' پہلی بار سید علی کی بیوی نے اس گفتگو میں مداخلت کی اور نادر علی چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

''بھابی! بھابی کا کردار مت ادا کرو،بڑی محنت کی ہے میں نے اس کام پر۔نجانے کہاں کہاں سے لوگوں کو تیار کیا ہے۔ہر پہلو پر غور کیا ہے۔خرچہ بھی کیا ہے اچھی طرح۔بڑے معاوضے دیئے ہیں ان لوگوں کو جنہوں نے اپنا اپنا کام کر کے اس چالاک بزنس مین کو یہ یقین دلایا ہے کہ رومانہ اسی کی بیٹی ہے۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے،سولی پر چڑھا دوں اپنی بچی کو،ارے واہ،دونوں بھائیوں نے مل کر مجھ سے میری اولاد چھین لی اور اب میرے بولنے کا حق بھی چھین رہے ہیں،جلد بازی میں اگر پول کھل گیا تو کیا ہوگا؟''

''اب میں اتنی جلد بازی کی بھی نہیں کہہ رہا بھابی!''

نادر علی کو ایک دم احساس ہو گیا کہ اس نے بھابھی کیلئے بڑے غلط الفاظ استعمال

کئے ہیں۔ بہر حال دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر نادر علی بولا۔

”اب ناراض نہ ہوں چائے تو پلا دیں کم از کم۔“

”ہاں بس، جو ہونا تھا ہو گیا، کھو بیٹھے اپنی بیٹی کو ہم، کون جانے زندگی میں کبھی اب دوبارہ ہم مل بھی سکیں گے یا نہیں۔“

چائے پینے کے بعد نادر علی تو چلا گیا لیکن سید علی کی بیوی ایک کونے میں سر جھکائے رونے لگی۔ سید علی خود بھی دلگیر تھا۔ بیوی کے پاس پہنچ کر بولا۔

”دیکھو حوصلے پست مت کرو۔ اب تو سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اب اگر حوصلہ بھی کھو دیا تو سمجھ لو ہماری زندگی جیل میں ہی گزرے گی۔“ بیوی نے روتی ہوئی آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی۔

”زندگی۔۔۔ ہا۔۔۔ تنہا زندگی۔۔۔“

”اچھا ایک کام کرو تیار ہو جاؤ، میں تمہیں وہ کوٹھی دکھا کر لاتا ہوں جہاں اب رومانہ رہتی ہے، چلو اٹھو تیار ہو جاؤ۔“

”ابھی تیار ہو جاتی ہوں۔“

رکشہ اس کوٹھی سے کافی فاصلے پر رکوا کر اس نے رکشہ والے کو پیسے دیئے اور پھر بیوی کو ساتھ لے کر چھپتا چھپاتا چل پڑا۔ عالیشان علاقہ تھا۔ ہر کوٹھی کے آگے چھوٹے چھوٹے باغیچے تھے۔ دونوں دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ سید علی نے سامنے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”دیکھو۔۔۔ یہ ہے وہ محل جہاں اب تمہاری شہزادی کا راج ہے۔“ سید علی کی بیوی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس شاندار محرابی دروازے کو دیکھا جس کا گیٹ ہی اتنا خوبصورت تھا کہ بس اسے ہی دیکھتے رہو۔ وہ انتظار کرتے رہے کہ شاید گیٹ کھل جائے، بہت زیادہ دیر تک یہاں کھڑے بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر کوٹھی کے گیٹ پر گن مین موجود تھے۔ کہیں ایک، کہیں دو۔ ان کو اس طرح کھڑے دیکھ کر کوئی بھی چوکنا ہو سکتا تھا۔ سید علی نے موقعے کی صورت حال کو سمجھا اور بولے۔

”پھر [illegible] گے، اب تو تم نے جگہ دیکھ لی ہے چلو چلیں۔“ اور اس کے بعد

دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

سرمد واپس آ گیا تھا۔ کالج پہنچا لیکن دوست احباب سے یہ خبر سن کر دنگ رہ گیا کہ رومانہ تو اسی وقت سے کالج نہیں آ رہی جب سے وہ یہاں سے گیا ہے۔ رومانہ ایک ہوش مند لڑکی تھی، کوئی ایسی جذباتی بات اس نے کبھی نہیں کی جس میں کوئی احمقانہ پہلو جھلکتا ہو، اگر اس نے اس لئے کالج چھوڑ رکھا ہے کہ وہ وہاں موجود نہیں ہے تو یہ بڑی بے وقوفی کی بات ہے، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ تین چار دن تک انتظار کرتا رہا اور اس کے بعد بے اختیار سا ہو گیا۔ رومانہ کا گھر اسے معلوم تھا۔ ایک بار رومانہ نے اسے اپنی حیثیت بتاتے ہوئے کہا تھا کہ سرمد اگر ہم نے کبھی زندگی بھر کا ساتھی بننے کا فیصلہ کیا تو یہ ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جان لیں۔ تم مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکے ہو، یہ بھی کہ تم ٹیوشنیں کر کے اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہو، جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے تو میں چاہتی ہوں کہ ایک بار میرا گھر بھی دیکھ لو، بوسیدگی اور عسرت بھری زندگی کا آئینہ دار ہے، گھر کے افراد کے بارے میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں چنانچہ اگر ہم نے کبھی زندگی بھر کا ساتھی بننے کا فیصلہ کیا تو مجھے تو تمہاری حیثیت قبول ہے، تم مجھے میری حیثیت کے بارے میں بتا دو۔“

”جانتی نہیں ہو میرا نام سرمد ہے اور اس نام میں میرے ہر احساس کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔“ سرمد نے کہا۔

”پھر بھی ایک نگاہ میرے گھر پر ڈال لو، تمہیں گھر کے اندر نہیں لے جاؤں گی چائے نہیں پلاؤں گی، کیونکہ میرے والدین اتنے کشادہ ذہن کے مالک نہیں ہیں، بس دور سے دیکھ لینا۔“

سرمد نے بہت منع کیا تھا لیکن نجانے کیوں رومانہ کو بھی ضد سی ہو گئی تھی، مگر یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ اب کیا کروں؟ کم از کم جا کر رومانہ کی خیریت تو معلوم کی جائے۔ یہاں کالج میں کسی نے ایسا نہیں کیا تھا، حالانکہ رومانہ کی دوست لڑکیاں بھی تھیں مگر بات وہی ہے کہ سب اپنی اپنی فکر میں سرگرداں ہیں۔ سرمد کو اگر جھجک تھی تو صرف یہ کہ وہاں جا کر کیا کہے گا بہر حال ہمت کئے بغیر چارہ کار نہیں تھا۔ اب اس سے زیادہ برداشت نہیں کیا جا سکتا

تھا، چنانچہ اس نے فیصلہ کرلیا کہ آج چھٹی کے بعد وہ سیدھا رومانہ کے گھر جائے گا۔ کون سی ایسی مصیبت آ جائے گی آخر اس کا کلاس فیلو ہوں، خیریت معلوم کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بیمار ہو۔ اگر وہ بیمار ہے یا اس کے گھر کوئی بیمار ہے اور اس کی وجہ سے وہ نہیں آ پا رہی تو کم از کم مجھے تو اس سے واقف ہونا چاہئے۔ وہ تیار ہوگیا۔ اس دن چھٹی کے بعد جب وہ گھر سے نکلا اور فٹ پاتھ پر چلتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا تو راستے میں اسے سب سے پہلی شخصیت جو نظر آئی وہ طوطے والے بابا کی تھی۔ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ ذرا فال تو کھلوایا جائے اور وہ طوطے والے بابا کے پاس جا کر رک گیا۔ بابا نے اسے گردن اٹھا کر دیکھا اور پھر طوطے کو پنجرے سے نکالنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس رکنے کا مطلب یہی تھا کہ گاہک فال نکلوانا چاہتا ہے۔ طوطا لفافوں پر چونچیں مارتا رہا۔ پھر اس نے ایک لفافہ کھینچ لیا اور بابا نے اسے اٹھا کر سرمد کے ہاتھ میں دے دیا۔ سرمد نے لفافہ کھول کر دھڑکتے دل سے پرچہ نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔

''زندگی کا ایک مقصد بنا لیجئے، پھر اپنی ساری طاقت اس کے حصول پر لگا دیجئے، آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔''

یہ بڑے عجیب الفاظ تھے، اسے یوں لگا جیسے یہ اسی کیلئے کہے گئے ہیں۔ بہرحال وہ طوطے والے بابا کو پیسے دے کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ یہ الفاظ اس کے لئے روشنی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بس میں بیٹھ کر چل پڑا تھا اور اس کے بعد وہ وہاں اتر گیا جہاں سے تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے رومانہ کے گھر کے دروازے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ دل و دماغ میں شدید کشمکش تھی۔ پہلی بار وہ رومانہ کے دروازے پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کے اہل خاندان کیلئے وہ بالکل اجنبی تھا۔ جبکہ جانتا تھا کہ اس گھر میں تین افراد ہیں۔ نادر علی بہت کم ہوتا ہے اس وقت سید علی صاحب مل سکتے ہیں اور اگر وہ نہ ملے تو کم از کم رومانہ کی والدہ تو موجود ہوں گی۔ دھڑکتے دل اور خشک ہونٹوں کے ساتھ اس نے دروازہ بجایا اور کچھ لمحوں کے بعد ایک سخت سی شکل والے شخص نے دروازہ کھول دیا اور سرمد کو بغور دیکھنے لگا، پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''جی فرمایئے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''میں دراصل رومانہ کا کلاس فیلو ہوں۔ رومانہ بہت عرصے سے کالج نہیں پہنچی۔ میں یہ سوچ کر ادھر آ گیا ہوں کہ کہیں وہ بیمار نہ ہو۔''

''جی وہ بیمار نہیں ہیں بلکہ کینیڈا چلی گئی ہیں۔''

''جی۔۔۔'' سرمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''جی ہاں۔۔۔ کینیڈا میں اس کے ماموں ہیں، وہ یہاں آئے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ رومانہ کو اپنے ساتھ کینیڈا لے جائیں، وہاں وہ اسے تعلیم بھی دلائیں گے اور اس کی شادی بھی وہیں کریں گے، بہرحال آپ کا شکریہ کہ آپ اس کی خیریت پوچھنے یہاں آئے۔''

''آپ کون ہیں؟''

''نادر علی ہے میرا نام رومانہ کا چچا۔۔۔ اور کوئی حکم میرے لئے؟''

''نہیں وہ دراصل میں ان کے والد سے ملنا چاہتا تھا۔''

''وہ موجود نہیں ہیں اور کوئی حکم؟'' نادر علی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''جی نہیں شش۔۔۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ، مگر مجھے رومانہ کا ایڈریس مل سکتا ہے؟''

''نہیں۔'' نادر علی نے کہا اور آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا، سرمد وہیں کھڑا چکرا رہا تھا۔ پھر ایک لمحے تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ دروازہ کھلا اور نادر علی کی صورت نظر آئی۔

''اور کوئی حکم میرے لئے؟'' ''نن۔۔۔ نہیں سر۔۔۔ شش۔۔۔ شکریہ۔'' سرمد نے کہا اور لڑکھڑاتے قدموں سے وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔

☆......☆......☆

رومانہ، آذر غیاث غوری کے شاندار محل نما بنگلے میں پہنچ چکی تھی۔ ایسے بنگلے اس نے چلتے پھرتے دیکھے تھے یا پھر کبھی فلموں میں یہ زندگی دکھائی جاتی تھی۔ اس وقت آپس میں باتیں کرتے ہوئے رومانہ کی دوست یہی کہا کرتی تھیں کہ یہ صرف فلمی کہانیاں ہوتی ہیں عام زندگی میں اتنے پرتعیشات مشکل ہیں، لیکن اب یہاں آنے کے بعد رومانہ کو احساس ہو رہا تھا کہ قدرت نے انسان کیلئے بہت کچھ کیا ہے۔ بس تقدیر کے معاملات ہیں

اور تقدیر کس طرح متحرک ہوتی ہے۔ یہ انسان نہیں جانتا۔ یہ کھیل قدرت نے اپنے پاس ہی رکھا ہے۔ عالیشان رہائش، سرسبز و شاداب لان، خود رومانہ کا بیڈ روم اتنا بڑا تھا کہ اس کا پورا گھر اس میں سما جائے اور پھر اس کی آرائش، رومانہ تو ان چیزوں کا استعمال بھی نہیں جانتی تھی۔ خود شدلہ کا کردار ادا کرنے والی نبیلہ بھی انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔

''اللہ، زندگی ایسی بھی ہوتی ہے۔'' رومانہ ایک دیہاتن اور الہڑ لڑکی کی حیثیت سے یہاں آئی تھی۔ اسے اپنا کردار عمدگی سے سرانجام دینا تھا۔ پڑھی لکھی تھی لیکن خود کو جاہل ظاہر کرنا تھا، حلیہ بے حد خراب تھا۔ میک اپ مین نے ہاتھ پاؤں بھی ایسے گندے کر دیئے تھے کہ خود رومانہ کو بھی اپنے آپ سے گھن آنے لگی تھی۔ ادھر اسٹیج کی اداکارہ نبیلہ جو رومانہ کی بوڑھی خالہ کا کردار ادا کر رہی تھی، خود بھی کم از کم اس گندگی کی عادی نہیں تھی۔ آذر غیاث غوری نے دوسرے ہی دن ایک گورنس بلا ڈالی اور اسے ہدایت کی کہ رومانہ کو سجایا سنوارا جائے۔ ضروریات کی تمام چیزیں گورنس ہی کی ہدایت پر خریدی گئیں۔ آذر غیاث غوری نے اسے زبردست رقم دے کر باہر بھیج دیا اور وہ ڈرائیور کے ساتھ شاپنگ کر کے آئی۔ صرف رومانہ ہی کیلئے نہیں بلکہ شدلہ کیلئے بھی بہترین لباس اور ضروریات زندگی کی چیزیں منگوائی گئیں۔ رومانہ کے ساتھ شدلہ کا بھی حلیہ بدلوانا تھا۔ نہانے کے بعد جب ایک خوبصورت لباس پہن کر رومانہ آذر غیاث غوری کے سامنے آئی تو وہ بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ رومانہ کو یہ شخص بہت اچھا لگا تھا، انتہائی نرم فطرت، نرم لہجے والا، البتہ رومانہ کو اس کی آنکھیں بڑی سنگین محسوس ہوتی تھیں۔ یہ آنکھیں جیسے رومانہ کے دماغ کے راستے اس کے سارے وجود میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ رومانہ ان آنکھوں میں دیکھ نہیں پاتی تھی۔ آذر غیاث غوری کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ہمیشہ رچی رہتی تھی۔ گورنس اسے ہر طرح کے آداب سکھا رہی تھی۔ میز پر کھانے کا طریقہ، اٹھنے بیٹھنے کا انداز اور رومانہ اس کی باتوں کو جس طرح سمجھتی جا رہی تھی گورنس اس پر خود حیران رہ جاتی تھی۔ رومانہ کو یہ سب کچھ آتا تھا، لیکن جب اسے یہ احساس ہوتا کہ اسے اداکاری کرنی ہے تو وہ خود کو ایک جاہل لڑکی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہی کیفیت شدلہ کی بھی تھی۔ شدلہ بہت زیادہ متاثر نظر آتی تھی۔ تنہائی میں اس نے رومانہ سے کہا۔

''بعض اوقات انسان عجیب کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے، میں معاوضہ لے کر تمہاری خالہ کا کردار ادا کر رہی تھی، لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ ساری زندگی اس جگہ رہ پڑوں۔ میرا کون ہے نہ آگے نہ پیچھے۔ اگر یہ زندگی مجھے ہمیشہ کیلئے حاصل ہو جائے تو یوں سمجھ لو کہ زندگی کا یہ آخری دور حیرت کا دور گزرے گا۔''

''ہاں خالہ! واقعی انسان کیسی متضاد کیفیت کا شکار ہے۔ ایک طرف سڑکوں پر بھیک مانگتی ہوئی عورتیں جن کی گود میں ننگ دھڑنگ بچے، کالے پیلے، ایسے جیسے زندگی کے پاس ان کیلئے کوئی جگہ نہ ہو اور ایک طرف یہ سرسبز و شاداب لان جو قالین کی طرح بچھا ہوا ہے اور ان پر لہلہاتے ہوئے پھول اور ان کے درمیان رکھی ہوئی حسین کرسیاں۔ خالہ سچ مچ زندگی کا ایک عجیب دور ہے یہ۔۔۔۔''

''بیٹا! مجھے ایک بات بتاؤ۔ یہ بات تو طے ہے کہ ہم لوگ یہ مصنوعی کردار ادا کر رہے ہیں۔ بظاہر یہ لگتا ہے جیسے آذر غیاث غوری نے تمہیں اپنی پوتی اور مجھے تمہاری خالہ کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ ایسے حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگ باقی زندگی یہیں گزار دیں۔ تمہارے ماں باپ بھی تو یہی چاہتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے تمہیں خود سے الگ کیا ہے اگر تم ان کی مدد کرنا چاہو گی تو میرا خیال ہے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد تم یہ کر سکتی ہو۔ غوری صاحب جس طرح تم پر جان نچھاور کر رہے ہیں اور جس طرح انہوں نے تمہیں اپنا خون تسلیم کر لیا ہے اس کے بعد اب اس بات کے امکانات نہیں ہیں کہ وہ مزید چھان بین کریں گے۔ بولو! کیا تم یہاں باقی زندگی گزارنا پسند کرو گی؟ بیٹا! اگر تم ایسا کرو تو مجھے اپنے ساتھ ہی رکھنا۔ ہر حقیقت دل میں رکھ کر مر جاؤں گی، کبھی منہ سے نہیں کہوں گی کہ اصلیت کیا ہے۔''

رومانہ نے دکھ بھری نگاہوں سے شدلہ کو دیکھا اور پھر بولی۔

''خالہ! میں نے کبھی کسی یتیم بچے کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا لیکن میرا خیال ہے کہ جب وہ کسی ماں کی آغوش میں کسی ننھے سے بچے کو دیکھتے ہوں گے تو ان کے دل میں ہوک ضرور اٹھتی ہوگی کہ کاش کوئی ایسی آغوش انہیں بھی مل جائے۔ خالہ! ضرورتیں انسان کی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہیں لیکن کیا کیا جائے ہم دنیا کی کوئی بھی شے

پالیس ہمارا رخ ایک ہی طرف ہوتا ہے۔ساری باتوں سے ہٹ کر۔خالہ! محبت ہی اصل منزل ہوتی ہے۔اس دنیا میں جس طرح مختلف فطرتوں، مختلف شکلوں اور مختلف طبیعتوں کے مالک لوگ ہوتے ہیں۔اسی طرح ان کے دلوں میں محبت بھی ہوتی ہے۔اب میرے ماں باپ کو دیکھو، انہوں نے مجھے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں بھیجا ہے، اس لئے کہ میرا مستقبل ایسے بوسیدہ مکانوں میں نہ رہے، جس میں انہوں نے زندگی گزاری ہے انہوں نے اپنی محبت کے ہاتھوں اپنی محبت کو قتل کر دیا۔ہے نا۔۔۔۔عجیب بات۔خالہ! محبت ہی زندگی، محبت ہی موت۔وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔چلو ٹھیک ہے میں ان کی ضرورتیں پوری کر دیتی ہوں مگر مجھ سے محبتوں کا جو سنہری دور چھنا اسے تم کیا کہتی ہو؟ سرمد۔۔۔۔جس کے بارے میں سوچا تھا میں نے کہ اگر وقت اور حالات نے ساتھ دیا تو میں اسے زندگی بھر کا ساتھی بنالوں گی۔خالہ! کسی بھی ٹوٹے پھوٹے گھر کی چار دیواری کے اندر لکڑی کے تخت پر بیٹھ کر محبت سے جو وقت گزارا جاتا ہے خدا کی قسم خالہ! ان خوبصورت دیواروں میں وہ خوشی کہیں سے نہیں چھلکتی۔ٹھیک ہے ماں باپ فیصلہ کرتے ہیں، میرے ابو امی نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ بیٹا یہ گھر تو چھوڑ کر جانا ہی ہے تمہیں۔خالہ! کاش۔۔۔۔وہ گھر جہاں مجھے جانا تھا سرمد کا ٹوٹا پھوٹا گھر ہوتا۔"

"تو بیٹا! کیا کرو گی آگے چل کر؟"

"کچھ نہیں خالہ! محبت کے ساتھ ساتھ ہی اپنا ایک مان ایک وقار بھی ہوتا ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھے یہاں دھکیل دیا اور خود مطمئن ہو گئے، تو پھر آپ بتائیں میں کیا سوچوں ان کے بارے میں۔دل کے کھلے ہوئے دریچے آہستہ آہستہ بند کر رہی ہوں ایک دم سارے راستے بند کر دوں تو گھٹن ہو جائے گی۔اچھا نہیں کیا خالہ انہوں نے۔میں مطمئن نہیں ہوں اور نہ ہی ان سے متفق ہوں لیکن مقروض ہوں میں ان کی کہ انہوں نے مجھے مضبوط ہاتھ پاؤں اور اس گہری سوچ تک کے سفر میں سہارا دیا۔میں ان کی ملکیت ہوں جو وہ چاہتے ہیں وہ کیا ہے میں نے۔لیکن خالہ! سچے دل سے نہیں یہ سب کچھ جو میرے اردگرد آ گیا ہے، میں اسے اپنی منزل نہیں سمجھتی لیکن کچھ مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو راستے میں مرجاتے ہیں۔میری موت بھی خالہ! اس راستے میں ہو گی جس کی منزل ملیامیٹ ہو چکی

ہے۔"

شدلہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ہوئے بیٹھی تھی۔مفہوم ضرور سمجھ رہی تھی لیکن تمام الفاظ اس کی سوچ سے باہر تھے۔ادھر آذر غیاث غوری تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ رومانہ یا اپنی شانیہ کو کلیجے سے لگائے رکھے۔دنیا کی ہر خوشی اسے دے دے۔سارا پیار اسے بخش دے۔بہت وقت گزارتا تھا وہ اس کے ساتھ۔خاص طور سے شام کے بعد تو وہ اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا جب تک تمام معمولات سے فراغت حاصل کر کے سونے کا وقت نہ آ جائے۔اس وقت بھی وہ لان میں بیٹھا محبت بھری نگاہوں سے شانیہ کو دیکھ رہا تھا۔پھر اس کی پیار بھری آواز ابھری۔

"شانیہ بیٹے! کوئی ایسی خواہش جو تمہارے دل میں ابھرتی ہو اگر تم ملک سے باہر کی سیر کرنا چاہتی ہو تو تم جہاں چاہتی ہو میں تمہیں لے جا سکتا ہوں۔" رومانہ نے بھولی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں تو کسی جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی دادا جان! میں نے صرف اپنا گاؤں دیکھا ہے، میں نے تو صرف کھیتوں سے پرے پیلی سرسوں کے اوپر سورج کو دیکھا ہے۔دادا جان کیا باہر ایسا ہی سورج ہوتا ہے؟"

آذر غیاث غوری کے ہونٹوں پر محبت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں سورج تو ایک ہی ہے۔"

"پھر یہ اتنی دور تک کیسے نظر آتا ہے، ہمیں تو دور کی چیزیں نظر بھی نہیں آتیں دادا جان۔۔۔!"

"بس بیٹا! اللہ کی قدرت ہے، اچھا تم گھومنے پھرنے بھی نکلا کرو۔میں ڈرائیور کو ہدایت کر دوں گا کہ شام کو تمہیں ایک دو گھنٹے سیر کرایا کرے۔"

"جی دادا جان! خالہ کو بھی ساتھ لے جایا کروں؟"

"ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔کیوں نہیں ضرور لے جایا کرو۔" آذر غیاث غوری نے کہا۔

وہ گھر میں خاصی خوشیاں مناتا رہتا تھا۔عرفان احمد بھی کئی بار یہاں آ چکے تھے،

آذر غیاث غوری کو مطمئن دیکھ کر وہ خود بھی مطمئن تھے۔

"چلو یار! قدرت نے تمہاری منزل تمہیں دے دی۔"

"ہاں! جو کھو چکا ہوں وہ تو نہیں پا سکا، بس اب تو صرف کفارہ ادا کر رہا ہوں۔"

"کیسی ہے تمہاری پوتی؟"

"موم بالکل موم، جو کچھ بتا دو اس میں ڈھل جانے والی معصوم سی بچی ہے، اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟"

"تو پھر اسے باہر لے جاؤ، سیر و سیاحت کراؤ۔"

"ابھی نہیں۔۔۔ ذرا انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے اس سے، تھوڑی سی بھٹکی بھٹکی سی ہے۔"

"ہو جائے گی ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔"

اور واقعی رومانہ کو آہستہ آہستہ قرار آتا جا رہا تھا۔ اس کی سوچیں بے پناہ تھیں۔ ماں باپ سے سخت شکایت تھی اسے۔ اکثر رات کی تنہائیوں میں وہ خود سے باتیں کرتی تھی۔ کہتی تھی میں نے تم سے کب کچھ مانگا میرے تخلیق کارو۔۔۔ میں نے ہنسی خوشی زندگی کا سفر یہاں تک طے کیا، دل میں امنگیں جاگیں تو میں نے کبھی ان کی پذیرائی نہیں کی بلکہ انہیں تھپک تھپک کر سلا دیا، یہ سوچ کر کہ سارے فیصلے میرے ماں باپ کا حق ہیں اور یہ حق انہیں ملنا چاہئے لیکن تم نے مجھ سے پوچھے بغیر سارے فیصلے کیے، مجھے مجبور کر دیا کہ میں تم سے علیحدہ ہو جاؤں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میری بہتری کی آڑ میں تم نے اپنی بہتری سوچی ہاں ایسا ہی ہے ورنہ بتائیں کہ میں نے تم سے کب اور کیا مانگا، غلط ہے سب کچھ غلط ہے، میں نہیں مانتی۔۔۔

☆......☆......☆

جرم بہر طور جرم ہوتا ہے۔ یہ لوگ مجرم تھے۔ سید علی نے خود کو کسی بھی طرح سمجھایا ہو، لیکن حقیقت راکھ کی چنگاری کی طرح کہیں نہ کہیں سے جھانک لیتی تھی۔

"کیا میں نے غلط کیا ہے بھاگوان؟"

"مجھے بھاگوان مت کہا کرو، کہاں سے سیکھ لیا ہے تم نے یہ لفظ۔۔۔ بھاگوان

دیکھے ہیں کبھی؟"

سید علی نے اداس نگاہوں سے بیوی کو دیکھا اور بولا۔ "بہت بڑا مجرم ہوں، کیا واقعی میں بہت بڑا مجرم ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں نے غلط سوچا۔۔۔ بہت غلط سوچا لیکن ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ خوشحالی کے صرف باغ دیکھے جا سکتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے جاگتے دماغ سے ناکام آرزوؤں کی تکمیل کا تصور تسلی بے شک دے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور اسی سوچ نے یہاں تک پہنچا دیا۔ ذرا سا غور کرو، ایک دفعہ پڑوس میں ایک کار آ کر رکی تھی۔ بہت ہی خوبصورت کار، اس وقت رومانہ نے کیا کہا تھا، یاد ہے اس نے کہا تھا کہ ابو اس میں بیٹھ کر کیسا لگتا ہوگا۔ یہ پرستان سے آئی ہے نا۔ ایسی گاڑیوں میں پریاں ہی بیٹھتی ہیں، پریاں بہت پیاری ہوتی ہیں ابو! اور میں دل مسوس کر رہ گیا تھا، لیکن آج تم دیکھو، کئی کاریں ہیں اس کے پاس۔ اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت۔"

"ہم کیا جانیں۔۔۔ ہمارے ہاں سے تو وہ رخصت ہو گئی، شادیاں ہوتی ہیں تو ایک اجنبی لڑکا بیٹوں کی طرح قریب آ جاتا ہے، کبھی کبھی تو بہت اچھے داماد بھی مل جاتے ہیں۔ ہمیں اللہ نے صرف ایک بیٹی دی تھی، آپ کے خواب کچھ بھی ہوں سید علی! میں نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے اور ان خوابوں میں میں نے یہ سوچا تھا کہ چلو اللہ نے بیٹا نہیں دیا، مگر بیٹی کے ذریعے ایک بیٹا تو گھر آ جائے گا۔ ماں باپ کی طرح ہی چاہیں گے ہم اسے، وہ بھی ہمیں چاہنے لگے گا، ہم اسے مجبور کر دیں گے، اتنا پیار، اتنی اپنائیت، اتنی چاہت دیں گے اسے کہ وہ ہمیں نظر انداز نہیں کر سکے گا اور پھر ہماری یہ خوشی بھی پوری ہو جائے گی۔ سید علی! بیٹی کے تو ہاتھ بھی پیلے نہیں ہوئے اور وہ ہم سے دور چلی گئی جیسے خدانخواستہ وہ مر گئی ہو۔"

"جذبات کی رو میں اتنا دور بھی نہیں چلے جانا چاہئے، کیسی باتیں کر رہی ہو، تم میرا دل اور دکھا رہی ہو۔"

بیوی خاموش ہو گئی۔ سید علی کا دل اب بہت زیادہ دکھا دکھا سا رہنے لگا تھا۔ ادھر نادر علی ایک ایک دن گن رہا تھا۔

بھائی سے بولا۔ ”بھائی جان! بیس بائیس دن ہو گئے ہیں میرا خیال ہے اب رومانہ کو اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔“

سید علی نے غم زدہ نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور بولے۔

”نادر علی! میرا بیٹا ہے تو، بھائی تو میں نے تجھے سمجھا ہی نہیں ہے۔ میں نے اپنی ہر الجھن تجھے بتا دی تھی اور تجھ سے مدد مانگی تھی۔ نادر علی! کام تو ہوا مگر لگتا ہے ہم نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”بھائی! ہم نے بالکل ٹھیک کیا ہے، ذرا دیکھیں تو سہی جا کر آج ہی میں نے رومانہ کو ایک انتہائی مہنگی کار میں باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ آذر غیاث غوری ساتھ تھا مگر کیا شاندار کار تھی آپ یقین کریں مجھے رومانہ خوش نظر آ رہی تھی۔“

”شاید۔۔۔“

”نہیں بھائی جان! حوصلہ نہ ہاریں، میں نے آپ سے ایک بات کہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے اور پھر ہم اپنے عمل کو غلط تصور نہیں کرتے۔ دیکھیں سیدھی سی بات ہے، تھوڑا سا وقت گزر جانے دیجئے کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ اصل میں بہت سے کام کئے ہیں میں نے۔ قتل کبھی کسی کو نہیں کیا۔ ہمیں دیکھنا ہوگا۔ رومانہ وہاں پہنچ چکی ہے، اس کے سلسلے میں کسی کمزوری کا اظہار نہ کیجئے۔ البتہ اسے اب اپنا کام شروع کر دینا چاہئے۔ میں دیکھوں گا کہ کتنا وقت آذر غیاث اس دنیا میں گزارتا ہے، پھر کچھ اور دیکھیں گے کچھ اور سوچیں گے۔“

”یعنی اس کی ہلاکت کے بارے میں سوچو گے۔۔۔؟“

”ابھی میں کیا کہہ سکتا ہوں بھائی جان! اگر کام ایسے ہی ہو گیا تو پھر ہم یہ سب کچھ نہیں کریں گے۔ رومانہ ہماری آرزوؤں کی تکمیل کرتی رہے گی۔ اگر ہم نے آذر غیاث غوری کی پوری دولت اپنے قبضے میں کرنے کے بارے میں نہ سوچا تو بس اتنا وہاں سے حاصل کر لیں گے کہ رومانہ کا مستقبل شاندار ہو جائے، میں تو امریکہ پہنچ ہی چکا ہوں گا۔ آپ لوگوں کو باقاعدہ اپنے کوائف سے آگاہ کروں گا اور اس کے بعد جب رومانہ ایک بڑا ہاتھ مارے گی تو آپ تینوں امریکہ میرے پاس آ جایئے گا۔ بس مسئلہ وہی ہے نا کہ اتنا

کھائیں گے جتنا آسانی سے ہضم ہو جائے گا اور اگر یہ دیکھا کہ بات کسی طور بن ہی نہیں رہی ہے تو پھر یہ کریں گے بھائی جان! کہ آذر غیاث غوری کو راستے سے ہٹا دیں گے۔“

سید علی لرز کر رہ گئے تھے۔ ہر شعبے میں کام کر چکے تھے۔ محکمہ پولیس جہاں لاتعداد کیس آتے تھے۔ پولیس اتنی احمق نہیں ہوتی، کسی بھی واقعے کی گہرائیوں کے ساتھ تفتیش ہوتی ہے مجرم کہیں نہ کہیں غلطی کرتا ہی ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ سید علی نے ایسے ہی ایک جرم کا آغاز کیا تھا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے عدالت بھی دیکھی تھی جہاں وہ پیشکار کی حیثیت سے خاصے عرصے کام کر چکے تھے۔ مقدمات چلتے تھے، ایک ایک نکتے پر غور کیا جاتا تھا اور مجرموں کو سزائیں ملتی تھیں۔ پھر اس کے بعد مرزا عرفان کے پاس آئے جو ایک کامیاب وکیل تھے۔ مرزا عرفان احمد خود بھی ایسی کوئی بات سوچ سکتے تھے دولت کی ضرورت کس کو نہیں ہوتی لیکن دولت کے حصول کا ایک معیار بھی ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ بس اندھی چالیں چل دیں۔ نادر علی تو جرم کی دنیا کا انسان تھا ہی اور پھر اس پر امریکہ سوار تھا۔ کیا ہی مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ وہ سب سے پہلے رومانہ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ اتنی رقم حاصل کر لے کہ اس کو امریکہ جانے کا موقع مل جائے، وہ تو چلا جائے گا، اس کے بعد جو کہانیاں وہ سنا رہا ہے وہ کیسے پایۂ تکمیل تک پہنچیں گی۔ صاف ظاہر تھا کہ نادر علی صرف اپنا کام نکالنا چاہتا تھا، اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ بعد میں کیا ہوتا ہے۔ یہ بات سید علی نے تو نہ کہی لیکن ان کی بیوی نادر علی کے سامنے ہی بول پڑی۔

”تم بار بار امریکہ جانے کی بات کرتے ہو نادر! تم تو امریکہ چلے جاؤ گے، بعد میں، ہم لوگ کیا کریں گے۔ کیا ذریعہ ہوگا کہ رومانہ ایک بار پھر ہمیں اپنی بیٹی کی حیثیت سے مل جائے، کون کرے گا تمہارے پیچھے یہ سب کچھ؟“

”کچھ نہ کچھ انتظام تو کروں گا بھابی! کچھ سوچوں گا اس بارے میں۔ دیکھیں میں نے آپ سے پہلے ہی یہ بات کہہ دی تھی کہ میں نجانے کب سے امریکہ جانے کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ اتنی کوششیں کی ہیں میں نے کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بھابی! یہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی خوشیاں پوری کرنے کے بعد واپس آ کر آپ کیلئے کچھ کروں۔ بہر حال ابھی اس بارے میں ہم آخری فیصلہ نہیں کر رہے۔ پہلے ایک راستے کا

حل تو نکل آئے۔"

"ارے واہ۔۔۔۔ ہماری بچی تو تم نے وہاں تک پہنچا دی اور اب اس کے بعد یہ سوچو گے کہ ہمارے پیار کا کیا حل نکلے گا۔"

"ایسی بات نہ کہیں بھابی! جو کچھ کیا میں نے آپ ہی لوگوں کی خواہش کے مطابق کیا اور پھر فرض کیجئے اگر رومانہ وہاں رہ بھی جاتی ہے تو آپ تو یہی کہتی رہی ہیں کہ آپ صرف رومانہ کی خوشیاں چاہتے ہیں، کیا آپ کے دل میں بھی یہ خیال ہے کہ رومانہ کے ذریعے بڑی بڑی رقمیں حاصل کریں؟"

"تھوکتا ہوں میں ان رقموں پر۔۔۔۔" سید علی تڑپ کر بولے۔

"بھائی جان! جذباتی نہ ہوں اب جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں اس کا نتیجہ نکل آنے دیجئے۔ اتنے دن ہو گئے کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے اب مجھے اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہیئے۔"

نادر علی نے اس مسئلے پر بہت غور کیا اور اس کے بعد ایک بار پھر سجاد کو اس نے طلب کر لیا۔

"تمہارے پیسے مل گئے تھے؟"

"ہاں نادر علی! مل گئے۔"

"یہ ایک ہزار روپے اور رکھو، میں تمہیں ایک موبائل فون دیتا ہوں۔ یہ موبائل فون تم شدلہ تک پہنچا دو۔ ظاہر ہے تمہاری پہنچ رومانہ تک تو نہیں ہو گی۔ میرا مطلب ہے شانیہ تک، شدلہ کا پوچھتے ہوئے چلے جاؤ اور یہی کہو کہ شدلہ سے ملنے آئے ہو۔ موبائل فون اسے دے دو اور اس سے کہو کہ شانیہ سے میری بات کرائے، وہ خود ہی مجھے رنگ کرے اور فون اپنے ہی پاس رکھے۔"

"ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا۔" سجاد نے کہا اور پھر دوسرے ہی دن وہ ہاشا کی حیثیت سے اس عالیشان کوٹھی پر پہنچ گیا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے اسے دیکھا اور بولا۔

"ہاں کس سے ملنا ہے؟"

"وہ سر جی! میری ایک بہن رہتی ہے یہاں، شدلہ ہے جی اس کا نام۔ آپ بس

یہ بتا دو شدلہ کو کہ ہاشا آیا ہے۔"

چوکیدار اپنے کیبن کی طرف بڑھ گیا اور اس کے بعد انٹرکام پر اس نے کسی ہاشا کے آنے کی اطلاع دی اور تھوڑی دیر کے بعد اسے اندر بلا لیا گیا۔ سجاد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شاندار محل کی شان دیکھ رہا تھا۔ سارا کیس اسے معلوم تھا اور اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔ بہر حال وہ ایک ملازم کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور کچھ دیر کے بعد ایک شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

"آپ بیٹھیئے مادام آتی ہیں۔" ملازم نے کہا۔

اور سجاد کو دل ہی دل میں ہنسی آنے لگی۔ بیچاری نبیلہ اسٹیج پر کام کرتی تھی۔ تھوڑا بہت کام اسے مل جاتا تھا، اچھی ایکٹر تھی لیکن عمر رسیدہ تھی اولڈ کریکٹر اسے مل جاتے تھے تھوڑے بہت پیسے کما لیتی تھی اور گزارا ہو جاتا تھا لیکن اب اس عالیشان کوٹھی میں مادام کی حیثیت سے رہ رہی تھی پھر تھوری دیر کے بعد شدلہ آ گئی وہ سلک کا سوٹ پہنے ہوئے تھی سجاد اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا شدلہ کا رنگ ڈھنگ ہی بدلہ ہوا تھا قریب آ کر اس نے کہا۔

"کہو ہاشا! خیریت سے آنا ہوا؟" ہاشا نے ادھر ادھر دیکھا اور بولا۔

"مزے ہو گئے نبیلہ! تیری تو قدرت نے کیسی تقدیر پلٹی ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تقدیر کب تک تیرا ساتھ دیتی رہے گی۔"

"دیکھو فضول باتوں سے گریز کرو تمہیں پتہ ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔۔۔۔"

"ہاں ہوتے ہیں اچھا یہ بتاؤ کیسی گزر رہی ہے یہاں۔۔۔۔"

"بہت اچھی تم لوگ کیسے ہو؟" نبیلہ نے کہا

"سب ٹھیک ہے۔" سجاد بولا

لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں سامنے کی جانب اٹھ گئیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر ایک کپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

سامنے سے آنے والی رومانہ تھی۔ ایک انتہائی خوبصورت اور پروقار لباس میں ملبوس، چہرے سے وہ شان اور تمکنت ٹپک رہی تھی کہ دیکھنے والا دیکھے تو دیکھتا ہی رہ

جائے، آنکھوں میں چبھنے والی چمک تھی اور اسی چمک نے سجاد کو ایک لمحے کیلئے مسحور کر دیا تھا۔ نجانے اندر کون سے جذبے تھے جنہوں نے اس کے بدن میں ہلکی سے کپکپاہٹ پیدا کر دی تھی حالانکہ وہ کسی بہت بڑے گھر کی بیٹی نہیں تھی۔ نادر علی کو سجاد اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے بڑے بھائی سید علی کو بھی لیکن یہ لڑکی اس وقت اس گھرانے سے اس قدر مختلف لگ رہی تھی کہ دیکھنے والے کو یقین نہ آئے بہر حال اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

''رو۔۔۔رو۔۔رومانہ بی بی۔۔۔!''

''یہ کیوں آیا ہے یہاں؟'' رومانہ کی کرخت آواز ابھری۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔''

''خالہ جی! یہاں سے فارغ ہو کر میرے پاس آئیں۔'' رومانہ نے کہا اور واپسی کیلئے مڑ گئی۔

شدلہ اور سجاد یا نبیلہ اور سجاد سکتے کے عالم میں اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ پھر جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو سجاد کی آواز ابھری۔

''باپ رے باپ یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی۔'' شدلہ نے منہ سے ''شی'' کی آواز نکال کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چند لمحات خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''وہ اپنا کردار ادا کر رہی ہے، جو کیریکٹر اسے دیا گیا ہے، اس کیلئے ہر لمحہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا کردار سب سے مشکل ہے کیونکہ غوری صاحب نے اسے اپنی آنکھوں کا تارا بنا لیا ہے، اپنا وقار قائم رکھنے کیلئے اسے اتنا ہی سخت رہنا پڑتا ہے۔''

سجاد سر کھجانے لگا پھر بولا۔ ''بات سمجھ میں نہیں آئی، کردار تو اس کا یہ ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پلی بڑھی ہے ایک معمولی سی عورت کے ساتھ۔ اسے تو بالکل مختلف ہونا چاہئے۔''

''ہر چیز پر حیرت کا اظہار، ہر بات کو سیکھنے کی کوشش، لباس پہننے کا یہ شاندار انداز اور گردن اکڑا اکڑا کر چلنے کی یہ ادا تو کسی بڑے خاندان کی لڑکی میں ہی ہونی چاہئے۔''

''یہی تو تیرے اندر کمی ہے سجاد! اسٹیج پر کبھی تجھے کوئی بڑا کام ملا، سوچنے کا فرق ہوتا ہے بس سوچنے کا فرق۔۔۔۔''

''اسٹیج کا طعنہ مت دیا کرو بڑی بی! تم کیا کرتی ہو؟''

''میری بات چھوڑ دے سجاد! میں نے تو ڈھلتی ہوئی عمر میں ہی اسٹیج پکڑا ہے، اس سے پہلے زندگی کے اسٹیج پر ایک بدنما کردار ادا کرتی رہی ہوں، جب میں بیوہ نہیں ہوئی تھی نا تب تو میری ٹور دیکھتا۔ پر قدرت نے کسی بری بات کی سزا دے دی۔ میاں مر گیا اور کوئی تھا نہیں۔ سسرال والوں نے نکال باہر کیا۔ دو ہی باتیں تھیں سجاد! یا تو کسی بڑے گھر میں جا کر بیٹھ جاتی اور برائیاں بدن پر اوڑھ لیتی یا پھر رزق کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی۔''

''ارے تو تو سنجیدہ ہو گئی نبیلہ۔۔۔!''

''وہ ایک گاؤں سے آئی ہے، لیکن کردار کیا ہے اس کا، ارب پتی باپ کے بیٹے کی بیٹی ہے اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ خاندان کی خو کبھی نہیں جاتی، وہ بڑی سمجھداری سے اپنا کردار انجام دے رہی ہے۔''

''بابا۔۔۔! ہمیں تو اسے اپنا استاد کہنا چاہئے، ٹھیک کہتی ہے تو۔ بڑا خون بڑا ہی ہوتا ہے، اچھا خیر چھوڑ، کیا رویہ ہے غوری صاحب کا اس کے ساتھ؟''

''بتایا ہے نا تجھے آنکھوں کا تارا بنا رکھا ہے، صورت دیکھ کر جیتے ہیں، ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔''

''کچھ ہاتھ واتھ بھی دکھایا اس نے ابھی تک کہ نہیں۔ نادر علی کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟''

''ابھی تک تو کچھ بھی نہیں، دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔''

''خیر ہاتھ دکھا بھی دے گی تو ہمارے ہاتھ کیا آئے گا۔ ہمیں تو بس شو کے پیسے ملتے ہیں، یعنی جب نادر علی کو ہم سے کوئی کام ہوتا ہے تو تھوڑے، بہت پیسے ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ چل ٹھیک ہے۔ اچھا ہاں سن یہ موبائل فون بھیجا ہے نادر علی نے۔ اب اس کے ذریعے رابطہ ہوا کرے گا، جانتی ہے نا موبائل فون کا استعمال؟''

''اس کیلئے بھیجا ہے یا میرے لئے؟''

"دونوں کیلئے بابا! جس سے بھی بات کرنی ہو۔ دیکھو اسے وائبریشن پر لگا دیا گیا ہے چھپا کر رکھنا ہے تجھے بلکہ فون تو اپنے پاس ہی چھپا کر رکھنا، اسے مت دینا۔"

سجاد نبیلہ کو موبائل فون کے استعمال کے بارے میں بتانے لگا پھر بولا۔

"نادر اس سے بات کرے گا، مجھے تھوڑے سے پیسے دے کر اس نے یہاں بھیجا ہے اور میں ہاشا کی حیثیت سے تجھ سے ملنے آ گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کبھی دوبارہ بھی مجھے یہاں آنا پڑے۔"

"کسی نے روکا ٹوکا تو نہیں؟"

"نہیں نہیں بس بتانا پڑا ذرا، بڑی شان ہے بھائی یہاں کی، تو کیسا محسوس کر رہی ہے؟"

"بڑی اچھی جگہ ہے سجاد! غوری صاحب بہت ہی نیک انسان ہیں۔ یہاں بہت سے ملازم ہیں، مجھے ملازم نہیں سمجھا جاتا حالانکہ میں نے کہا تھا کہ صاحب جی میری بھی کوئی ڈیوٹی لگائیں، وہ بولے کہ شدلہ ہم تمہاری بڑی عزت کرتے ہیں، تم ہماری پوتی کی خالہ ہو، ملازم تو نہیں ہو، مالکوں کی طرح گھر میں رہو، عیش کرو، تو بھیا سجاد دو روٹی اور تن کے کپڑوں کا معاملہ تھا۔ جب تک اللہ نے یہاں رزق لگا رکھا ہے ملتا رہے گا۔ ویسے یہ لڑکی ہمدردی کے قابل ہے، تم یقین کرو اس کی وجہ سے مجھے یہ عیش وعشرت ملا ہے، مگر میں اس سے دلی ہمدردی رکھتی ہوں۔"

"اتنی شان سے جی رہی ہے، ہمدردی کیا چیز ہوتی ہے؟"

"نہیں، ماں باپ نے زیادتی کی ہے اس کے ساتھ، ارے عمر ہی کتنی ہے، کیسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا اپنا مطلب پورا کرنے کیلئے۔"

"اچھا بھئی، میں چلتا ہوں ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"ذرا احتیاط رکھنا۔ نادر علی کا کام ہو جانا چاہئے۔" شدلہ نے برا سا منہ بنایا۔

سجاد اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ شدلہ کچھ لمحے وہیں کھڑی رہی۔ پھر وہ رومانہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ رومانہ چھوٹی عمر کی تھی۔ شدلہ سے عزت واحترام کے ساتھ ہی

پیش آتی تھی لیکن اس کی شخصیت میں واقعی کوئی ایسی بات تھی کہ نبیلہ جھینپی جھینپی سی رہتی تھی۔ کئی بار اس نے رومانہ سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹی! ماں باپ تو ایسا نہیں کرتے۔"

تو رومانہ نے آنکھیں نکال کر کہا تھا۔ "بس خالہ جی! اس کے بعد کبھی ایک لفظ نہ نکالنا میرے ماں باپ کے بارے میں۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتی، جو کچھ انہوں نے کیا ہے، غلط کیا ہے، لیکن میرے ماں باپ نے کیا ہے، خبردار اس کا کوئی تذکرہ اس کے بعد نہ ہو۔"

شدلہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہ گئی تھی، بہرحال اس کے بعد واقعی اس نے سید علی یا اس کی بیوی کے بارے میں کچھ نہ کہا تھا۔ وہ رومانہ سے ہمدردی رکھتی تھی، بہت سی راتوں کو اس نے رومانہ کو کھڑکی سے باہر خلا میں گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے تھے، لیکن اس کا چہرہ ایسے درد وکرب کی تصویر بنا رہتا تھا جسے دیکھ کر آنسو بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ بہرحال وہ رومانہ کے کمرے میں پہنچ گئی، رومانہ بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیوں آیا تھا یہاں؟"

"نادر علی نے اسے یہاں بھیجا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"یہ موبائل فون دے گیا ہے۔ کہتا ہے نادر علی تم سے بات کرنا چاہتا ہے، ابھی تک رابطہ نہیں ہوا بہت دن ہو گئے۔"

رومانہ کی آنکھوں میں سرخی جھلکنے لگی اور اسی وقت موبائل فون میں وائبریشن ہونے لگی۔ تو نبیلہ نے جلدی سے کہا۔

"لو پکڑو۔۔۔ یہ پھدک رہا ہے۔"

اس نے اس طرح موبائل فون رومانہ کی طرف بڑھایا جیسے وہ کوئی مشین نہ ہو بلکہ مینڈک ہو جو اس کے ہاتھ میں پھدک رہا ہو۔ رومانہ ایک لمحے تک سوچتی رہی، اسی دوران نبیلہ نے جلدی سے موبائل فون نیچے رکھ دیا۔ موبائل پر اسی طرح وائبریشن ہو رہی

تھی اور وہ اپنی جگہ ناچ رہا تھا، رومانہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا۔ پھر اس کا بٹن آن کیا اور اسے چہرے کے قریب لے جا کر بولی۔

''یس۔۔۔''

''کون رومانہ؟'' دوسری طرف سے آنے والی آواز نادر علی کی ہی تھی۔

''نہیں شانیہ۔'' رومانہ کے لہجے میں عجیب سا پتھریلا پن تھا۔

''اوہو کوئی پاس موجود ہے کیا؟'' رومانہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تو نادر علی نے پھر کہا۔

''رومانہ۔۔۔!''

''سنا نہیں تم نے رومانہ نہیں شانیہ، کون بول رہے ہو تم؟''

''رومانہ! میں تمہارا چچا ہوں۔''

''دماغ خراب ہے تمہارا میرے باپ کا کوئی بھائی نہیں تھا۔''

''کیا ڈرامہ کر رہی ہو بھئی؟''

''بدتمیزی مت کرو اور بدتمیزی کرنا ہے تو سامنے آ کر کرو تا کہ تمہیں تمہاری بدتمیزی کا جواب دیا جا سکے۔''

''رومانہ! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ تم رومانہ ہی بول رہی ہو نا؟''

''پاگل معلوم ہوتے ہو، دیوانے لگتے ہو، میرا نام شانیہ ہے، یہاں کوئی رومانہ نہیں رہتی سمجھے۔ نہ میں کسی چچا کو جانتی ہوں، نہ میرا کسی سے کوئی تعلق ہے۔ میں اپنے دادا جی کے ساتھ رہتی ہوں اور میرے دادا جی کا نام آذر غیاث غوری ہے اگر اس کے بعد یہاں فون کرنے کی کوشش کی گئی تو بھگتنا پڑے گا تم لوگوں کو، میں یہ فون توڑ رہی ہوں۔'' رومانہ نے موبائل فون پوری طاقت سے دیوار پر دے مارا اور اس کے بعد شدلہ سے بولی۔

''خالہ جی! اسے اٹھاؤ اور اس کے بعد خبردار تم ان لوگوں میں سے کسی سے ملیں، ورنہ میں جانتی ہوں کہ آگے مجھے کیا کرنا ہے، جاؤ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔''

ایسا خوفناک تاثر تھا اس لہجے اور اس آواز میں کہ نبیلہ پھرتی سے اٹھی۔ فون ٹوٹ گیا تھا، اس نے اسے اٹھا کر دوپٹے میں لپیٹا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔ رومانہ جلتی

آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

نادر علی کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہکنے لگا تھا۔ بدن میں ہلکا سا تشنج پیدا ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی کیفیت کا شکار رہا پھر اس نے آواز لگائی۔

''بوٹا'' ایک چھوٹے سے قد کا آدمی اندر داخل ہو گیا۔

''پانی لاؤ ٹھنڈا۔۔۔''

''لایا سر جی!'' چھوٹے قد کے آدمی نے کہا اور چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ نادر علی شدید غصے کے عالم میں مٹھیاں کھول رہا تھا اور بند کر رہا تھا۔ بوٹا پانی لے کر اندر داخل ہوا تو اس نے اسے دیکھ کر غراتے ہوئے کہا۔

''جگ لاؤ، یہ گلاس مجھے دے دو۔'' بوٹا نے گلاس نادر علی کے ہاتھ میں تھمایا اور ایک بار پھر باہر چھلانگ لگا دی۔

نادر علی نے گلاس کا پانی ایک سانس میں حلق سے نیچے اتار لیا تھا اور گلاس کو اس طرح ہاتھ میں لئے گھور رہا تھا جیسے گلاس نے اسے گالی دے دی ہو۔ بوٹا پھر اندر داخل ہوا، اس بار اس کے ہاتھ میں جگ تھا، نادر علی نے گلاس آگے بڑھا دیا اور اس کے بعد وہ پورا جگ پانی پی گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس کے بعد باہر نکل آیا۔ ایک پرانی موٹر سائیکل باہر صحن میں کھڑی ہوئی تھی۔ یہ وہی گھر تھا جہاں رومانہ کو رکھا گیا تھا، اس نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور اس کے بعد اس پر بیٹھ کر چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر میں داخل ہو گیا تھا، سید علی نے ہی دروازہ کھولا تھا، نادر علی کا چہرہ دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی خاص بات ہے، نادر علی اس کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہو گیا تھا، دالان کے تخت پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

''نہیں بھائی جان! نہیں بھائی جان! نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، بڑا احترام کرتا ہوں میں آپ کا۔ کبھی میں نے اپنے آپ کو اس گھر سے مختلف نہیں سمجھا، لیکن بات مختلف ہو گئی ہے اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اب کیا کروں اور میرا رویہ کیا ہو، بھائی جان! بہت

سے مشکل مرحلے زندگی میں پیش آئے ہیں۔ میں نے ہمیشہ سینہ تان کر ہر مشکل کا مقابلہ کیا ہے، لیکن اپنے خون کی گندگی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔"

"اگر مجھے کچھ معلوم ہو تو میں تمہارا شکریہ ادا کروں گا۔" سید علی نے خشک لہجے میں کہا۔

"میں نے اسے موبائل فون بھجوایا تھا سجاد کے ہاتھوں، سجاد کو جانتے ہیں نا آپ جو ہاشا کا کردار ادا کر رہا تھا؟"

"ہاں ہاں تم نے بتایا تھا پھر۔۔۔؟"

"میں نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرے اور جب میں نے اسے فون کیا تو جانتے ہیں اس نے کیا کہا۔"

"کیا کہا؟" سید علی کی بیگم نے پر شوق لہجے میں پوچھا اور جواب میں نادر علی انہیں وہ الفاظ بتانے لگا جو رومانہ نے اس سے کہے تھے، پھر بولا۔

"اور اس کے بعد اس نے فون دیوار پر دے مارا۔ ختم ہو گیا فون، یہ کیا ہے اس نے۔"

سید علی کے چہرے پر غور وفکر کے آثار پھیل گئے، پھر انہوں نے کہا۔

"نادر علی! تھوڑا صبر کرو، ہوسکتا ہے کسی بات پر اس کا موڈ خراب ہو۔"

"یہ خراب موڈ بھی ہمیں ہی برداشت کرنا پڑے گا بھائی جان! اسے ہر طرح سے سمجھایا تھا کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔ اب وہ آنکھیں بدل رہی ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہے، یہ جو کچھ ہو رہا ہے، بہت خطرناک ہو رہا ہے، اگر اس نے اس رنگ کو مستقل کر لیا تو کیا ہوگا۔ مگر میں بھی آپ کو بتائے دیتا ہوں۔"

☆......☆......☆

آذرغیاث غوری کہیں باہر سے آیا تھا۔ رومانہ کیلئے اس کے پاس بے شمار تحائف تھے۔ ملازموں سے یہ تحائف نکلوا کر وہ "شانیہ شانیہ" چیختا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ رومانہ نے اس کی آواز سنی تو تیزی سے اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آذرغیاث غوری کی محبت نے رومانہ کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ اس قدر محبت کرنے والا انسان اس روئے زمین پر

موجود ہے۔ وہ سوچتی تھی کہ اس کے باپ نے اسے سب کچھ دینے کے نام پر اس سے سب کچھ چھین لیا۔ کسی سے اگر اس کا گھر، اس کے رشتے چھن جائیں تو اس سے زیادہ نقصان کی بات اور بھلا کیا ہوسکتی ہے، لیکن آذرغیاث غوری کے چہرے پر اسے جو محبت نظر آتی تھی، اس نے رومانہ کو متاثر کیا تھا۔ وہ اس محبت کا جواب اسی محبت سے دے رہی تھی حالانکہ ابھی تک وہ منزل نہیں آئی تھی جب وہ سچ مچ آذرغیاث غوری کو چاہنا شروع کر دے۔ بہر حال آذرغیاث غوری بھی بڑی محبت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ جب بھی کبھی گھر میں داخل ہوا خالی ہاتھ نہ آیا۔ نجانے کیا کیا الم غلم رومانہ کیلئے اٹھا لایا کرتا تھا۔ پورا گھر رومانہ کے قدموں میں بچھا جاتا تھا۔ ملازم اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔ آذرغیاث غوری نے اسے اپنے اس شاندار محل میں بہت بڑا مقام دیا تھا۔ سارا گھر رومانہ کیلئے کھلا ہوا تھا۔ بس ایک کمرہ ایسا تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا اور جب آذرغیاث غوری اس کمرے میں ہوتا تو تب کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔ ملازموں نے بتایا تھا کہ وہ کمرہ اس کی لائبریری ہے۔ وہاں وہ اس وقت جا کر بیٹھتا ہے جب اس کا رونے کو جی چاہ رہا ہوتا ہے۔ بیٹے کے غم میں وہ وہاں جا کر روتا ہے۔ رومانہ نے یہ الفاظ سنے تھے لیکن آج تک وہ اس کمرے میں جانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ ایک ایسی جگہ جہاں محبت کی سچائی کا سحر قائم ہو، وہاں داخل ہونا آسان بات نہیں ہوتی اور رومانہ تو خود بھی اس جھوٹ سے متنفر تھی۔ آذرغیاث غوری بے شمار تحائف لے کر اس کے سامنے پہنچا اور بولا:

"آؤ دیکھو، میں تمہارے لئے کیا کیا لایا ہوں۔ آؤ کھول کر دیکھتے ہیں، چلو بھئی اندر لے چلو۔" اور وہ یہ تحائف لے کر رومانہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اعلیٰ درجے کے قیمتی کپڑے، بہت ہی خوبصورت جیولری۔ رومانہ نے نگاہیں اٹھا کر آذرغیاث غوری کو دیکھا۔

"دادا جی! بار بار آپ یہ سب کچھ کیوں لے آتے ہیں، آپ دیکھئے نا، میرے پاس تو رکھنے کی جگہ تک نہیں ہے۔"

"بس بیٹا! زندگی میں کبھی یہ سب کچھ نہیں کیا، اب وقت نے موقع دیا ہے تو دل چاہتا ہے کہ نجانے کیا کیا لے آؤں۔ کیا بات ہے چہرے پر کچھ اداسی سی ہے۔ میں بار بار

کہتا ہوں شانیہ! باہر جایا کرو، بیٹا! سیر کو جایا کرو۔ گھومنے پھرنے سے ذرا طبیعت بحال ہوتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارے اندر کوئی دکھ پل رہا ہے اور میں وہ دکھ سمجھتا ہوں شانیہ! ظاہر ہے تمہیں یہ احساس ہوتا ہوگا کہ یہ تمہارے باپ کا گھر ہے لیکن تمہارے باپ اور ماں کو یہاں رہنے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں تم بالکل ٹھیک سوچتی ہو، ایسی ہی بات ہے، وہ بدنصیب انسان میں ہوں جس نے ان سے ان کا گھر چھین لیا تھا، جاؤ بیٹا! یہ سب چیزیں رکھو اور باہر کی سیر کر آؤ۔"

"جی داداجی!" رومانہ نے گردن جھکا کر کہا۔ وہ نجانے کیوں اس وقت بہت الجھ سی گئی تھی۔ خاص طور سے ان الفاظ نے اسے بہت الجھا دیا تھا اور پھر نادر علی سے موبائل فون پر بات کر کے جو بوجھ اس کے ذہن پر طاری ہوا تھا، اس نے بھی اسے چکرا سا دیا تھا۔ نادر علی چاہتا ہے کہ میں اس گھر میں چوری کروں۔ یہاں کی تجوریوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اپنے گھر پہنچاؤں۔ ہائے ایک ایسا شخص جس کی آنکھوں میں میرے لئے محبت کے دیئے روشن ہیں۔ میں اس بدنما کردار کو یہاں کیسے ادا کرسکوں گی۔ بالکل ٹھیک کیا میں نے نادر چچا کے ساتھ اور یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نے موبائل فون بھی توڑ دیا، میں ایسا کوئی کام کبھی نہیں کروں گی۔ ان لوگوں نے مجھ سے میرا نام، میری شناخت چھین لی ہے، مجھے کیا پڑی ہے کہ میں انہیں یہاں کی دولت لے جا کر دوں۔ ہونہہ۔۔۔ میرے بہتر مستقبل کیلئے کر رہے ہیں وہ تو اپنے مستقبل کو بہتر کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ واہ ری دنیا واہ، کس پر بھروسہ کرے انسان، ماں پر، باپ پر، چچا تو خیر دور کی چیز ہے وہ تو ہے ہی غلط۔

"بیٹا! ڈرائیور کہہ رہا ہے کہ وہ تیار ہے، گاڑی صاف کر چکا ہے، آپ جلدی سے تیار ہو کر باہر نکل آؤ۔" شدلہ نے آ کر اطلاع دی۔

"آتی ہوں خالہ! تم جاؤ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔" رومانہ نے کہا اور شدلہ گردن جھکا کر باہر نکل گئی۔ اسے رومانہ کے خراب موڈ کا پورا پورا احساس تھا، ویسے وہ اسے غلط نہیں سمجھتی تھی، رومانہ نے ابھی تک اپنے ماں باپ کے موقف کو تسلیم نہیں کیا تھا اور آج اس نے نادر علی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس نے شدلہ کو خوف زدہ کر دیا تھا کیونکہ وہ نادر علی کے مزاج کو بھی جانتی تھی۔ بہرحال اسے ایک ذمے داری سونپی گئی تھی اور اس کے سلسلے

میں اسے نادر علی نے اچھی خاصی رقم بھی دی تھی۔ مزید یہ کہ یہاں اس شاندار محل نما کوٹھی میں آنے کے بعد اسے اپنی زندگی میں بھی ایک شدید تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے صرف ایسی جگہوں کو خواب محل سمجھا تھا اور ان خواب محلوں میں وہ عالم خواب میں ہی آ جا سکتی تھی۔ لیکن اب اسے ان خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی اور وہ حقیقتاً ایک محل میں گھوم پھر رہی تھی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا انداز، اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ کسی نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ شدلہ اپنے موقف سے ہٹ کر اس بات کی خواہشمند ہو گئی تھی کہ اس کی زندگی کسی ایسے محل میں گزر جائے۔ تاریک راتوں میں جب لوگ باہر سو رہے ہوتے تھے، وہ اسٹیج پر تیز روشنیوں کے سامنے نجانے کیا کیا سوانگ رچاتی تھی۔ یہ سوانگ اسے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن یہی سوانگ اسے روٹی دیتے تھے۔ اب جو سوانگ وہ کر رہی تھی، وہ بالکل مختلف تھا لیکن اس کا پسندیدہ۔ تھوڑی دیر کے بعد رومانہ آ گئی، ایک سلیقے کا صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ شدلہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ باوردی دربان نے پراحترام انداز میں گیٹ کھولا اور کار باہر نکل آئی، ڈرائیور نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا:

"کہاں چلوں چھوٹی بیگم صاحبہ؟"

"بس یونہی گھومتے رہو، پرہجوم سڑکوں پر رواں دواں زندگی کے درمیان۔"

رومانہ نے کہا اور پھر ایک دم چونک پڑی۔ اتنے گہرے اور گاڑھے الفاظ اسے نہیں بولنے چاہیے تھے۔ ڈرائیور بھی بہرحال آذر غیاث غوری کا آدمی تھا، حالانکہ آذر غیاث غوری نے دل کے دروازے کھول دیئے تھے اور دماغ کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ ایک بار بھی رومانہ کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ آذر غیاث غوری اس پر ذرا برابر بھی شک کرتا ہے، وہ بڑے پرخلوص انداز میں رومانہ کے ساتھ پیش آتا تھا۔ کھانے کی میز پر اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ رومانہ کو ہر چیز کھلا دے۔ وہ ہر طرح سے اسے اپنا پیار دے رہا تھا اور اپنے مرحوم بیٹے کی کمی اس طرح سے پوری کر رہا تھا، ویسے بھی انتہائی خوش مزاج آدمی تھا۔ مرزا عرفان احمد بھی اب اکثر اس کے ساتھ اس کے گھر آتے رہتے تھے۔ اس نے اپنی جائیداد کے تمام امور مرزا عرفان احمد کو سونپ دیئے تھے اور مرزا عرفان احمد کو اس کام کا مناسب معاوضہ ملتا

تھا گویا گھاٹے میں کوئی نہیں تھا سوائے نادر علی کے۔ رومانہ سڑکوں پر دیکھتی رہی، پھر اتفاق ہی تھا کہ ڈرائیور نے کار اس سڑک پر موڑ لی جہاں رومانہ کا کالج تھا۔ رومانہ جواب تک خواب زدہ نگاہوں سے ماحول کو دیکھتی رہی تھی ایک دم چونک پڑی۔ یہ راستے اس کے جانے پہچانے تھے، یہ جگہ اس کی زندگی کے سنہرے دور سے تعلق رکھتی تھی، اس کی ویران آنکھیں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگیں۔ سرمد واپس آ گیا ہوگا، وہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا۔ کہاں کہاں تلاش کیا ہوگا اس نے اسے۔ سرمد بیچارہ جواب صرف ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ کالج کے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے آنسو بھری آنکھوں سے اس گیٹ کو دیکھا جہاں وہ طالبہ کی حیثیت سے آتی جاتی تھی۔ کار وہاں سے کچھ اور آگے بڑھی تو اچانک ہی اسے طوطے والا بابا نظر آیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”ڈرائیور ذرا گاڑی روکو۔“ اور ڈرائیور نے فوراً گاڑی کو سست کر کے فٹ پاتھ کے ساتھ لگا دیا۔

شدلہ نے رومانہ کو دیکھا اور بولی: ”کیا بات ہے بیٹا؟“

رومانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے اتری، ڈرائیور جلدی سے کار سے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا، رومانہ بے اختیار انداز میں آگے بڑھی۔ شدلہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی کیونکہ رومانہ نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا اس لئے شدلہ کی بھی ہمت نہیں پڑی کہ وہ اتر کر رومانہ کے پیچھے جائے۔ بس وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ رومانہ آگے بڑھی فال والے بابا کے پاس پہنچ گئی، بابا ہمیشہ نگاہیں جھکائے بیٹھا رہتا تھا، اس نے آنکھیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ کون ہے؟ کیا ہے؟ تب رومانہ کی آواز ابھری۔

”بابا! فال کھولنا ہے۔“ بابا نے اب بھی نگاہیں نہ اٹھائیں اور طوطے کا پنجرہ کھولنے لگا۔ پھر اس نے طوطا نکال کر لفافوں پر چھوڑ دیا اور طوطا اپنے پنجوں سے لفافوں کو کریدتا ہوا اپنا کام معمول کے مطابق کرتا رہا اور پھر اس نے ایک لفافہ باہر کھینچ دیا۔ بابا نے اس لفافے کا کاغذ نکال کر رومانہ کے حوالے کر دیا تھا۔ رومانہ نے ڈبڈباتی آنکھوں سے کاغذ پڑھا، لکھا تھا۔

”دنیا میں اپنا پرایا کوئی نہیں، جو کسی کو اپنائیت دے سکے وہی اپنا اور جو پرایا سمجھتا

ہو، وہ اپنا ہونے پر بھی پرایا ہے۔“

رومانہ نے کئی بار اس کاغذ کو پڑھا اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر اسے واپس کر دیا، پھر اس کی آواز ابھری:

”ایک اور بابا صاحب!

بابا نے طوطے کو دوبارہ لفافوں پر چھوڑ دیا اور وہی سارا عمل ہوا، ایک اور کاغذ رومانہ کے ہاتھ میں آ گیا جس پر لکھا تھا۔

”اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقین کر لو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا ہے اور یہی فن تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ دے گا جو تمہاری آرزو ہو گی۔“

رومانہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کاغذ بھی بابا کے حوالے کر دیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ آج سارے لفافے کھول کر ان کی تحریریں پڑھ لے۔ عجیب و غریب تحریریں تھیں۔ پتہ نہیں ان میں کیا سچائی ہے اور کیا جھوٹ، لیکن بہرحال جو کچھ بھی تھا، یہ دونوں تحریریں اس کے حسب حال تھیں۔ بابا کو جو کچھ اس نے دیا، اسے بابا ہاتھ میں لئے دیکھتا رہ گیا اور وہ واپس پلٹ آئی، چند ہی لمحوں میں اس کی کار وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

کون کہتا ہے کہ اتفاقات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ اتفاقات بعض اوقات اس قدر حیرت انگیز ہو جاتے ہیں کہ انسان ان پر یقین نہیں کر پاتا۔ جس وقت رومانہ فال دیکھ کر اپنی کار کی جانب بڑھ رہی تھی اسی وقت دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر کسی حد تک تھوڑے فاصلے پر سرمد اپنے کالج کی طرف جا رہا تھا۔ وہ بس سے اترا تھا اور آہستہ آہستہ دکھی دل اور دکھی نظر لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ان دنوں وہ جس شدید کشمکش کا شکار تھا، اس کی مثال خود اس کی زندگی میں نہیں ملتی تھی۔ محبت کیا چیز ہے۔ انسان کس طرح بے اختیار ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ پر بھی قابو نہیں پا سکتا، اس کا احساس اب اسے لمحے لمحے ہو رہا تھا۔ رومانہ جو اس کی زندگی میں ایک خوشگوار ٹھنڈک رکھتی تھی، اب اس سے دور ہو گئی تھی اور اب وہ اپنے آپ کو کسی تپتے صحرا میں سرگرداں محسوس کر رہا تھا، زندگی کے بہت سے بوجھ

اس کے شانوں پر تھے اور اسے وہ بوجھ ہر حالت میں اٹھانے پڑتے تھے، وہ کئی ٹیوشنز کرتا تھا تب کہیں جا کر اپنے تعلیمی اخراجات اور اپنے متعلقین کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ سخت مشقت کرنی پڑی تھی اسے۔ اگر کالج کے اوقات مداخلت نہ کرتے تو یقینی طور پر اب تک کوئی نہ کوئی نوکری کر چکا ہوتا۔ رومانہ سے اس کی بہت گہری دوستی تھی۔

''رومانہ! کیا اپنا نام بدل لوں۔''

''کیوں؟'' رومانہ چونک کر کہتی۔

''سرمد ہے میرا نام اور آگے چل کر میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ ہم تو سر کٹانے والوں میں سے ہیں۔''

''نہیں سرمد! تمہارا نام بہت یونیک اور پرکشش ہے۔''

''بس یونہی کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں کوئی ایسا دردناک واقعہ نہ ہو جائے۔''

''سرمد! دیکھو، ہم لوگ حقیقتوں کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور واقعات میں تبدیلی یوں سمجھ لو وقت کا عمل ہوتی ہے، وقت سے پہلے خوفزدہ ہو جانا عقل کی بات نہیں ہے۔''

''اور اگر وقت آنے پر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں، وقت کے فیصلوں کو قبول کر لیں گے۔''

''اتنی بے دردی رومانہ!''

''کیا یہ بے دردی ہے اگر میرے الفاظ میں کوئی بری کیفیت محسوس کی ہے تم نے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں اور معافی بھی مانگ لیتی ہوں۔''

''ارے یار! نہیں، ایسی بات نہیں ہے، بس وسوسے دل میں آتے ہیں۔ اچھا رومانہ ایک بات بتاؤ؟''

''ہاں ہاں، میں سمجھتی ہوں، کیا پوچھنا چاہتے ہو تم۔''

''بتاؤ کیا پوچھنے والا ہوں میں؟''

''یہی کہ کیا تم میرے ساتھ گزارہ کر لوگی؟''

''یار! کمال ہے، ویسے بیوی کو اتنا ذہین نہیں ہونا چاہئے۔'' سرمد نے پر مزاح انداز میں کہا اور رومانہ ہنس پڑی۔

''بیوی۔''

''سس۔۔۔ سوری، سوری۔ جلد بازی کر گیا، ویسے بات واقعی سچ ہے، جواب دینا پسند کرو گی؟''

''ایک بات کا جواب دو، اب اس وقت تم اور تمہارے اہل خاندان جن حالات میں گزارہ کر رہے ہیں، وہ کیسے ہیں؟''

''نہایت کسمپرسی اور بے کسی کا شکار ہیں اب تک۔''

''تو ان شکاروں میں ایک اور کا اضافہ کر لو میں بھی تمہارے ساتھ کسمپرسی اور بے کسی کی شریک ہو جاؤں گی۔ پھر پتہ ہے ہم کیا کریں گے، بیٹھیں گے سر جوڑ کر اور سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں بھی نوکری کروں گی اور تم بھی نوکری کرنا، ارے ابھی تو یہ تعلیم کا مسئلہ ہے نا، ظاہر ہے اس کی موجودگی میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتے ورنہ سچی بتا رہی ہوں کہ ابھی سے میں تمہارا ساتھ دینا شروع کر دیتی۔''

اس طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں ان کی زندگی کی سب سے دلکش باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن اس وقت سرمد نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ ناقابل یقین اور ناقابل فہم تھا۔ اس نے رومانہ کو دیکھا تھا جو فال والے بابا کے پاس سے اٹھ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ سرمد ایک لمحے کیلئے سکتے میں رہ گیا تھا، یقیناً یہ نظر کا دھوکا تھا، رومانہ جو لباس پہنے ہوئے تھی وہ انتہائی قیمتی تھا، اس کا جو حلیہ تھا، وہ بھی رومانہ کا حلیہ نہیں تھا، لیکن چہرے کے نقوش، بھلا یہ نقوش کیسے بھولے جا سکتے تھے، یہ تو جزو ذہن تھے، جزو عقل تھے، جزو نگاہ تھے، یہ تو بینائی کا ایک حصہ تھے، یہ نقوش کسی دوسرے کے ہو ہی نہیں سکتے، وہی تناسب، وہی قد و قامت، بس لباس بے حد قیمتی مگر سادگی کا مظہر۔ لیکن رومانہ اتنے قیمتی کپڑے نہیں پہنتی تھی اور پھر اس کے انداز کی نفاست، سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہوئی قیمتی کار کی جانب بڑھی تو ڈرائیور نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا اور رومانہ اس میں بیٹھ گئی۔ سرمد ایک دم چونکا، کار اسٹارٹ ہو چکی تھی، وہ ایک ہاتھ اٹھا کر پیچھے دوڑا، لیکن کار آگے بڑھ گئی تھی،

سرمد سڑک کے بیچوں بیچ ایک آئل ٹینکر سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کا نمبر دیکھ رہا تھا۔ نمبر اس قدر واضح تھا کہ اس نے کار کے کافی آگے نکل جانے کے باوجود اسے دیکھ لیا اور اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔ پھر احتیاط سے باقی سڑک عبور کی اور دوسرے فٹ پاتھ پر پہنچ گیا۔ اس کے بدن میں تشنج پیدا ہو گیا تھا، کیا یہ رومانہ ہی تھی اور اگر اس کی کوئی ہمشکل تھی تو یہ دنیا کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اس کے اہل خاندان نے تو بتایا تھا کہ وہ کینیڈا چلی گئی ہے۔ کیوں یہ جھوٹ بولا گیا تھا اس سے جبکہ وہ لوگ اسے جانتے بھی نہیں تھے۔ پہلے کبھی ان لوگوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آخر انہوں نے یہ غلط بیانی کیوں کی تھی؟ اگر ان کی یہ غلط بیانی نہیں تھی تو یہ لڑکی کون تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا۔ اس بات سے بے نیاز کہ دو آنکھیں اسی فٹ پاتھ پر اس کا جائزہ لے رہی ہیں جہاں سے سڑک عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ کافی دیر تک سوچنے کے بعد دفعتاً ہی اسے طوطے والا بابا یاد آیا اور وہ تیز قدموں سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"بابا صاحب! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میں کیا بتا سکتا ہوں، ساری باتیں طوطا بتاتا ہے۔"

"جو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں وہ طوطا نہیں آپ بتائیں گے۔" طوطے والے بابا نے پہلی بار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"ہاں پوچھو۔"

"یہاں ابھی ایک لڑکی آئی تھی، اس نے ابھی فال کھلوایا تھا چند منٹ پہلے۔"

"دو فال کھلوائے تھے اس نے۔"

"بابا صاحب! آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

طوطے والے بابا نے دوسری بار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"نہیں، میں کسی کی صورت نہیں دیکھتا۔"

"وہ کونسے دو لفافے تھے جو اس نے دیکھے تھے۔" سرمد نے ایک بے تکا سوال کیا۔

طوطے والے بابا نے تیسری بار نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"میں ان لفافوں کو نہیں دیکھتا، مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔"

"اجازت۔"

"تم فال کھولنا چاہتے ہو تو فال کھولو، نہ میں کسی لڑکی کو جانتا ہوں، نہ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے جو ابھی فال کھلوانے کیلئے آئی تھی۔"

"ایک لفافہ نکلوایئے۔" سرمد نے مایوسی کے عالم میں کہا اور طوطے والے بابا نے پھر طوطا باہر نکال لیا۔ طوطے نے لفافہ باہر نکالا اور بابا نے کاغذ نکال کر سرمد کی طرف بڑھا دیا، سرمد نے کاغذ کھولا۔

"ہر ناکامی اپنے دامن میں کامرانی کے پھول لئے ہوئے ہے، لیکن پہلی شرط یہ ہے کہ ہم کانٹوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔"

کاغذی تحریر کسی دوسری آواز میں نشر ہوئی تھی اور سرمد کو فوراً ہی یہ احساس ہوا تھا کہ عقب میں کوئی آ کھڑا ہو گیا ہے اور یہ تحریر اس نے پڑھی ہے۔ بات بدتمیزی کی تھی۔ سرمد نے غصیلی نگاہوں سے اس طرف دیکھا اور صرف ایک نگاہ میں اس نے اسے پہچان لیا، یہ رومانہ کا چچا نادر علی تھا۔ نادر علی کو سرمد نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ رومانہ کے گھر رومانہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔ اس شخص نے نہایت خشک بلکہ کسی قدر بدتمیز لہجے میں کہا تھا کہ رومانہ کینیڈا چلی گئی ہے اور اب وہ یہاں نہیں ہے۔ سرمد کا رویہ ایک دم بدل گیا، اس نے کاغذ لفافے میں رکھا۔ لفافے والے بابا کو پیسے دیئے اور نادر علی کی طرف مڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر علی کو سلام کیا تھا، نادر علی نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا اور اسے اشارے سے آگے بڑھنے کیلئے کہا اور پھر وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

"ہاں تو آج کل طوطوں سے فال کھلوا رہے ہو، کیوں؟"

"آپ رومانہ کے چچا ہیں؟"

"ہاں۔" نادر علی نے جواب دیا۔

"وہ رومانہ تھی، آپ نے اسے دیکھا؟" سرمد کسی قدر بدحواسی سے بولا۔

"ہاں شاید۔" نادر علی نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن آپ نے۔۔۔"

"سنو، یہ ہوٹل دیکھ رہے ہو نا؟" نادر علی نے کالج کیفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے ایک پیالی چائے پی لیجیے میرے ساتھ۔"

"نہیں اس وقت نہیں، ایسا کرو، کل۔۔۔ کل دن میں دس گیارہ بجے کے قریب مجھے یہاں ملو، آسکتے ہو؟"

"اگر اسی وقت۔"

"ٹھیک گیارہ بجے۔ خدا حافظ۔" نادر علی نے کہا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

"سنیے میری بات تو سنیے پلیز۔" نادر علی تیزی سے آگے بڑھتا رہا تھا۔ سرمد اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کالج کیفے سے آگے بس اسٹاپ تھا۔ اسی وقت ایک بس آ کر رکی تھی اور چلنے ہی والی تھی کہ نادر علی جلدی سے اس بس میں چڑھ گیا اور بس آگے بڑھ گئی۔ سرمد بس کو پیچھے سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کی عقل بری طرح چکرائی ہوئی تھی، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پتھر کا بت بنا وہ دور جاتی ہوئی بس کو دیکھتا رہا اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو اسے اپنی کیفیت کا احساس ہوا، اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی لیکن دوسروں کیلئے، خود اس کی تو دنیا تہہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اسی مشکل میں گرفتار تھا کہ کار میں بیٹھ کر جانے والی لڑکی رومانہ ہے یا نہیں، رومانہ ایک متعدل حد میں رہا کرتی تھی۔ اس کے پاس ایسے ذرائع نہیں تھے کہ وہ اتنی اعلیٰ کار میں بیٹھ کر سفر کرے، کیا اس کے والدین نے خفیہ طور پر کسی دولت مند آدمی سے اس کی شادی وغیرہ کر دی۔ کیا اب وہ ایک ایسے شخص کی بیوی ہے جو اس قدر قیمتی کار رکھتا ہے، ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، کیا رومانہ بذات خود ایسی تھی، دل قبول نہیں کرتا تھا، رومانہ کا مزاج اسے معلوم تھا، وہ کسی بھی طرح دولت سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں، ہو سکتا ہے اسے مجبور کر دیا گیا ہو کہ اسے خاموشی اختیار کرنی پڑی ہو۔ لمحوں کے اندر اندر نجانے کتنے خیالات اس کے دل میں آ کر گزر گئے۔ پھر اسے نادر علی کا انداز یاد آیا، بڑا پراسرار سا انداز تھا، چلو اگر وہ لڑکی رومانہ کی ہم شکل تھی تو پھر نادر علی نے یہ انداز

کیوں اختیار کیا تھا۔ کیوں بلایا تھا اس نے اسے دوسرے دن گیارہ بجے اس ہوٹل میں۔۔۔۔ غرضیکہ سرمد کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ بس کچھ شبہات تھے اس کے دل میں۔ نادر علی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہرحال اس نے اپنے آپ کو سنبھالا، نہا دھو کر تیار ہوا اور پھر ساڑھے نو بجے ہی کیفے میں جا بیٹھا، وہیں اس نے چائے وغیرہ پی، ذہن نجانے کیا کیا فیصلے کر رہا تھا۔ پھر خدا خدا کر کے گیارہ بجے اور ٹھیک گیارہ بجے نادر علی کیفے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو سرمد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور نادر علی اس کے قریب آ گیا، پھر بولا:

"ناشتہ کر چکے ہو؟"

"جی، آپ کیلئے کیا منگواؤں؟"

"چار انڈوں کا آملیٹ، مکھن لگے ہوئے سلائس اور چائے، میں صبح کو یہ ناشتہ کرتا ہوں۔" نادر علی نے سخت گیر لہجے میں کہا۔

سرمد نے ویٹر کو اشارہ کر دیا۔ تمام چیزوں کے بارے میں بتا کر اس نے کہا۔

"جی نادر علی صاحب! آپ کا رویہ بڑا پراسرار ہے، میری آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں آپ رات بھر نہیں سو سکا۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں، ناشتہ کر لوں اگر اجازت ہو تو؟"

"آملیٹ بنانے میں کچھ دیر لگے گی، براہ کرم آپ میری یہ مشکل دور کر دیجیے۔"

"ٹھیک۔" نادر علی نے کہا اور پھر اپنی قمیض کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑی ہوئی فائل نکال لی۔ فائل میں ایک کاغذ لگا ہوا تھا، اس نے کاغذ سرمد کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"دستخط کر دو۔"

سرمد نے چونک کر نادر علی کی شکل دیکھی، پھر آنکھیں صاف کر کے کاغذ کی تحریر پڑھنے لگا، لکھا تھا۔

"میں سرمد ولد دانش علی کچھ وجوہات کے تحت اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ فیروز نامی نوجوان جو میری محبوب ہستی رومانہ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا، میرے منع

کرنے کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور جب اس نے اس حد سے آگے قدم بڑھا
کر رومانہ پر دست درازی کی کوشش کی تو میں نے ہتھوڑا مار کر اسے قتل کر دیا۔ اس قتل کا
اعتراف میں ایک معزز شخصیت نادر علی کے سامنے کر رہا ہوں، جنہوں نے یہ تحریر مجھ سے
اس لئے لکھوائی ہے کہ میں مزید کوئی جرم نہ کر سکوں اور محتاط رہوں، کیونکہ نادر علی میرے جرم
کے چشم دید گواہ ہیں، اس لئے میں ان کی یہ فرمائش پوری کر رہا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ
آئندہ ہر طرح کے جرم سے گریز کروں گا۔"

سرمد علی ولد دانش علی بقلم خود

اس تحریر کو دیکھ کر سرمد کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

سرمد حیران نگاہوں سے اس تحریر کو دیکھ رہا تھا اور دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ
شخص پاگل ہے جو موت کے پروانے پر اس سے دستخط کرنے کیلئے کہہ رہا ہے۔ اس نے
نگاہیں اٹھا کر نادر علی کو دیکھا تو نادر علی نے مسکرا کر کہا۔

"اگر تم اس پر دستخط کر دو گے تو اس کے بعد میں آگے گفتگو کروں گا۔"

"آپ مجھے قاتل بنانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں ایسی ہی بات ہے۔" نادر علی نے بے خوفی سے کہا۔

"اور آپ کا کیا خیال ہے، میں قاتل بننا قبول کر لوں گا۔"

"ہاں میرا یہی خیال ہے۔"

"آپ رومانہ کے چچا ہیں اس لئے میں آپ سے کسی طرح کی کوئی بدزبانی نہیں
کرنا چاہتا، لیکن مجھے بتایئے آپ پاگل ہیں یا مجھے پاگل سمجھتے ہیں، میں بھلا ایسی تحریر آپ کو
کیوں دوں گا؟"

"برخوردار! اصل میں یہ تحریر ایک معاہدہ ہے جو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں ایک
ایسا قیمتی راز میں تمہیں دینا چاہتا ہوں جسے تم افشا کرو گے تو میری تو گردن پھنسے گی ہی، لیکن
میرے ساتھ اور بھی چند لوگ مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اصل میں، میں یہ چاہتا
ہوں کہ تمہاری مدد سے ایک ایسی مشکل کا حل دریافت کر سکوں جو اس وقت میرے لئے
عذاب بنی ہوئی ہے۔ کاش آپ کی بات میری سمجھ میں آجاتی۔"

"رومانہ کی تلاش میں آئے تھے نا یہاں اور وہ لڑکی جو ایک قیمتی کار میں بیٹھ کر گئی
تھی اس کے لئے متجسس اور حیران تھے کہ وہ رومانہ ہے یا نہیں۔ میں اصل میں تمہیں اسی
بارے میں بتانا چاہتا تھا۔" نادر علی نے کہا۔

سرمد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کا پورا بدن پسینے میں ڈوب گیا
تھا، نادر علی کے یہ الفاظ انتہائی سنسنی خیز تھے، اسی دوران ویٹر ناشتے کے برتن لگانے لگا اور
جب وہ برتن رکھ کر چلا گیا تو نادر علی نے کہا۔

"کاغذ پڑھ لیا تم نے؟"

"جی ہاں۔"

"تو فائل بند کر دو، اس کا ایسے کھلے رہنا مناسب نہیں ہے۔ کیا سوچ رہے ہو،
دراصل ایک قیمتی راز کی حفاظت کیلئے میں یہ تحریر تم سے لے رہا ہوں۔ ظاہر ہے میں اسے
کہیں تمہارے خلاف استعمال نہیں کروں گا، کیونکہ میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے، بلکہ یہ
بھی ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں تمہارے لئے کوئی بہتر موقع نکل آئے۔ مزید الفاظ ضائع نہیں
کروں گا، جب تم اس کاغذ پر دستخط کر دو گے تو میں اسے اپنے لباس میں رکھ لوں گا اور پھر تم
پر ایک ایسا انکشاف کروں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے اور پھر تمہارے ساتھ مل کر ایک بڑا کام
کرنا ہے مجھے، کیا سمجھے۔"

سرمد تھوڑی دیر تک خاموشی سے نادر علی کو دیکھتا رہا، ویٹر پھر آ گیا تھا، اس نے
طلب کیا ہوا سامان میز پر سجایا اور بولا:

"چائے لے آؤں سر!"

"یار! لے آ، کتنے چکر لگائے گا۔" نادر علی نے کہا۔

"ابھی لایا سر!" ویٹر جو سرمد کو اچھی طرح جانتا تھا بولا:

اس نے نادر علی کے لہجے کا خیال نہیں کیا تھا۔ سرمد نے آہستہ سے گردن اٹھائی،
اب اس کی آنکھوں میں ایک سخت کیفیت نظر آ رہی تھی۔

"میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ آپ رومانہ کے چچا ہیں، رومانہ مجھے آپ
کے بارے میں بتا چکی ہے۔ اس کے والد سید علی صاحب آپ کو اپنے بیٹوں کی طرح

چاہتے ہیں، لیکن آپ ان سے مختلف مزاج کے حامل ہیں۔"

"ہاں بتایا ہوگا رومانہ نے تمہیں کہ میں بچپن ہی سے باہر کی دنیا کا انسان ہوں۔ میرے دل میں ایک آرزو ہے مگر ابھی میں اس کے بارے میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا، دستخط کردو گے تو میرے اور تمہارے درمیان ڈبل رشتہ قائم ہوجائے گا۔ پہلا رشتہ رومانہ کے کالج فیلو کا یا پھر الفاظ پر غلاف کیوں چڑھاؤں، مجھے معلوم ہے کہ تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو، دوسرا رشتہ میرے مقصد کی تکمیل کا، بولو اس کاغذ پر دستخط کیلئے تیار ہو یا نہیں۔"

"نہیں، نادر علی صاحب! میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اپنی گردن آپ کے ہاتھ میں دے دوں، سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ یہ شخص ضرور قتل ہوا ہوگا چونکہ آپ کا تعلق جرائم کی دنیا سے ہے، ہوسکتا ہے اسے آپ ہی نے قتل کیا ہو اور آپ پولیس کو ایک بے گناہ قاتل دے رہے ہیں جو اپنی زبان سے اعتراف کررہا ہے کہ اس نے فیروز کو قتل کیا ہے۔"

"بیٹے! محبت کی داستانیں پڑھی ہیں کبھی، محبت کے لئے تو انسان بارہا قتل ہوتا ہے۔ میں تمہیں اس تحریر کے ذریعے پولیس کے حوالے کبھی نہیں کروں گا، بلکہ یہ ایک مضبوطی ہے کیونکہ جو انکشاف میں تم پر کرنا چاہتا ہوں وہ بھی اتنا ہی سنسنی خیز ہے۔"

"میں اس ناشتے کا بل ادا کر کے جارہا ہوں، مجھے آپ کی شرط منظور نہیں ہے۔"

سرمد نے کہا اور کرسی کھسکا کر اٹھ گیا۔

"ارے بیٹھو تو سہی۔"

لیکن سرمد وہاں نہیں رکا تھا۔ کاؤنٹر پر اس نے بل ادا کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے بدن میں شدید اینٹھن ہورہی تھی، جو راز نادر علی اس پر منکشف کرنا چاہتا تھا وہ یقیناً اسی حیثیت کا حامل ہوگا جس کے نتیجے میں نادر علی ایک اتنا بڑا کام کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن یہ تو میں نہیں کرسکتا، کسی قیمت پر نہیں کرسکتا۔ اس نے نادر علی پر لعنت بھیجی اور پھر بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ بس میں بیٹھ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اب کیا کرنا چاہیے اس نے سوچا اور اس کے ذہن میں اس کار کے نمبر گھوم گئے جس میں رومانہ بیٹھ کر گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پرسکون کیا زور زور سے گردن جھٹکی۔ بس کو ایک اسٹاپ پر رکوانے کے بعد وہ ایک دوسری بس میں بیٹھ کر کار رجسٹریشن آفس چل پڑا جہاں سے وہ اس کار کے مالک کا پتہ معلوم کرسکتا

تھا۔ رجسٹریشن آفس پہنچ کر اس نے ایک ایجنٹ سے رابطہ قائم کیا اور سو روپے کے عوض ایجنٹ نے اسے کار کے مالک کا پتہ لاکر دیا۔ یہ پتہ ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ سرمد نے وہ کاغذ پڑھا۔ آذر غیاث غوری اور اس کے بعد اس کے گھر کا پتہ کاغذ پر درج تھا۔

"آذر غیاث غوری۔۔۔۔؟"

یہ نام اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ کبھی رومانہ کی زبانی اس نے یہ نام نہیں سنا تھا۔ ذہن جس قدر شدید کشمکش کا شکار تھا سرمد کا دل ہی جانتا تھا۔ جس بے چینی اور بے کلی سے رات گزاری تھی وہ ناقابل برداشت تھی، لیکن برداشت کیا تھا اس نے اور پھر نادر علی نے جس طرح اسے ذہنی اذیت سے دوچار کیا تھا۔ اس نے اسے دیوانہ کردیا تھا اگر نادر علی اس سلسلے میں اس طرح کی باتیں نہ کرتا تو شاید سرمد اس بات سے متفق ہوجاتا کہ وہ رومانہ کی کوئی انتہائی ہم شکل لڑکی تھی۔ پھر بھی اس نے کار کے رجسٹریشن آفس سے معلومات کا خانہ محفوظ رکھا تھا، نادر علی نے جو پراسرار باتیں کی تھیں وہ صحیح معنوں میں ناقابل فہم تھیں اور سرمد کا دماغ بری طرح منتشر ہوگیا تھا۔ آہ کیا اصلیت ہے، رومانہ کا چچا جو رومانہ کے کہنے کے مطابق ایک جرائم پیشہ آدمی تھا، کیا انکشاف کرنا چاہتا تھا؟ یہ بات تو طے ہے کہ یہ انکشاف رومانہ ہی کے بارے میں کیونکہ سرمد کو رومانہ کے علاوہ کسی اور انکشاف سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ یہ بات نادر علی اچھی طرح جانتا تھا مگر کیا کہنا چاہتا تھا وہ سرمد سے؟ کیا وہی لڑکی رومانہ تھی جو کار سے اتری تھی؟ کیا رومانہ بقول ان کے کینیڈا نہیں گئی؟ اگر ایسا ہے تو وہ اس بدلے ہوئے روپ میں کس طرح پہنچی۔ پھر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار اسے نظر نہیں آیا کہ سیدھا اس پتے پر جاپہنچے جو کار رجسٹریشن آفس سے معلوم ہوا تھا۔ رامسن روڈ پر پہنچ کر اس نے آسانی سے وہ عالیشان کوٹھی تلاش کرلی جو بے مثال تھی۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار سے اس نے کہا۔

"میں آذر غیاث غوری صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"غوری صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں، آپ شام کو پانچ بجے آجایئے۔"

"کوئی اور ہے یہاں، براہ کرم مجھے ان سے ملا دیجئے، ایک انتہائی اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

چوکیدار نے غور سے سرمد کو دیکھا۔ نوجوان اسے شریف معلوم ہوا، اس نے کچھ لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

"آپ آجائیے، میں چھوٹی بی بی صاحبہ کو آپ کے بارے میں اطلاع دے دیتا ہوں، کیا نام ہے آپ کا؟"

"آپ انہیں بتا دیجئے کہ سرمد آیا ہے۔"

"آئیے۔" چوکیدار اسے ڈرائنگ روم میں نہیں لے گیا تھا بلکہ خوبصورت کوٹھی کے ایک خوبصورت برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا اور اطلاع دینے اندر چلا گیا، اندر پہنچ کر اس نے شدلہ سے کہا۔

"شدلہ بہن جی! سرمد نامی ایک نوجوان صاحب سے ملنے آیا تھا آپ براہ کرم چھوٹی بی بی صاحب سے اسے ملا دیں۔"

شدلہ کو سرمد کا نام معلوم تھا، رومانہ اسے اپنی زندگی کے ہر راز سے آگاہ کر چکی تھی، اس نے چوکیدار سے پوچھا:

"کہاں ہے وہ؟"

"باہر بٹھایا ہوا ہے۔"

"میں اطلاع دیتی ہوں۔"

شدلہ فوراً رومانہ کے پاس پہنچ گئی۔ رومانہ معمول کے مطابق اپنے بیڈروم کے ایک گوشے میں خاموش اور اداس بیٹھی ہوئی تھی، شدلہ نے کہا:

"سرمد آئے ہیں۔" رومانہ بری طرح اچھل پڑی، اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شدلہ کو دیکھا اور ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"کون؟"

"سرمد۔۔۔ یہی نام بتایا ہے چوکیدار نے، بتایا ہے کہ ایک نوجوان لڑکا ہے۔"

"اوہ میرے خدا سرمد۔۔۔"

"ہاں، غوری صاحب گھر میں موجود نہیں ہیں۔" شدلہ نے کہا اور غور سے رومانہ کو دیکھا۔ رومانہ کے چہرے پر شدید ہیجان نظر آ رہا تھا، اس کی مٹھیاں تشنج کا شکار تھیں اور وہ

سخت بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، پھر اس نے کہا۔

"میں کیا کروں، مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟" نبیلہ بھی الجھی الجھی نظر آ رہی تھی۔

"دیکھ لو کیا یہ وہی سرمد ہے؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔۔۔ اور کون ہو سکتا ہے نبیلہ آنٹی؟"

"مگر وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"آہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ یقیناً پاگلوں کی طرح مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہو گا۔ میں جانتی ہوں اس کی کیفیت کیا ہو گی۔ ویسے ہی بدنصیب غموں کا شکار ہے، نجانے کیسے کیسے غم اٹھا چکا ہے۔ آہ یہ تو اچھا نہیں ہوا، کیا کروں میں، اب میں کیا کروں؟"

شدلہ خاموش کھڑی تھی۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ وہ نہیں کر سکتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے، رومانہ آنکھیں بند کر کے اسی کرسی پر جا بیٹھی جہاں وہ پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ چند لمحے سوچتی رہی۔ اس کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے اور پھر بہت سے رنگ اس پر آ کر گزرے اور آخر کار اس نے آنکھیں کھولیں اور کہا:

"تم جاؤ خالہ جی! خود اس سے ملو اور پوچھو کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے اور اس کے بعد اس سے کہو ابھی نہیں مل سکتی، اس سے کہو کہ آج سے تین دن کے بعد وہ شام کو پانچ بجے آ جائے میں اس وقت اس سے مل لوں گی۔"

شدلہ کچھ دیر سوچتی رہی اور اس کے بعد باہر نکل آئی۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے اس خوبصورت سے معصوم چہرے والے نوجوان کو دیکھا تو اس کا دل پگھلنے لگا۔

"معاف کرنا میں نے چوکیدار کو ڈانٹا ہے کہ اس نے تمہیں ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں بٹھایا۔"

"آپ خدا کے واسطے آنٹی مجھے یہ بتا دیجئے کہ کیا رومانہ یہاں رہتی ہیں؟"

"رومانہ، رومانہ کون ہے؟"

"میرا مطلب ہے ایک، ایک۔۔۔ نوجوان لڑکی۔"

"آپ کا کیا نام ہے؟"

"سرمد ہے میرا نام، رومانہ میری کالج فیلو تھی۔"

"نہیں سرمد! رومانہ یہاں نہیں رہتی، آذر غیاث غوری صاحب کا گھر ہے یہ، وہ یہاں اپنی پوتی شانیہ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"وہ آنٹی کل شام کو شانیہ میرا مطلب ہے وہ خاتون جو یہاں رہتی ہیں شاپنگ کیلئے گئی تھیں کریم مارکیٹ۔۔۔"

"بیٹے! دیکھئے میں یہاں ملازمہ ہوں، ایک حد تک سوالات کے جواب دے سکتی ہوں آپ ایسا کریں کہ تین دن کے بعد شام کو پانچ بجے آجائیں شانیہ آپ سے ملاقات کرلیں گی۔"

"میں سمجھا نہیں آنٹی!"

"تین دن کے بعد شام کو پانچ بجے، اگر آپ شانیہ کے بارے میں مزید تفصیلات جاننا چاہتے ہیں تو جو میں کہہ رہی ہوں اس پر عمل کریں۔ اس سے پہلے آپ کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوگی، کوئی فائدہ نہیں ہوگا آپ کو۔"

"مگر آنٹی!"

"دیکھو، میری بات کو آخری سمجھو۔"

"اچھا ایک بات تو بتا دیجئے، آپ نے کیا نام بتایا ان خاتون کا؟"

"شانیہ۔"

"آپ نے مس شانیہ کو میری آمد کے بارے میں بتایا ہے۔"

"ہاں، چوکیدار نے مجھے تفصیل بتائی اور میں نے انہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ تین دن کے بعد ان صاحب کو بلا لیا جائے، میں ان سے ملاقات کرلوں گی اس سے پہلے میرے لئے یہ سب ممکن نہیں ہے۔"

"آنٹی! آپ میرا ایک کام کرسکتی ہیں، کسی بھی رشتے کسی بھی ناتے سے میں اس کا حق تو نہیں رکھتا لیکن آپ سے کہنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا، ایک دو منٹ کے لئے مجھے مس شانیہ کی تصویر دکھا دیجئے۔ اصل میں میری ایک بہت ہی عزیز ہستی کھو گئی ہے، یوں سمجھ لیجئے آنٹی میری زندگی کھو گئی ہے۔ مس شانیہ رومانہ کی ہم شکل ہیں، میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اتنی مماثلت صرف اتفاق ہے یا اس کے پس منظر میں کچھ اور ہے۔"

"تم عجیب باتیں کررہے ہو نوجوان! براہ کرم اب جاؤ، اگر مناسب سمجھو تو تین دن کے بعد آجانا اس سے پہلے کوئی کوشش نہ کرنا تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا، چوکیدار انہیں عزت واحترام کے ساتھ باہر چھوڑ آؤ۔"

"چلئے صاحب!" چوکیدار نے کہا۔

سرمد کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اب تک جو شریفانہ رویہ اس کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے ممکن ہے اس کے اندر کوئی تبدیلی آجائے، لیکن دل کا سکون چھن گیا تھا، کسی قدر پراسرار واقعات ہوگئے تھے، رومانہ کی اچانک گمشدگی، نادر علی کا یہ کہنا کہ وہ کینیڈا چلی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کا خشک رویہ، پھر رومانہ کا اس طرح بازار میں نظر آنا، بات اس قدر گہرائی تک نہ پہنچتی اگر نادر علی اسے ملاقات کرکے عجیب وغریب باتیں نہ کہتا۔ پتہ نہیں نادر علی اسے قاتل کیوں بنانا چاہتا تھا، بات اس کی کچھ سمجھ میں بھی آتی تھی، وہ اپنی حفاظت کے خیال سے ایک ایسا اعتراف نامہ اس سے لکھوانا چاہتا تھا، مگر وہ انکشاف کیا ہوتا؟ کیا یہ کہ رومانہ اب شانیہ بن چکی ہے؟ مگر کیسے۔۔۔؟ کوٹھی سے باہر نکل کر وہ ایک طرف چل پڑا، لیکن دل چاہ رہا تھا کہ کہیں بیٹھ جائے، طبیعت عجیب ہورہی تھی۔

"وہ پرسوں آئے گا۔ پرسوں پانچ بجے۔"

"خالہ! میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

شدلہ نے سنجیدہ نگاہوں سے رومانہ کو دیکھا اور بولی:

"کیا فیصلہ کیا ہے تم نے رومانہ؟"

"میں اسے سب کچھ بتا دوں گی، سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی، اسے ہی نہیں بلکہ میں غوری صاحب کو بھی سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔ کتنا نفیس، کتنا شریف، کتنا اچھا انسان ہے وہ، جب وہ میری طرف دیکھتا ہے نا شدلہ خاتون! تو یقین کرو مجھے اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت نظر آتی ہے۔ اتنی محبت تو مجھے میرے باپ نے بھی نہیں دی بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ باپ نے جو فیصلہ کیا، وہ صرف میری محبت میں نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنا مستقبل بھی سنوارنے کی کوشش کی۔ اپنا مستقبل بھی اور چچا نادر علی۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ تو ایک رنگے ہوئے سیار ہیں، ایک مکمل دھوکا۔ ظاہر ہے میرا باپ انہیں بیٹوں کی طرح چاہتا رہا ہے۔ ان

کی ہر ضرورت، ہر خواہش پوری کرتا ہے لیکن انہوں نے یہ سب کچھ میرے باپ کے لئے نہیں کیا۔ اپنی خواہش کی تکمیل کیلئے کیا ہے۔

نہیں خالہ شدلہ! پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ اس شخص کے گھر میں دوسروں کے کہنے پر، ان کے کہنے پر جنہوں نے مجھے بے در، بے گھر کر دیا ہے۔ جنہوں نے مجھ سے اپنی شفقت، اپنی ماں مامتا چھین لی ہے، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا خالہ! آپ مجھے مشورہ دیجئے میں کیا کروں؟ اور پھر سرمد ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ ہم تو پیدا ہی سر کٹانے کیلئے ہوئے ہیں، نہیں خالہ! میں سرمد کو سمجھا دوں گی کہ سرمد میں ایک ایسے ماں باپ کی بیٹی ہوں جو میرا مستقبل سنوارنے کے نام پر مجھے مجرم بنا چکے ہیں، بولو خالہ! مجھے مشورہ دو میں کیا کروں؟"

"بیٹا جو کچھ تم نے سوچا ہے بالکل ٹھیک سوچا ہے، میرے آگے پیچھے بھی کون ہے یہ جرم کرنے سے تو واقعی بہتر ہے کہ غوری صاحب کو سب کچھ بتا کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو، مجھے بھی جیل جانا پڑے گا لیکن کیا فرق پڑتا ہے، جیل میں چکی پیس لوں گی، روٹی تو دو وقت کی مل ہی جایا کرے گی۔"

نبیلہ نے کہا اور گردن جھکا لی، اسی وقت باہر سے کوئی چیز گرنے کی آواز سنائی دی اور رومانہ چونک پڑی۔

"شاید باہر کوئی ہے۔" اس نے کہا اور تیزی سے دروازے کی جانب دوڑی، دروازہ کھول کر باہر جھانکا لیکن یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ کہیں دور کسی کمرے میں کوئی گلدان وغیرہ گر پڑا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے اندر آ گئی، کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر اس نے کہا۔

"غوری صاحب اپنے بیڈروم میں ہی ہیں؟"

"دیکھ کر آؤں؟"

"نہیں خالہ! میں خود ہی چلی جاتی ہوں، خالہ! مجھے معاف کر دیجئے، آپ بہت اچھی ہیں، بے شک آپ کو بھی اس جرم کیلئے استعمال کیا گیا لیکن آپ بھی باضمیر ہیں۔ آپ نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ شکریہ خالہ! ہم نہیں جانتے کہ ہمارا آگے کا وقت کیسا ہوگا، البتہ ایک بات میں کہوں آپ سے اگر غوری صاحب کوئی فوری قدم اٹھا لیتے ہیں تو آپ کوشش

کیجئے کہ سرمد کو ساری حقیقتیں بتا دیں۔"

"لو بیٹی! اگر تمہارے خلاف کوئی کارروائی ہو گی تو تمہارا کیا خیال ہے مجھے چھوڑ دیا جائے گا؟"

رومانہ کچھ دیر شدلہ کو دیکھتی رہی اور اس کے بعد کمرے سے باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آذر غیاث غوری کے کمرے کے سامنے تھی۔ اس نے دستک دی تو اندر سے اسے آواز آئی۔

"ہاں آ جاؤ" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے بدن میں لرزش تھی، ہونٹ خشک ہو رہے تھے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ آذر غوری نے اسے دیکھا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"ارے۔۔۔ کیا بات ہے میری جان! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں سر! اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"بیٹھو بیٹھو۔۔۔ اور یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔۔۔ سر۔۔۔ یہ میں دادا جان سے سر کیسے ہو گیا؟"

"اس لئے سر! کہ نہ آپ میرے دادا جان ہیں اور نہ میں آپ کی پوتی۔ میں آپ کا خون نہیں ہوں سر!"

"پھر کون ہو؟"

"میرے والد کا نام سید علی ہے۔ وہ مرزا عرفان احمد کے پاس ملازم ہیں۔ سر یہ بڑی عجیب کہانی ہے۔ میں آپ کو سنانا چاہتی ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ سناؤ۔" غوری صاحب حیرت انگیز طور سکون سے بولے اور رومانہ مشینی انداز میں شروع ہو گئی۔

"سر! میرا نام رومانہ ہے اور جیسا کہ۔۔۔"

اس کے بعد رومانہ نے ایک ایک لفظ سچ سنا دیا اور آذر غیاث غوری بدستور سکون سے آنکھیں بند کئے یہ داستان سنتا رہا۔ رومانہ کے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ کچھ دیر تک

خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"تم نے مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا دیا؟"

"حد ہو گئی ہے سر۔۔۔! چچا نادر علی چاہتا ہے کہ میں یہاں چوری کروں۔ مجرم تو ان لوگوں نے مجھے بنا ہی دیا ہے اور اب چوری بھی کرانا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک۔۔۔ تو اب کیا چاہتی ہو؟"

"سر! آپ ہم پر دھوکہ دہی کا مقدمہ دائر کرا دیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد ہمیں سزا ہونی چاہئے۔"

"سوچ لو رومانہ۔۔۔! تمہارے والد، والدہ اور چچا کے ساتھ تمہیں بھی سزا ہو گی۔"

"سر! جیسا ہم نے کیا ہے وہ تو ہمیں بھگتنا ہی ہوگا۔"

"فرض کرو میں ایسا نہ کرنا چاہوں اور تمہیں معاف کر دوں تو۔۔۔؟"

"سر۔۔۔! میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ میری ایک بات مان لو گی؟"

"جی سر۔۔۔!"

"تھوڑا سا انتظار کر لو۔ جیسے یہاں وقت گزار رہی ہو اسی طرح گزارتی رہو۔ میں تم لوگوں کے خلاف کچھ نہیں کروں گا بلکہ کوئی بہتر حل سوچوں گا۔"

"لیس سر۔۔۔!" رومانہ نے سرسراتی آواز میں کہا۔

"سر نہیں دادا جان۔۔۔" آذر غیاث نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم نے ساری بات مجھے بتا دی ہے لیکن ابھی مجھے سوچنے کے لئے وقت درکار ہے۔ جب تک میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر لوں تم اس ماحول میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے سس۔۔۔ داد۔۔۔ دادا جان۔"

"جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔"

آذر غیاث غوری نے کہا اور رومانہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد آذر غیاث غوری نے موبائل فون نکالا اور اس پر کوئی نمبر ڈال کرنے لگا۔ پھر اس نے فون کان سے لگا لیا اور دوسری طرف سے آنے والی آواز کو سن کر بولا۔

"سیکرٹری انٹرویو ریلیز کر دو۔ معلومات کر کے مجھے وقت بتاؤ۔ لیکن وقت آٹھ بجے کے بعد کا ہی ہونا چاہئے۔ جس طرح بھی یہ ممکن ہو، یہ پروگرام ارینج کر دو۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ متعلقہ افراد سے تم بات کر چکے ہو، اوکے۔" آذر غیاث غوری نے فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

مرزا عرفان احمد کی اپنی زندگی کے معمولات تھے۔ تمام ذمے داریوں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اپنی پسند کے پروگرام دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ کافی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک غیر ملکی چینل نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ شوبز کے کسی بڑے نامور کا انٹرویو نشر ہونے والا تھا۔ اناؤنسر نے جو الفاظ کہے انہوں نے مرزا عرفان احمد کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اناؤنسر کہہ رہی تھی۔

"ہالی وڈ کے کچھ بڑے ناموں میں ایک نام اے جی جی پی کا بھی ہے۔ اے جی جی پی سے آذر غیاث غوری پروڈکشن بنتا ہے۔ مسٹر آذر غیاث غوری جنہوں نے ہالی وڈ سے کئی فلمیں بنائیں اور مقبولیت کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔ مسٹر آذر غیاث غوری۔"

اور اس کے بعد ایک انٹرویو شروع ہو گیا اور جو شخصیت انٹرویو لینے والے کے سامنے آ کر بیٹھی اسے دیکھ کر مرزا عرفان احمد کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آذر غیاث غوری ہی تھا جو بہت دیر تک اے جی جی پروڈکشن کے بارے میں تفصیلات بتا تا رہا تھا۔ مرزا عرفان احمد بار بار سر جھٹک جھٹک کر اس انٹرویو کو دیکھ رہے تھے۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد انٹرویو ختم ہو گیا، لیکن مرزا عرفان احمد نے جو دیکھا تھا اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ آذر غیاث غوری نے آج تک اپنے بارے میں یہ بات نہیں بتائی تھی، بلکہ اپنے کاروبار کے بارے میں تو انہوں نے کچھ اور ہی بتایا تھا اور جو کچھ بتایا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا کیونکہ دولت کی منتقلی کے جو

کاغذات مرزا عرفان احمد کو موصول ہوئے تھے وہ بالکل ٹھیک تھے اور بہت بڑی دولت وطن منتقل ہوئی تھی۔

بہرحال اس وقت مرزا عرفان احمد کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ وہ فوراً ہی فون کے پاس جا بیٹھے۔ آذر غیاث غوری کو فون کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ آذر غیاث غوری آؤٹ آف سٹی ہیں۔ رات کو ایک بجے تک وہ بار بار آذر غیاث غوری کو فون کرتے رہے۔ موبائل پر بھی کوشش کی لیکن موبائل بند تھا۔ بہرحال آذر غیاث غوری اب تک ایک سادہ سے انسان کی حیثیت سے ان کے سامنے آیا تھا، لیکن اب اچانک اس انکشاف کے بعد اس کی شخصیت مرزا عرفان احمد کے لئے بے حد پراسرار ہو گئی تھی۔ پھر دوسرے دن صبح دوپہر تک یہاں تک کہ رات ہو گئی، رات کو گیارہ بجے آذر غیاث غوری نے مرزا عرفان احمد کا فون وصول کیا۔

''میں عرفان احمد بول رہا ہوں۔''

''ہاں کہو، وکیل صاحب خیریت تو ہے؟''

''لعنت ہے خیریت پر، کل سے تم نے مجھے سولی پر لٹکا رکھا ہے، یہ انٹرویو تمہارا ہی تھا؟''

''ہاں میرا ہی تھا۔''

''کوئی خاص وجہ تھی جو تم نے مجھے یہ بات نہیں بتائی کہ تم اے جی جی پروڈکشن کے مالک ہو۔''

''ایسا کرو کل پانچ بجے آجاؤ، ساری تفصیل بتا دوں گا۔''

''کل نہیں آج بتاؤ۔''

''نہیں مرزا، پلیز کل۔''

پھر انتہائی کوشش کے باوجود آذر غیاث غوری نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ لیکن مرزا عرفان احمد شدید تجسس کا شکار تھا۔ بمشکل رات گزری اور اس کے بعد دن، شام کو پانچ بجے جب وہ آذر غیاث کی کوٹھی پر پہنچا تو اس نے وہاں اچھا خاصا ہجوم دیکھا۔ کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ بہت سی گاڑیوں پر پریس لکھا ہوا تھا آذر غیاث

غوری نے شاید پریس کانفرنس بلائی تھی۔ ساری کی ساری باتیں حیران کن تھیں۔ بہرحال مرزا عرفان احمد اپنی کار سے اتر کر آگے بڑھ گیا۔ کوٹھی کے خوبصورت لان میں پریس رپورٹر موجود تھے۔ غالباً انہیں کچھ بریفنگ دی گئی تھی کیونکہ انہوں نے مرزا عرفان احمد کی تصویریں اتارنا شروع کر دی تھیں۔ آذر غیاث غوری نے مرزا عرفان احمد کا پرتپاک خیر مقدم کیا تو مرزا عرفان احمد نے دانت پیستے ہوئے کہا:

''بات اصل میں یہ ہے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں ناراض ہو کر تم سے کنارہ کشی اختیار کر لوں گا، بوٹیاں چبا لوں گا تمہاری اور تم سے پوچھوں گا کہ یہ سب کیا ڈرامہ ہے؟''

''تمہارے یہ الفاظ اگر رپورٹروں نے سن لیے تو اخبار والوں کو تم جانتے ہو، انہیں کچھ لکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ کیا خیال ہے، تمہارے یہ الفاظ میں اناؤنس کر دوں؟''

مرزا عرفان احمد بوکھلا کر خاموش ہو گیا تھا، بہرحال لوگ آتے رہے، ابھی تک پریس کانفرنس کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ غالباً مہمانوں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد شعلہ اور شانیہ بھی آ گئیں۔ پتہ نہیں انہیں باہر لانے کیلئے کیا کہا گیا تھا۔ پھر شاید آخری آدمی سرمد تھا جو گیٹ پر پہنچا تھا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کھلے ہوئے گیٹ سے اس نے اندر کا منظر دیکھ لیا تھا، آج شانیہ یا رومانہ نے اسے بلایا تھا، حالانکہ خود رومانہ کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ کوئی اتنا بڑا ڈرامہ ہو جائے گا۔ سرمد وہاں پہنچا تھا اور ٹھٹک کر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ کہ چوکیدار آگے بڑھا اور اس نے پرادب لہجے میں کہا۔

''آیئے جناب! آیئے۔''

''وہ میں دراصل۔۔۔''

''جی آیئے، آپ کیلئے ہمیں ہدایت کر دی گئی ہے کہ آپ آئیں تو آپ کو عزت واحترام سے مہمانوں کے درمیان پہنچا دیا جائے۔''

''نہیں۔۔۔ وہ تم اصل میں مجھے جانتے نہیں، یہ تو کوئی پریس کا معاملہ ہے، میرا تعلق پریس سے نہیں ہے۔''

''سر! آپ آیئے۔''

"نہیں میں پھر آجاؤں گا، تم ایک تکلیف کرو۔"

"سر! آپ اندر آیئے۔" چوکیدار نے دوسرے چوکیدار کو اشارہ کیا اور پھر وہ تقریباً سرمد کو گھسیٹتے ہوئے لائے تھے۔ سرمد کی تصویریں بھی دھڑا دھڑ بنائی جانے لگی تھیں اور سرمد کے پورے بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

پھر آذر غیاث غوری نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور بولا۔ "آپ مسٹر سرمد ہیں؟ آیئے براہ کرم ہماری اس تقریب میں آپ کا ایک خاص مقام ہے، آیئے تشریف رکھئے پلیز۔"

بہرحال سرمد آخری مہمان تھا اس کے بعد آذر غیاث غوری اس چھوٹے سے اسٹیج پر پہنچ گیا تھا جہاں انتظام کیا گیا تھا، اس نے پریس کو مخاطب کیا اور بولا:

"مجھے انتہائی خوشی ہے کہ آج میں اپنے وطن کے پریس سے مخاطب ہوں۔ میرا نام آذر غیاث غوری ہے۔ بچپن ہی میں والدین امریکہ لے گئے تھے۔ وہیں مختلف جگہوں پر زندگی گزاری۔ آخر میں لاس اینجلس آ گیا اور پھر ہالی وڈ کی جانب متوجہ ہو گیا، یہ شوق کہاں سے میرے پیچھے لگا یہ ایک طویل داستان ہے، لیکن بہرحال میں نے اے جی جی پروڈکشن قائم کی۔ اس پروڈکشن کے تحت میں نے کئی وڈیوز بھی بنائیں لیکن میرا زیادہ تر رجحان ٹیلی سیریل کی جانب رہا اور انگریزی زبان میں میں نے کئی سیریل بنائے جو اپنا منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میرا پہلا سیریل اینجل کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہوا، پھر دوسرا اینا باربی، تیسرا اے پچ آف لائف، اینجل کا پروفیسر پال گریگ ایسر یونیورسٹی کا پروفیسر تھا جس کی زندگی پر میں نے یہ ڈرامہ سیریل بنایا اور پال گریگ نے اس میں اپنی زندگی کا حقیقی کردار ادا کیا۔ اسی طرح سے اینا باربی ایک ایکٹریس تھی۔ میں نے اس کی زندگی پر سیریل بنایا، میرے سیریل کے بارے میں نشر ہونے والے انٹرویو میں آپ کو یہ علم ہو گا یا نہیں، تو میں بتاتا ہوں، میں نے اس میں انفرادیت پیدا کرنے کیلئے ایک طریقہ کار اختیار کیا، اپنے سیریلز کی کہانی میں خود لکھتا ہوں، میں نے اپنے طور پر کچھ کردار منتخب کئے جیسے پروفیسر پال گریگ جو اپنی کلاس کی ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا، دونوں کی عمر میں بہت فرق تھا، لیکن میں نے محبت کے حقیقی موضوع پر یہ سیریل بنایا۔ اینا

باربی جو اپنی بیٹی سے حسد کرنے لگی تھی، وہ بھی ایک بالکل سچی کہانی تھی اور ان تمام کرداروں کو میں نے حقیقی رنگ میں شوٹ کیا۔ اسی طرح اے پچ آف لائف۔ کئی انگریزی سیریل بنانے کے بعد میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب میں اپنے وطن جا کر ایک اور منفرد سیریل بناؤں اور میں ایک کہانی ذہن میں رکھ کر وطن واپس چل پڑا۔ اس کہانی کا سینٹرل آئیڈیا میرے ذہن میں تھا جس کی تفصیل میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ اگر کوئی دولت مند شخص یہ اعلان کرے کہ اس کی کوئی گمشدہ پوتی اسے درکار ہے تو مختلف لوگ کس انداز میں ری ایکٹ کریں گے۔ میں نے اسی لائن پر کام کیا اور میری رسائی میری اپنی کوششوں کے ذریعے مرزا عرفان احمد ایڈووکیٹ تک ہوئی۔ مرزا عرفان احمد ایڈووکیٹ کے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ان سے اچھے دوست کی تلاش ناممکن ہے، وہ بہت نفیس انسان ہیں۔ جب میں مرزا عرفان احمد سے اپنی کہانی بیان کر رہا تھا تو میرے ذہن میں وہ شخص تھا جو ایک گوشے میں بیٹھا ہوا کمپیوٹر پر ٹائپ کر رہا تھا۔ اگر وہ شخص میرے سامنے نہ ہوتا تو میں مرزا عرفان احمد سے اپنی داستان بیان نہ کرتا، وہ صاحب جن کا نام سید علی ہے اور جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں، ان کے بارے میں کہتا ہوں کہ میرا مشاہدہ، میری تیز نگاہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ حضرت ہماری طرف متوجہ ہیں اور کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ تقدیر کی خوبی کہئے یا پھر میرا تجربہ کہ میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ مرزا عرفان احمد کو میں نے جو تفصیل بتائی وہ ایک مرحوم بیٹے سے متعلق تھی جس نے میری مرضی کے خلاف شادی کر لی تھی اور میں نے اسے اپنی دولت و جائیداد سے محروم کر دیا تھا، وہ ایک بیٹی کا باپ بننے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا اور یہی اس کی بیوی کے ساتھ ہوا، بہرحال سید علی صاحب نے کوششیں شروع کیں۔ اپنے بھائی نادر علی کے ذریعے انہوں نے خود اپنی بیٹی کو وہ مقام دیا اور یہاں سے میرے سیریل کا کلائمکس شروع ہو گیا، وہ بچی اپنے ماں باپ کے ساتھ خوش تھی اور وہ نہیں بننا چاہتی تھی جو وہ لوگ اسے بنانے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن بہرحال اسے مجبور کر دیا گیا اور وہ میری پوتی شانیہ بن کر مجھ تک پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے اس سیریل کے بہت سے کرداروں کی آمد شروع ہو گئی، ان میں وہ بہترین اداکار تھے، جن میں سے ایک نے ہاشا اور دوسرے نے جموں کا کردار ادا

کیا۔ تیسرا شاندار کردار شدلہ کا تھا۔ پھر کہانی کا مرکزی کردار شانیہ۔ اس کردار کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ شانیہ ذہنی طور پر اپنا گھر اپنا ماحول چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھی، اس نے بے شک میری پوتی بننے کی کوشش کی، لیکن ایک ایسی لڑکی جس نے ایک گاؤں میں پرورش پائی ہو، بہت مختصر وقت میں ایک پروقار اور ایک پڑھی لکھی لڑکی کی شکل میں نظر آنے لگی، اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ رومانہ ذہنی طور پر یہ کردار ادا کرنے کیلئے تیار نہیں تھی اور اس نے وہی ری ایکٹ کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ آپ لوگ کہیں گے کہ رومانہ ایک اچھی اداکارہ ثابت نہیں ہوئی۔ واقعی وہ اداکارہ ہے ہی نہیں، وہ ایک ٹھوس لڑکی ہے اور مجھے یہ کردار اسی شکل میں چاہئے تھا۔ اگر یہ بھی اعلیٰ پائے کی اداکاریاں شروع کر دیتی تو میری کہانی یہاں سے بگڑ جاتی۔ لالچ اور ایسا لالچ جس کا اپنے مفاد سے نہیں بلکہ متعلقین کے مفاد سے تعلق ہوتا ہے انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔ میری یہ کہانی موم اسی نظریے کا اظہار کرتی ہے۔ میں نے یہ تمام کردار اکٹھے کئے، سید علی جو اپنی بیٹی کو زندگی کا اعلیٰ مقام دلانے کیلئے بہت سے کام کرتا ہے، اس کا بھائی نادر علی جس کے دل میں امریکہ جانے کی خواہش ہے، اپنے مقصد کے حصول کیلئے ایک ایسا مجرم بننے کی کوشش کرتا ہے جیسا وہ ہے نہیں۔ پھر کچھ اور اداکار جو نادر علی کا ساتھ دیتے ہیں اور شانیہ کے وجود کو میرے سامنے لانے کیلئے اپنا کردار ادا کرتے ہیں، ایک نوجوان سرمد علی جو سید علی کی بیٹی رومانہ کا کالج فیلو ہے، یہ سارے کردار اکٹھے کئے ہیں اور میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کہانی کی تکمیل میں میری مدد کی اور اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھرپور کوششیں کروں گا کہ ہر کردار میرے ساتھ تعاون کرے، نادر علی کو میں امریکہ بھجواؤں گا۔ سید علی کو اس کی بیٹی کا بہتر مستقبل دوں گا۔ باقی تمام لوگ بھی میرے اس سیریل میں وہی کردار ادا کریں گے جو انہوں نے ادا کیا ہے اور اس طرح موم ایک مثالی سیریل ہوگا جس کا تعلق میرے اپنے وطن سے ہے، میں ان تمام لوگوں سے معذرت چاہتا ہوں اور ان کا شکر گزار بھی ہوں کہ انہوں نے اس کہانی کی تکمیل میں مدد دی اور درخواست گزار ہوں کہ خدارا زندگی کی حقیقتوں کو صرف ایک لائن میں مرکوز نہ کیجئے، اگر ہم اس لائن پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتے رہے تو کہانی کیا رہ جائے گی، پھر آپ یہ کہیں گے کہ

سیریل میں یکسانیت پیدا ہوگئی ہے، ارے بابا کہانی میں تو تھوڑا سا کہانی پن ہونا ہی چاہئے، خیر آپ کی دعاؤں کے ساتھ میں بہت جلد موم پر کام شروع کر رہا ہوں، میرے سیریل میں پریس کا تعاون بھی ضروری ہے۔"

آذر غیاث غوری خاموش ہوا۔ مہمانوں کا تاثر عجیب سا تھا، چند منٹ تو بالکل خاموشی طاری رہی، اس کے بعد تالیوں کا طوفان امڈ پڑا، لوگ آذر غیاث غوری کو مبارکباد دینے لگے۔ اس کہانی سے متعلق جو لوگ یہاں موجود تھے وہ شدید حیرت کا شکار تھے، باقی کو ابھی اس پریس کانفرنس سے آگاہ ہونا تھا اور اپنے اپنے کردار کیلئے تیار بھی۔

بعد میں کچھ اور کارروائیاں ہوئیں، مثلاً مرزا عرفان احمد نے سید علی کو فوراً ملازمت سے برخاست کر دیا، ان الفاظ کے ساتھ کہ یہ ایک وکیل کا دفتر ہے جہاں مؤکل اپنے اپنے راز لے کر آتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کو یہاں ایک منٹ نہیں رکھا جا سکتا جو اس قدر سازشی ہو۔

سرمد سے خود آذر غیاث غوری نے رابطہ کیا اور اس سے کہا:

"بیٹے! تمہارا مستقبل محفوظ ہے۔ میرے سیریل میں تمہیں ہیرو کا کردار ادا کرنا ہے اور میں تمہیں تمہاری زندگی کا اصلی ہیرو بنا دوں گا اصل میں زندگی ایک ڈرامہ ہے اور ہم سب اس میں کام کرنے والے اداکار، تکمیل تو بڑی ضروری چیز ہوتی ہے۔" سرمد کے ساتھ ساتھ رومانہ کو بھی آذر غیاث غوری نے تسلیاں دیتے ہوئے کہا:

"بیٹا! ڈرامہ تو صرف ڈرامہ ہوتا ہے، تم ایک بہت ہی نفیس لڑکی ہو، تم نے صحیح معنوں میں مجھے اس ڈرامے کا کلائمکس دیا ہے اس کے عوض میں تمہیں تمہاری پسند کی زندگی دوں گا۔ بہرحال موم پر مجھے ابھی کافی کام کرنا ہے۔ باقی تمام کرداروں کو بھی گھیر گھار کر اس سیریل کیلئے تیار کرنا ہوگا اور اب میں ان سے ملاقات کا سلسلہ شروع کرنے والا ہوں۔"

سرمد نے مسکرا کر رومانہ کو دیکھا اور رومانہ نے شرمائے ہوئے انداز میں آنکھیں جھکا لیں۔ تین چار دن کے بعد رومانہ اور سرمد کالج کیفے کی جانب بڑھ رہے تھے کہ طوطے والا بابا نگاہوں کے سامنے آیا اور انہوں نے وہاں رک کر ایک لفافہ طوطے سے کھلوایا۔ کاغذ کھولا اور پڑھا تو لکھا تھا کہ

"دنیا عالم اسباب ہے۔ یہاں ہر فعل سے پیشتر سبب کا ہونا قدرت کی حکمت ہے۔"

دونوں اس تحریر کو پڑھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ کالج کیفے کی طرف بڑھتے ہوئے رومانہ نے سرمد سے کہا۔

"اور طوطے والا بابا بھی ہماری اس سیریل کا اہم کردار ادا کرے گا۔"

"ارے ہاں غوری صاحب سے اس کا تذکرہ کرنا بھی بہت ضروری ہے۔" سرمد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

کوہسار باقی افغان باقی

رچرڈ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کا لطیف جذبہ جب اس کے دل کو چھوئے گا تو وہ وطن سے اس قدر دور ہوگا کہ وہاں اس کی یاد بھی پہنچنے میں وقت لے گی۔ محبت کے بارے میں اس کا تصور بھی وہی تھا جو کسی بھی دوسرے امریکن کا ہوسکتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی محبت کا دوسرا مطلب جسم کا ملاپ تھا۔ یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ جب وہ محبت کے حقیقی معنوں سے روشناس ہوگا تو اس علاقے میں ہوگا جہاں کے سیاہ پہاڑوں پر گھاس بھی نہیں اگتی۔

رچرڈ وہاں امن کے گیت نہیں گانے آیا تھا۔ وہ وہاں اس وقت پہنچا تھا جب موت کا کھیل ختم ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے اور دوسرے حصے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ رچرڈ وہاں پہنچا تو فضا میں بارود کی بو میں کسی حد تک کمی ضرور آئی تھی لیکن نہ ہوا میں موجود سسکیاں کم ہوئی تھیں اور نہ ہی آنکھوں کی وہ وحشت ختم ہوئی تھی جو موت کا

رقص دیکھنے والوں کی آنکھ میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وحشت کا قیام ان آنکھوں میں بھی تھا جن کے نصیب میں یہ دیکھنا لکھا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی گردن کٹی لاشوں کے جسموں میں پٹرول بھر جانے اور آگ لگنے کے بعد رقص کرتا ہوا دیکھیں اور ان آنکھوں میں یہ منظر بھی دیکھا کہ ان کا جشن فتح ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔شاید اس کی وجہ یہ تھی جشن منانے والوں کے لاشعور سے یہ بات نکل نہیں پا رہی تھی کہ ایسے جشن تو یہاں بارہا منائے گئے ہیں۔وہاں برسوں سے یہ ہوتا رہا تھا کہ فتح کا جشن منانے والوں کی آنکھوں سے ابھی فتح کا خمار ختم بھی نہیں ہو پاتا تھا کہ شکست کا طوق ان کے گردن میں آ جاتا تھا۔

رچرڈ نے وہاں آنے سے پہلے اپنی سی کوشش کر لی تھی کہ اسے افغانستان نہ آنا پڑے لیکن اس میں اسے بری طرح ناکامی ہوئی اور اس کی وجہ کچھ اور نہیں، اس کی وہ خوبی تھی جس کا ذکر رچرڈ کبھی بڑے فخر سے کرتا تھا۔اپنی آخری کوشش کی ناکامی کے بعد ہائی کمان نے اس کی طویل بیماری پر غور کرنے کی بجائے اسے فوری طور سے جوائن کرنے کا حکم دیا تو اس نے تنہائی میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود پر بری طرح لعنت ملامت کی تھی۔

”تم سالے! الو کے پٹھے تھے اور الو کے پٹھے رہو گے۔“ اس نے آئینے میں اپنے عکس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری پلاننگ ہمیشہ سے تھرڈ کلاس تھی اور تھرڈ کلاس رہے گی۔“ اس نے اپنے ہی عکس کو لعنت دکھاتے ہوئے کہا اور پھر عکس کی جانب پیٹھ کر لی۔

”غیر معروف زبانوں کے ماہر بنیں گے۔۔۔۔۔۔الو کے پٹھے۔“ اب وہ خود بڑبڑا رہا تھا۔

”اور تمہیں کیا ضرورت تھی مجھے اپنی زبانیں سکھانے کی۔“ اس نے کمرے میں لگی تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اس سے تو اچھا تھا کہ میں علاج کے دوران ہی سہراب خان کی طرح ختم ہو جاتا۔“ اس کے غصے کا رخ اب دوسری جانب ہو گیا تھا۔

”زندگی کا ہر مزہ ان خبیث ڈاکٹروں نے ختم کر دیا اور اب بری بھلی جو زندگی باقی ہے وہ یہ کمینے مجھے افغانستان بھیج کر ختم کر دیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے افسروں کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور تھک ہار کر نیا پیگ بنانے لگا۔

رچرڈ کی یہ بہت پرانی عادت تھی جو سہراب سے ملنے کے بعد ختم ہو گئی تھی لیکن سہراب کی موت کے بعد ایک بار پھر اس نے اپنی پرانی روش اپنا لی تھی کہ جب بھی وہ یہ سمجھتا کہ اسے کسی سے مشورہ چاہیے تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر خود سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ایسے مواقع پر اس کا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ایک حصہ اس کے ساتھ ہوتا تھا اور دوسرا حصہ عکس کے ساتھ چلا جاتا تھا۔

اپنی عادت اور منفرد رویوں کی وجہ سے کبھی بھی اس کا کوئی دوست ایسا نہ رہا تھا جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتا۔وہ اور سہراب خان ایک ہی کمرے میں ساتھ رہتے تھے، وہ سہراب خان کے اس قدر قریب ہو گیا تھا کہ اس سے ہر بات کہہ دیتا تھا۔

سہراب خان سے ملنے کے بعد اس کے بہت سے رویوں میں تبدیلی آئی تھی اسپتال کے بیڈ پر لیٹے ہوئے اس نے اپنی ماں سے رابطہ کیا تھا اور ماں اپنی بیماری کے باوجود اس سے ملنے بھی آئی تھی۔ابھی وہ اسپتال میں ہی تھا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور ماں کی تدفین میں وہ اسپتال سے خصوصی اجازت لے کر شریک بھی ہوا تھا جبکہ اس کی تینوں بہنوں میں سے کوئی بھی ماں کی تدفین کے لیے نہیں پہنچی تھی۔

اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے چاہا کہ بہنوں سے رابطہ رکھے لیکن بہنوں کے رویے کچھ اس طرح کے تھے کہ رچرڈ نے ان سے نہ ملنا مناسب سمجھا۔

انہیں اس بات کا یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایڈز کا کوئی مریض ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔سب سے چھوٹی بہن تو اس کا بھی یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ کبھی بھی اس عادت کا شکار نہیں رہا ہے جو ایڈز سے منسوب کی جاتی ہے۔رچرڈ کوشش کے باوجود بھی اس کا جواب نہیں بھول سکا تھا جو مارتھا نے یہ جاننے کے بعد کہ علاج کے دوران اسے جو دوائیں استعمال کروائی گئی تھیں ان کا سائیڈ افیکٹ یہ ہوا ہے کہ وہ مردانہ قوت کھو چکا ہے' اس کی بہن نے یہ الفاظ کہے تھے۔

"ایک طرح سے یہ اچھا ہوا کیونکہ مجھے تمہاری وہ وحشت یاد ہے جو تم نے میری اسکول کی ٹیچر کے ساتھ کی تھی۔" مارتھا نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

رچرڈ کا دل چاہا کہ وہ ایک بار پھر وہی کچھ دہرائے جو وہ برسوں پہلے کہہ چکا تھا کہ مس شارلین نے خود اسے وہ سب کچھ کرنے پر اکسایا تھا۔ یہ بھی مس شارلین ہی تھیں جنہوں نے اسے اسکول کے بعد گھر آنے کے لیے کہا تھا اور اس کے گھر پہنچنے کے بعد شارلین نے ہی اسے مرد بننے پر مجبور کیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ بعد میں وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا اور اسے ہوش اس وقت آیا جب مس شارلین اس کے سامنے بے ہوش پڑی تھیں اور شور کی آواز سن کر اس کے پڑوسی دروازہ بجا رہے تھے۔

اس وقت مس شارلین نے یہ کہہ کر معاملہ ختم کیا تھا کہ "وہ پولیس میں اس لیے نہیں جا رہی کہ اگر انہوں نے پولیس میں رپورٹ کروا دی تو رچرڈ کا مستقبل خراب ہو جائے گا" لیکن جب بات سکول تک پہنچی تو مس شارلین نے سارا الزام رچرڈ پر عائد کر دیا۔ سکول والوں نے بھی چالیس سالہ مس شارلین کی بات کو نوعمر رچرڈ کے مقابلے میں زیادہ معتبر سمجھا تھا۔

نیویارک پہنچنے کے بعد کچھ ہی عرصے میں وہ نیویارک کے رنگ میں رنگتا چلا گیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا مقصد کمانا اور موج اڑانا تھا۔ اسی دوران اسے ایک بار میں نوکری مل گئی جہاں صرف ملاح آتے تھے اور یہیں سے نوکری کیلئے نئی نئی زبانیں سیکھنے کا شوق ہوا تھا۔ اس نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ گاہک سے اسی کی زبان میں بات کی جائے تو زیادہ ٹپ دیتا ہے۔

اس کی یہی خوبی اسے پہلے ایک فائیو سٹار ہوٹل کے کاونٹر اور پھر فوج میں لے گئی تھی۔ اس کی پوسٹنگ فوج کے اس شعبے میں تھی جہاں پر دنیا بھر کے اخبارات اور رسائل میں سے فوج کے کام کی چیزوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔

رچرڈ کو یہ نوکری اس لیے زیادہ پسند تھی کہ اس طرح اسے اپنے مشاغل کے لیے بہت وقت مل جاتا تھا۔ ایڈز کا شکار ہونے تک اس کے مشاغل عورت، شراب اور مطالعے تک محدود تھے لیکن ان تین دلچسپیوں میں بھی وہ شراب اور مطالعے کے بغیر

رہ سکتا تھا لیکن عورت کے بغیر اسے اپنی دنیا ویران محسوس ہوتی تھی۔ جب تک اس کی وحشت کی شہرت نہیں تھی، اس مشغلے کو پورا کرنے میں اسے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی تھی کیونکہ نہ صرف وہ ایک سمارٹ شخص تھا بلکہ اسے باتیں بنانا بھی خوب آتی تھیں لیکن ایک بار اس کے وحشیانہ عمل کی شہرت ہوئی پھر اسکی جان پہچان کی اکثر عورتیں اس سے کترانے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رچرڈ کو شکار کے لیے نئی جگہوں پر جانا پڑتا تھا اور اسی بے احتیاطی میں وہ ایڈز جیسی مہلک بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔

رچرڈ نے اپنے ایچ آئی وی پازیٹیو ہونے کی خبر سن کر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ پورے سکون کے ساتھ موت کا انتظار کرنے لگا تھا۔ ایسے میں اس کے ڈاکٹر نے ایک نئی دوا کے لیے اس کا نام تجویز کر لیا جسے رچرڈ نے یہ سوچ کر قبول کر لیا کہ جب مرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ کسی تجربہ کا حصہ بن جائے۔ اس کے نزدیک دونوں صورتوں میں فائدہ تھا۔ دوا اثر کر جاتی تو اس کی جان بچ جاتی لیکن دوا اثر نہ کرتی تب بھی تاریخ میں اس کا نام آ جاتا۔

دنیا بھر سے دس افراد نے خود کو اس تجربے کے لیے پیش کیا تھا۔ علاج کے دوران تمام مریضوں کو دور دور کے پانچ مختلف سنٹروں میں رکھا گیا تھا لیکن طویل اور صبر آزما علاج کے بعد وہ دوا جو چھوٹے جانوروں میں کارآمد پائی گئی تھی۔ اس کے نتائج انسانوں میں ویسے نہیں رہے تھے۔ زندہ بچنے والا صرف رچرڈ تھا جبکہ باقی تمام افراد علاج کے دوران ہی ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے۔

رچرڈ کا اس فارماسیٹیکل کمپنی پر دعویٰ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جس کی دوا نے اس کی جان تو بچائی تھی لیکن اس کے استعمال سے وہ اپنی قوت کھو چکا تھا لیکن اس کمپنی نے خود ہی رچرڈ کو اس کی زندگی کی آخری سانس تک ماہانہ ایک معقول رقم کی آفر کی تھی۔

رچرڈ اپنی حس حماقت پر نالاں تھا۔ وہ اس رقم کے بعد دوبارہ ڈیوٹی جوائن کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوٹی جوائن کرتے ہوئے اس کی نظروں میں صرف یہ بات تھی کہ اس طرح سے نہ صرف دن کا اچھا خاصا وقت گزر جایا کرے گا بلکہ وزارت دفاع کی لائبریری

سے کتابیں بھی حاصل کرلیا کرے گا۔اس وقت اس کے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا کہ ممکن ہے وہ وزارت دفاع کے کسی بڑے کی نگاہوں میں آجائے کیونکہ اس نے نہ صرف عربی، فارسی اور پشتو پر عبور حاصل کرلیا تھا بلکہ ان علاقوں کے بارے میں وہ بہت کچھ پڑھ بھی چکا تھا۔سہراب خان کے ساتھ رہنے کے دوران جو حیرت انگیز معلومات اسے ملی تھیں، وہ اس کے علاوہ تھیں۔

"الو کا پٹھا! ملٹری اتاشی بننے چلا تھا۔" اپنے ہاتھ میں نیا پیگ لے کر وہ ایک بار پھر آئینے کے سامنے آ گیا اور اب اپنے عکس سے مخاطب تھا۔آئینے کے سامنے پہنچ کر اس کا ذہن ایک بار پھر دو حصوں میں بٹ گیا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ پوسٹنگ تمہاری کامیابی کی پہلی سیڑھی ہو۔" اس کے عکس نے اسے جواب دیا اور رچرڈ چونک گیا۔

"زندہ بچنے کی صورت میں یہ پہلی سیڑھی ہو گی اگر زندہ ہی نہ بچا تو۔۔۔" اس نے اعتراض کیا۔

"ایک بار موت نے تمہیں وہاں سے واپسی کا راستہ دکھایا ہے جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا پھر بھی ایسی بات کر رہے ہو؟" اس کے عکس نے طنزیہ انداز میں سوال کیا اور رچرڈ خاموش ہوگیا۔

"وہ بہت سخت جان لوگ ہیں۔" رچرڈ نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"ان کی تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کوئی بھی ان کے علاقے پر قابض نہیں ہو سکا۔" رچرڈ نے وہی کچھ کہا جو اس نے کتابوں سے پڑھا تھا یا پھر سہراب خان نے اسے بتایا تھا۔

"تمہیں کون سی وہاں زندگی بسر کرنی ہے۔" عکس نے جواب دیا۔

"یہ بات بھی صحیح ہے۔" رچرڈ اب خود کو مطمئن کرنے پر اتر آیا تھا۔

"سال بھر کی بات ہے اور اگر میں نے اپنے کام سے حکام کو مطمئن کر دیا تو کامیابی کی نئی شاہراہیں کھل سکتی ہیں۔" اس نے بظاہر اپنے عکس سے اتفاق کیا لیکن وہ خود کو ذہنی طور پر آمادہ کر رہا تھا۔

رچرڈ افسران کو خوش کرنے کے ارادے کو مزید مستحکم کر کے روانہ ہوا تھا لیکن پہلے ہی مرحلے پر اسے ناکامی ہوئی۔

امریکا سے انہیں قطر پہنچایا گیا تھا جہاں خصوصی ٹریننگ کے نام پر انہیں علاقہ، روایات اور موسم کے نام پر لیکچر دیئے جانے تھے لیکن جو شخص سب سے پہلے لیکچر دینے آیا رچرڈ اسی سے الجھ گیا اور پھر یہ بات اتنی بڑھی کہ ٹرینز کی شکایت پر اسے کمانڈر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

"سر! میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ جس علاقے میں دشمنیاں ورثے کے طور پر منتقل ہوتی ہوں۔ وہاں پر وقتی کامیابی کو مستقل کامیابی نہ سمجھا جائے۔" رچرڈ نے ٹرینز کی موجودگی میں کمانڈر سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ ہمارا حشر بھی روس کی طرح ہو گا۔" کمانڈر نے استہزائیہ انداز میں کہا لیکن رچرڈ کے جواب نے کمانڈر کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"روس کی سرحدیں ملتی تھیں اس لیے اسے واپسی میں آسانی ہو گئی تھی۔" رچرڈ کا جواب تھا۔

"روس کے مقابلے میں ہم نے ان کی مدد کی تھی۔" کمانڈر نے اس بار سنجیدہ لہجہ اختیار کیا۔

"ہمارے مقابلے میں کون مدد کرے گا؟" کمانڈر نے سوال کیا اور رچرڈ کا دل چاہا کہ وہ جواب دینے سے پہلے ایک قہقہہ لگائے۔

"سر! میرے خیال سے آپ یہ بھول گئے ہیں کہ روس کے خلاف ہماری پہلی مدد دو سال بعد کی گئی تھی۔" رچرڈ نے کہا اور کمانڈر نے اس انداز میں اسے دیکھا جس میں رچرڈ کیلئے ستائش تھی۔

"آپ اس حقیقت کو بھی فراموش کر رہے ہیں کہ وہ لوگ صدیوں سے اپنا اسلحہ خود بنا رہے ہیں لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ روس کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ ناتجربے کار تھے جبکہ بیس برس کی طویل جنگ نے انہیں دنیا کی ہر فوج سے لڑنے والا

گوریلا فائیٹر بنادیا ہے۔"

رچرڈ نے کہا اور کمانڈو اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کسی معزز شخص کو دیکھ رہا ہو۔

"کہیں تم یہ کہنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو کہ امریکی فوج کی کامیابیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔" کمانڈو نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ماضی کی طرح ان کامیابیوں کی مستقل حیثیت نہیں ہے۔" رچرڈ نے ایک لمحے کی تاخیر کے بعد جواب دیا۔

"تو ہم یہاں وقت ضائع کر رہے ہیں۔" ٹریز جواب تک خاموش رہا تھا' اب چپ نہیں رہ سکا۔

"مستقل حیثیت تو شاید ہمارے بڑے بھی نہیں دینا چاہتے ہیں۔" رچرڈ نے ٹریز کی جانب رخ کر کے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ ٹریز کا مذاق اڑا رہا ہو۔

"ہمارے پالیسی ساز ان کامیابیوں کو صرف اس وقت تک طوالت دینا چاہتے تھے، جب تک امریکی مفاد اس خطے سے وابستہ ہے۔" رچرڈ نے کہا اور پھر اس سے پہلے کہ کمانڈو اس سے سوال کرتا کہ "وہ کون سے مفادات ہیں جو امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک کے غیر آباد اور اجاڑ پہاڑوں سے وابستہ ہیں؟" رچرڈ نے خود ہی کہنا شروع کر دیا اور پھر بہت دیر تک بولتا رہا۔

رچرڈ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس بک بک کے کیا نتائج نکلیں گے لیکن وہ صرف اس لیے بولتا رہا کہ کمانڈو نے نہایت دلچسپی سے اس کی گفتگو سنی تھی۔

اگلے تین روز رچرڈ نے ٹریننگ کے نام پر ہی گزارے لیکن اب اس کی حیثیت میں ایک واضح فرق آ گیا تھا۔ اب ایک طرف سے وہ غیر اعلان شدہ ٹریز بن چکا تھا۔

رچرڈ کا خیال تھا کہ شاید اسے قطر میں روک لیا جائے اور اسے پرانے ٹریز کے معاون کی ڈیوٹی دے دی جائے لیکن تین روز بعد جب اسے اس کی نئی ذمے داریوں سے آگاہ کیا گیا تو رچرڈ کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ افغانستان نہ جا کر کتنی بڑی

غلطی کر رہا تھا۔

رچرڈ کی نئی ذمے داریوں کے مطابق اب وہ افغانستان میں متعین کمانڈو کا پی اے تھا لیکن یہ عہدہ اسے اس لیے دیا جا رہا تھا کہ کمانڈو کے ساتھ میٹنگ میں موجود رہے۔ اسے بظاہر انجان بن کر کمانڈو سے ملنے والوں کی آپس میں گفتگو بھی سننی تھی۔

اسی روز اس نے تنہائی میں ایک بار پھر خود سے باتیں کی تھیں اب وہ خود کو الو کا پٹھا نہیں کہہ رہا تھا۔ اسی روز اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر اپنی عمدہ پلاننگ کی شان میں خوب قصیدے پڑھے تھے۔

"تم نے دیکھا میرا ہر فیصلہ صحیح تھا۔" اس نے نشے میں جھومتے ہوئے اپنے عکس کو مخاطب کیا۔

"فوج سے ریٹائرمنٹ نہ لینے کا بھی اور افغانستان جانے کا بھی بلکہ اس سے پہلے کا وہ فیصلہ بھی صحیح تھا کہ مجھے نت نئی زبانیں سیکھنی چاہئیں۔" وہ خوش تھا اور یہ خوشی کسی اور بات کی نہیں بلکہ نئی زندگی میں اپنی پہلی کامیابی پہ تھی پھر اسی خوشی میں اسے سہراب خان یاد آ گیا۔

"اس نے مرنے میں بہت جلدی کر دی۔" رچرڈ نے سہراب خان کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

"وہ زندہ ہوتا تو میرا سب سے بڑا مددگار ہوتا۔" وہ بڑبڑایا لیکن پھر اسے یاد آیا کہ سہراب خان سے جب وہ ملا تھا تب سہراب خان خاصا مذہبی ہو چکا تھا۔ حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ ایڈز کا شکار ہونے سے پہلے وہ مذہب سے بہت دور تھا۔

"میں اس عذاب کا شکار اس لیے ہوا ہوں کہ میں اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور ہو چکا تھا۔" سہراب خان اس سے اکثر کہتا تھا۔

"اگر مذہب پر عمل کرتے تو بیمار نہ ہوتے؟" رچرڈ اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہتا اور سہراب خان اثبات میں سر ہلا دیتا۔

"مذہب پر عمل کر رہا ہوتا تو نشہ اور حرام کاریوں سے دور ہوتا اور ظاہر ہے

بیوی کے علاوہ ہر عورت سے دور ہونے کا مطلب تو یہی تھا کہ میں ایچ آئی وی کا شکار نہ ہوتا۔'' سہراب خان کہتا تھا۔

''بیوی یا بیویاں؟'' رچرڈ تفریح کے موڈ کے حوالے سے سوال کرتا اور سہراب خان سنجیدہ ہو جاتا۔

''کم از کم تمہیں تو یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔'' سہراب خان کا جواب ہوتا اور رچرڈ کو خاموش ہو جانا پڑتا تھا۔

رچرڈ کی اپنی مذہبی معلومات کچھ زیادہ نہیں تھیں یہ کہنے کے باوجود کہ ''امریکا آنے کے بعد میں مذہب سے دور ہوتا چلا گیا ہوں۔'' سہراب خان کی مذہبی معلومات تھیں۔ کم از کم رچرڈ کو یہی محسوس ہوتا تھا اور اس میں کچھ اضافہ اس وقت ہوا جب وہ دونوں ایک ساتھ مقیم تھے۔

رچرڈ نے ڈیوٹی جوائن کی تو اسے احساس ہوا کہ اس کی ڈیوٹی کتنی اہم تھی۔ لمحہ لمحہ بنتی بگڑتی صورتِ حال میں اسے احساس ہوا کہ معاملات اس سے کہیں زیادہ گھمبیر ہیں جتنا وہ وہاں پہنچنے سے پہلے سمجھ رہا تھا۔ اس بات کا احساس بھی اسے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے کے بعد ہوا' ہر وقت اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے والوں کے مفادات بھی کچھ اور تھے۔

امن و امان کی صورتحال بھی اس سے کہیں زیادہ خراب تھی جو انہیں دور بیٹھ کر نظر آتی تھی۔ کیمپ سے باہر کی زندگی تو غیر محفوظ تھی ہی لیکن کیمپ کے اندر کی صورتحال بھی کچھ اتنی زیادہ بہتر نہیں تھی۔ موت کا خوف ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود رچرڈ خوش تھا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی وہ کمانڈر کا سب سے اہم مشیر بن چکا تھا۔ کمانڈر اس سے ہر اہم اور غیر اہم معاملے کو آگے بڑھانے سے پہلے مشورہ ضرور کرتا تھا۔ اب تنہائی میں جب بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا تو یہ ضرور کہتا کہ

''اگر میں افغانستان نہ آتا تو میری زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی۔''

افغانستان نہ آنے کی صورت میں زندگی بے معنی ہو جانے کا احساس اسے

اس وقت بھی ہوا جب اس نے پہلی بار پلوشہ کو دیکھا تھا۔

پلوشہ' ایک بوڑھی عورت جو حلیے سے اس کی نوکرانی لگتی تھی کے ہمراہ کمانڈر سے ملنے آئی تھی لیکن اس روز کمانڈر طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ جب تک کمانڈر کے آنے کی امید تھی رچرڈ نے اسے اپنے کمرے میں ہی بٹھایا تھا۔ جب کمانڈر نے اسے بتایا کہ وہ آج دفتر آئے گا ہی نہیں، تو رچرڈ نے پلوشہ کو نہایت نرم لہجے میں بتایا کہ کمانڈر صاحب نہیں آرہے ہیں تو رچرڈ نے دیکھا کہ پلوشہ کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔

''کیا کل وہ ضرور آئیں گے؟'' پلوشہ نے اپنی جگہ سے اٹھنے سے قبل خالص امریکن لہجے میں سوال کیا تھا اور رچرڈ مسکرا دیا تھا۔

''میں حتمی طور پر یہ بات کس طرح کہہ سکتا ہوں۔''

اس نے گیند ایک بار پھر پلوشہ کی کورٹ میں پھینک دی تھی۔ پلوشہ اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے رہ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ ملنے شروع کر دیے۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' پلوشہ کے ساتھ آئی ہوئی عورت نے پشتو میں سوال کیا جس پر پلوشہ نے پہلے تو کمانڈر کے نہ آنے کی اطلاع دی اور پھر ایک ایسی بات کہی کہ رچرڈ بل کھا کر رہ گیا۔

''پتا نہیں جھوٹی قوم کا نمائندہ اس موقع پر بھی سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔'' پلوشہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''مگر بیٹی! کل تک تو بہت دیر بھی ہو سکتی ہے۔'' بوڑھی عورت نے پلوشہ سے کہا۔

''آپ ہی بتائیں اب میں کیا کر سکتی ہوں؟'' پلوشہ نے بے بسی سے ایک نظر رچرڈ پر ڈالنے کے بعد جواب دیا اس مرحلے پر رچرڈ بھی ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا۔

''اگر میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں تو میری خدمات حاضر ہیں۔'' اس نے کہا اور پلوشہ اسے اس انداز میں دیکھنے لگی جیسے یہ فیصلہ کر رہی ہو کہ وہ رچرڈ سے

بات کرے بھی یا نہیں۔

''میں اپنے بھائی کے سلسلے میں آپ کی مدد لینے آئی تھی کیونکہ میرا خیال ہے کہ ایک امریکی شہری ہونے کے حوالے سے یہ میرا حق بنتا ہے۔'' پلوشہ نے کہا تو رچرڈ کا دل چاہا کہ اس سے کہہ دے کہ چند لمحے پیشتر وہ اسے چھوٹی قوم کا نمائندہ قرار دے چکی تھی۔

''کیا آپ امریکن ہیں؟'' رچرڈ نے سوال کیا اور پلوشہ نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''میری پیدائش امریکا کی نہیں ہے لیکن مجھ سے چھوٹی بہن اور ایک بھائی امریکہ میں ہی پیدا ہوئے تھے۔''

پلوشہ نے جواب میں کہا اور رچرڈ کے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے سوالات پیدا ہوئے تھے۔

''ہمارا خاندان اٹھارہ برس امریکا میں گزارنے کے بعد وطن واپس آیا تھا۔''

رچرڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے پلوشہ نے اس کے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کو پڑھ لیا ہو۔

''یہ ایک الگ موضوع ہو جائے گا۔ اگر میں آپ سے پوچھوں کہ اتنا طول عرصہ وہاں گزارنے کے بعد آپ کا خاندان یہاں کیوں منتقل ہوگیا۔'' رچرڈ نے کہا اور پلوشہ کے چہرے پر اس نے پہلی بار ایک نرمی پیدا ہوتے ہوئے دیکھی تھی۔ ورنہ تو اس کے چہرے پر رچرڈ کو ایک نامعلوم سی سختی کا احساس ہوا تھا۔ ایک ایسی سختی جو کسی بھی شخص کو اس سے غلط بات کرنے سے روکتی تھی۔

''فی الحال تو آپ یہ بتائیں کہ آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں کی تاکہ میں یہ دیکھ سکوں کہ کمانڈر کی غیر موجودگی کے باوجود آپ کی کوئی مدد کی جاسکتی ہے یا نہیں۔'' رچرڈ نے کہا لیکن پلوشہ نے فوری طور پر اس کا جواب نہیں دیا۔

''میں اپنا مسئلہ بتانے سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ وہ ترقی یافتہ ملک چھوڑ کر اس جنگ سے تباہ علاقے میں کیوں آئے تھے۔ اس طرح سے آپ کو

شاید میرے مسئلے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔'' پلوشہ نے کہا اور رچرڈ نے یوں کاندھے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ اگر

''تم یہی سمجھتی ہو تو تمہاری مرضی۔''

''میرے والد صاحب سرجن ہیں اور نیویارک کے سٹی ہاسپٹل میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھے۔'' پلوشہ نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ رچرڈ خود کو کہنے سے نہ روک سکا۔

''میرا تعلق بھی نیویارک سے ہے۔''

پلوشہ اس بات پر دھیرے سے مسکرائی لیکن کوئی تبصرہ کرنے سے اس نے گریز کیا۔

''روس کی افغانستان میں آمد کے ساتھ ہی ہم کابل سے پشاور منتقل ہوگئے تھے یہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد میرے والد نے اسلام آباد میں ملازمت کر لی۔ اس کے بعد میرے والد اور پھر ہم سب امریکا چلے گئے۔ جہاں پہلے ہوسٹن پھر میامی اور پھر آخر کے بارہ برس ہم نے نیویارک میں گزارے۔'' پلوشہ نے اپنے خاندان کے بارے میں بتایا اور ایک مرحلہ مکمل کر کے وہ کچھ دیر کے لیے رکی تھی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگوں نے روس کے خلاف ہونے والے جہاد میں حصہ نہیں لیا۔'' رچرڈ نے پلوشہ کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا اور پلوشہ کے چہرے کی نرمی ایک بار پھر سختی میں بدل گئی۔

''یہ بات صحیح ہے کہ میرے والد نے امریکی مفادات کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن اس کی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ ہمارا چھوٹا ہونا اور میری دادی کا اپاہج ہونا تھا۔'' رچرڈ کو محسوس ہوا کہ یہ جواب دیتے ہوئے پلوشہ کے لہجے میں بھی سختی آ گئی تھی۔

''وہ ویسے بھی ایک ایسے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں جس شعبے کے ہاتھوں میں بندوق کچھ سجتی نہیں ہے۔'' رچرڈ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے حساب برابر کرنے کی کوشش کی لیکن پلوشہ کے چہرے کی سختی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"ہماری روایات کے مطابق بندوق مرد کے لباس کا ایک حصہ ہوتی ہے۔" پلوشہ نے اسی ٹھوس لہجے میں کہا جس میں وہ اس وقت گفتگو کر رہی تھی۔

"اس موضوع پر ہم پھر کبھی بات کر لیں گے۔ فی الحال تو ہم اصل موضوع کی جانب آتے ہیں۔" رچرڈ کو احساس ہو گیا تھا کہ بات بگڑی جا رہی ہے اس لیے اس نے موضوع تبدیل کرنا چاہا اور اس نے محسوس کیا کہ خود پلوشہ بھی یہی چاہ رہی ہے۔

"میرے والد کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے اپنے لوگوں کو ایسے موقع پر چھوڑ دیا جب وہ ان کی بہتر طور مدد کر سکتے تھے لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تھے۔ بلکہ اگر یہ کہوں کہ قابض فوجوں کی واپسی کے بعد حالات اور زیادہ برے ہو گئے۔ تب بھی غلط نہیں ہوگا پھر جیسے ہی امن و امان کی صورت حال بہتر ہوئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا اور ہم اپنے وطن لوٹ آئے۔" پلوشہ نے مختصر لفظوں میں بات مکمل کی تھی۔

"اب ہم آتے ہیں اس موضوع کی جانب جس کی وجہ سے آپ یہاں تشریف لائی ہیں۔" رچرڈ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"میرا بھائی ہرات میں تھا جب ہرات میں آپ کی فوجیں داخل ہوئی تھیں۔" پلوشہ نے کہا اور رچرڈ نے یوں سر ہلایا جیسے بات سمجھ گیا ہو۔

"طالبان کی فوجوں کے ساتھ القاعدہ کے لوگوں کے ساتھ۔۔۔۔؟" اس نے پلوشہ کی گفتگو کو کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"نہ طالبان کے ساتھ نہ القاعدہ کے ساتھ، وہ بھی وہاں ڈاکٹر تھا لیکن آپ کی اتحادی فوجوں کے داخلے سے قبل ہی وہ وہاں زخمی ہو گیا تھا اور اپنے ایک دوست کے گھر میں تھا جہاں سے اسے گرفتار کیا گیا تھا۔" پلوشہ نے کہا۔

"کس الزام کے تحت؟" رچرڈ نے سوال کیا اور پلوشہ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا آج کل افغانستان میں کسی کو بھی گرفتار کرنے کے لیے کوئی الزام ضروری ہے جبکہ میں اس وقت کی بات کر رہی ہوں جب بمباری ختم ہوئے ابھی پندرہ

دن ہی ہوئے تھے۔" پلوشہ نے کہا

"تمہارا مطلب ہے کہ جنگ ختم ہونے کے پندرہ دن بعد اسے گرفتار کیا گیا تھا؟" رچرڈ نے سوال کیا اور پلوشہ نے اس کا جواب دینے سے پہلے رچرڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔

"جنگ اس وقت ختم ہوتی ہے آفیسر جب ایک فریق ہتھیار ڈال دیتا ہے۔" پلوشہ نے کہا رچرڈ کو اس لہجے میں چٹانوں کی سختی محسوس ہوئی۔

رچرڈ نے چاہا کہ وہ پلوشہ سے کہے کہ بہتر ہوگا وہ اس طرح کی باتیں نہ کرے کیونکہ اس طرح کی گفتگو اس کے کیس کو خراب کر سکتی ہے لیکن پلوشہ پر ایک نظر ڈالنے کے ساتھ ہی اسے اپنا ارادہ ملتوی کر دینا پڑا کیونکہ پلوشہ کی آنکھوں میں اسے جیت کا یقین دکھائی دے رہا ہے۔

"اس بات کو تو کافی دن گزر گئے۔ آپ لوگوں نے اب تک کیا کیا۔" رچرڈ نے ایک بار موضوع پھر تبدیل کرنا چاہا اور پلوشہ کے جواب نے اسے اطمینان دیا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔

"کچھ دن تک ہمیں یہی معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے پھر جب اس کے ساتھ قید رہنے والا شخص رہا ہو کر آیا تو اس نے ہمیں بتایا کہ امان اللہ کہاں قید ہے۔ ہم نے ان لوگوں سے رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھائی امان کے لیے رقم مانگی وہ اتنی زیادہ تھی کہ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں مزید مشکلات سے ہم یوں بھی شکار ہوئے کہ بمباری کے دوران میرا بھائی شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اس کی جانب سے کچھ سکون ہوا ہی تھا کہ میرے والد کو گرفتار کر لیا گیا اور تا حال وہ ایک طرح سے گرفتار ہیں اگرچہ امریکی فوجیوں کے زیر نگرانی چلنے والے اسپتال میں ان سے کام لیا جا رہا ہے۔" پلوشہ نے ایک ساتھ اپنی مشکلات اسے بتائیں۔

"آپ کا بھائی امان کس کی قید میں ہے؟" رچرڈ نے پوچھا۔

ازبک کمانڈر ابراہیم کی قید میں ہے لیکن پرسوں اس نے ایک ایسی بات کہی ہے جس کے بعد میں یہاں آنے کے لیے مجبور ہو گئی ہوں۔" پلوشہ نے کہا اور رچرڈ

چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ جس شخص کا پلوشہ نے نام لیا تھا' وہ کمانڈر کے قریب سمجھا جاتا تھا اسی لیے کمانڈر اس کے بارے میں کی جانے والی بہت سی شکایتوں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

''اس نے ہمیں دو دن کا وقت دیا تھا کہ ہم چھوٹی بہن کی شادی اس سے کر دیں اور جواب میں وہ امان بھائی کی رہائی کی رقم آدھی کر دے گا۔'' پلوشہ کے دل میں نفرت تھی۔

''اس بوڑھے کا کیا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' رچرڈ اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔

''خود کو فاتح سمجھنے والوں کے دماغ پر جب فتح کا نشہ سوار ہوتا ہے تو وہ اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔'' پلوشہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں کمانڈو سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔'' رچرڈ نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے اپنے لہجے میں کچھ زیادہ اعتماد نہیں تھا۔

''جو دھمکی اس نے ہمیں دی ہے اس میں اس نے واضح طور پر کہا تھا کہ اگر ہم نے امریکیوں سے رابطہ کیا یا اس کی شکایت کرنے کی کوشش کی تو وہ نہ صرف امان بھائی کو قتل کر کے اس بات سے انکار بھی کر دے گا کہ اس نے کبھی امان بھائی کو گرفتار کیا تھا بلکہ میری بہن کو بھی اسی طرح غائب کر دے گا کہ ہم اس کی شکل دیکھنے کو ترس جائیں گے۔'' رچرڈ نے اس بار بھی پلوشہ کو غور سے سنا وہ یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ ''اس کے باوجود بھی اس نے یہاں آنے کا خطرہ کیوں مول لیا۔''

''ایک صورت ہو سکتی ہے۔'' رچرڈ کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔

''میں اس بوڑھے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے خاندان کو امریکا سے میرا مطلب ہے نیویارک سے جانتا ہوں۔'' رچرڈ کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔

''وہ یہ بات مان لے گا؟'' پلوشہ نے یقین نہ کرنے کے انداز میں کہا۔

''اسے یقین کرنا پڑے گا۔'' رچرڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

کہا۔

وہ بنیادی طور پر بزدل شخص ہے جس کا بنیادی وصف خوشامد ہے۔'' رچرڈ نے کہا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے پلوشہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا ہو جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ جو کچھ وہ سن رہی ہے وہ رچرڈ یعنی میں کہہ رہا ہوں۔

رچرڈ نے اس کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنی دراز کھولی اور اس کے ساتھ ہی اس نے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ وہ جانتا تھا کہ ابراہیم کابل میں ہی ہے کیونکہ ایک روز قبل ہی وہ کمانڈو سے ملا تھا۔ بظاہر وہ صرف ملنے آیا تھا لیکن درحقیقت اسے شکایت تھی کہ اپنی وفاداروں کے بارے میں ثبوت دینے کے باوجود اسے کوئی عہدہ نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ ان لوگوں کو اہمیت دی جا رہی ہے جن کی وفاداریاں اس کے مطابق اب بھی القاعدہ کے ساتھ ہیں۔

رچرڈ نے تین مختلف جگہوں پر فون کیے لیکن تینوں جگہوں سے ہی یہ معلوم ہوا کہ ابراہیم وہاں نہیں ہے۔ ایک جگہ سے البتہ یہ معلوم ہوا تھا کہ ابراہیم کچھ دن پہلے وہیں تھا لیکن اب جہاں گیا ہے وہاں فون نہیں ہے۔

''ابراہیم کی تلاش میں اس کے اپنے لوگ نکل گئے ہوں گے اور جونہی اسے پیغام ملے گا وہ دوڑا چلا آئے گا۔''

رچرڈ نے پلوشہ کو اطمینان دلانے والے انداز میں کہا لیکن پلوشہ نے آہستگی سے پشتو میں ''کتا'' کہا۔ جسے رچرڈ نے سنا بھی سمجھا بھی لیکن انجان بنا رہا۔

''کچھ کہا آپ نے۔'' رچرڈ نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' پلوشہ نے فوری طور پر کہا۔

''میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ گھر پر لوگ میری اتنی دیر غیر حاضری سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' پلوشہ نے بات بنانے کی کوشش کی۔

آپ چاہیں تو گھر چلی جائیں۔'' رچرڈ نے کہا لیکن پلوشہ کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے۔

"اگر آپ کے پاس گاڑی نہیں ہے تو میں آپ کو بھجوا دیتا ہوں اور ابراہیم سے بات کرنے کے بعد اسے لے کر آپ کے گھر آتا ہوں تاکہ اسے یقین آجائے ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" رچرڈ نے کہا لیکن پلوشہ اس کے بعد بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔

آپ کس طرح اسے یقین دلا سکیں گے جبکہ آپ تو والد کا نام بھی نہیں جانتے؟" پلوشہ نے کہا اور رچرڈ ہنس دیا۔

"میرے خیال میں ابراہیم کی اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال جواب کر سکے۔" رچرڈ نے کہا اور پلوشہ نے اس کے ساتھ ہی برا سا منہ بنایا۔

"تم امریکن چند چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر ہر معاملے میں ضرورت سے زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کرنے لگے ہو۔" پلوشہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کچھ دیر پہلے تم خود کو امریکن کہہ چکی ہو۔" رچرڈ اس بار کا طنز برداشت نہیں کر سکا۔

"میرا شمار تم ان کروڑوں امریکنوں میں کر سکتے ہو جو تاریخ سے واقف ہیں اور جو یہ بات بھی جانتے ہیں کہ قدرت ہر چیز معاف کر دیتی ہے غرور اور تکبر معاف نہیں کرتی ہے۔" پلوشہ نے فوری طور پر جواب دیا۔

"تم ڈرانے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہو۔" رچرڈ نے مذاق اڑانے والا انداز اختیار کیا۔

جو انداز تمہارا اور تم جیسے سینکڑوں امریکیوں کا ہے' وہ تاریخ میں کوئی نیا انداز نہیں ہے لیکن ان سب کا کیا حشر ہوا وہ بھی تاریخ میں درج ہیں اور ہم جیسے لوگ اسی حشر سے خوف زدہ ہیں۔" پلوشہ نے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔

چلیے، میں آپ کی بات مان لیتا ہوں اور خود آپ کو ڈراپ کرنے چلا جاتا ہوں۔ آپ راستے میں مجھے تفصیل بتا دیجئے گا۔" رچرڈ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

رچرڈ کے اٹھ جانے کے باوجود وہ چند لمحے اپنی جگہ پر بیٹھی رہی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اٹھتے ہوئے اس نے پشتو میں اپنے ساتھ والی عورت سے کہا

"یہ آفیسر شاید نہیں چاہتا ہے کہ ہم اس وقت یہاں موجود ہوں جب وہ یہاں آئے۔"

رچرڈ اس کے اندازے کے درست ہونے پر حیران تھا لیکن اس کی پشتو کو داد نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس کا اپنا راز فاش ہو جاتا۔

"یہ بھی پتا نہیں ہے کہ یہ شخص بھی اپنے قول میں کتنا سچا ہے۔" پلوشہ کے ساتھ اس عورت نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تھا لیکن پلوشہ نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا' اسے سن کر رچرڈ کا دل خوش ہو گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ آفیسر ہماری مدد کرنا چاہتا ہے لیکن اب وہ کمینہ اس کی بات کب تک سنتا ہے۔" پلوشہ نے اپنے اندیشے کا اظہار بھی کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی رچرڈ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب چاہے کچھ بھی کرنا پڑے وہ ابراہیم سے اپنی بات منوا کر ہی دم لے گا۔

پلوشہ کے گھر کا راستہ خاصا طویل تھا لیکن پلوشہ کی باتوں میں راستے کی طوالت کا احساس بھی نہیں رہا۔ اس نے ہر وہ بات بتا دی تھی جو ضروری تھا اور رچرڈ نے بھی اس کی گفتگو پوری توجہ سے سنی تھی۔

وہ گھر پہنچے تو پلوشہ نے اسے گھر میں آنے کی دعوت دی لیکن رچرڈ نے انکار کر دیا۔

"ہو سکتا ہے شام میں آنا ہی پڑے۔" اس نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

گھر میں جاتے ہوئے اگر پلوشہ کی گفتگو نے راستے کے طویل ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا تھا تو واپسی کے سفر میں پلوشہ کی یاد نے یہ احساس ختم کر دیا تھا۔

رچرڈ کو خود اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس طرح کا برتاؤ کیوں کر رہا ہے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ پلوشہ وہ لڑکی ہے جسے دیکھ کر، جس سے مل کر اور جس سے باتیں کرنے کے بعد اس کے ذہن میں کوئی حیوانی جذبہ نہیں جاگا۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا یہاں تک کہ علاج سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ صرف دکھاوے کا مرد رہ گیا تھا۔ یہ حیوانی جذبات بالکل ختم نہیں ہوئے تھے لیکن اپنی کمزوری یاد آنے

پر وہ جھنجلا جاتا تھا لیکن پلوشہ کے سلسلے میں بالکل ایسا نہیں ہوا تھا۔

جب تک پلوشہ موجود رہی تھی' رچرڈ پر ایک خمار سا چھایا رہا تھا۔ ایسا خمار جس کا مزہ اس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔

''واپسی کے سفر میں جب وہ پوری طرح پلوشہ کے تصور میں کھویا ہوا تھا نہ جانے کیسے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ'' آخر میں اس سے اتنا متاثر کیوں ہو رہا ہوں وہ اتنی خوبصورت تو نہیں ہے۔''

حقیقت بھی یہی تھی کہ پلوشہ سے کہیں زیادہ خوب صورت لڑکیاں اس کی زندگی میں آ چکی تھیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایک ایسی نہیں تھی جسے رچرڈ نے ان نظروں سے دیکھا ہو جن نظروں سے اس نے پلوشہ کو دیکھا تھا۔

رچرڈ جب سوچ رہا تھا اس کے ذہن میں پلوشہ کا چہرہ تھا جس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے غیر معمولی کہا جا سکتا ہو ماسوائے ان بڑی بڑی آنکھوں کے جو خاموشی میں بھی بول رہی تھیں جب ایک جگہ ٹھہری ہوئی تھیں تب بھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ حرکت کر رہی ہوں اور جب وہ ایک جگہ جم جاتی تھیں تو یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ ان آنکھوں سے حرارت منتقل ہو رہی ہو اور وہ حرارت جو چیزوں کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔

''لیکن میں اس کے بارے میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں۔'' رچرڈ نے سوچا۔

پلوشہ کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ پہلا موقع تھا کہ رچرڈ کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا تھا۔ لیکن پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو ایسا کچھ چاہ ہی نہیں رہا تھا جس میں کچھ حاصل کرنے کی طلب ہو۔

''یہ مشرقی لوگ شاید اس کو محبت کہتے ہیں۔'' اس کے ذہن میں کہیں سرگوشی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔

''تم بھی ایک بے وقوف آدمی ہو۔'' اس نے خود کو مخاطب کیا۔

''پہلے تو اس لفظ سے ہی ناواقف رہے۔ جب واقف ہوئے تو ایک ایسی

لڑکی سے محبت کر بیٹھے جو صرف تم سے نہیں پوری قوم سے نفرت کرتی ہے اور اس لفظ سے واقفیت میں اتنی دیر لگا دی کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔'' اس نے اپنا مذاق خود ہی اڑایا تھا۔

رچرڈ کیمپ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے آفس کے باہر ہی ابراہیم کی گاڑی دیکھ لی۔ وہ دفتر میں داخل ہوا تو ابراہیم کو اپنا منتظر پایا۔

''میں نے آنے سے پہلے فون کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ کچھ خواتین کو چھوڑنے خود گئے ہوئے ہیں۔''

ابراہیم نے عجیب گھٹیا انداز میں چبا چبا کر گفتگو کی تھی۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کی مسکراہٹ تھی کہ رچرڈ کا خون کھول کر رہ گیا لیکن وہ خاموش رہا۔

''آپ نے پہلے اس بات کا احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ آپ بھی کچھ شوق رکھتے ہیں۔'' ابراہیم نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ رچرڈ کی خاموشی کو اس نے کوئی اور ہی رنگ دیا تھا۔

''مسٹر ابراہیم!'' بات اب رچرڈ کے قابو سے باہر ہونے لگی۔ اس لیے وہ غرایا۔

''وہ دونوں خواتین میرے لیے محترم تھیں اس لیے کہ ان کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہے جس کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں میں زندگی دے کر وہ احسان نہیں اتار سکتا ہوں۔''

ابراہیم کے رویے کی وجہ سے رچرڈ کو اپنا لہجہ تبدیل کرنا پڑا تھا لیکن اس نے گفتگو کا آغاز اسی انداز سے کیا تھا جس میں اس نے سوچ رکھا تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔'' ابراہیم نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔

''دراصل میری ذہنیت ہی کچھ ایسی ہو گئی ہے۔''

اس نے اپنے رخساروں پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

''ایسی ذہنیت ہو گئی ہے کہ تم سولہ برس کی لڑکی سے اس عمر میں شادی کرنا

چاہتے ہو۔'' رچرڈ نے کہا اور ابراہیم نے چونک کر اسے دیکھا۔

''یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔'' ابراہیم نے نظریں چراتے ہوئے کہا لیکن رچرڈ کو اس کے انداز میں اکڑنے کی سی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔

''پلوشہ کا اندازہ درست تھا۔'' رچرڈ نے سوچا۔

''میرا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔'' ابراہیم نے رچرڈ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

''تم نے امان اللہ کی رہائی کے لیے رقم مانگی تھی بیچ میں یہ شادی کہاں سے لے آئے۔'' رچرڈ نے ابراہیم کے لہجے میں بڑھتی ہوئی خودسری کو محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''میں کہاں لایا۔'' ابراہیم نے ایک اور رنگ بدلا۔

''وہ لائے تھے۔'' ابراہیم اب کھسیانے جھوٹ پر اتر آیا تھا۔

''انہوں نے ہی مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کی بہن سے شادی کر لوں اور ان کے بھائی کو رہا کر دوں۔'' رچرڈ کو خاموش دیکھ کر ابراہیم نے جھوٹ کے پلڑے میں اور وزن ڈالا۔

''میرے اکیلے کی بات ہوتی تو میں یوں ہی ترس کھا کر چھوڑ دیتا لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ ایسے معاملات میں کتنے لوگ شریک ہوتے ہیں۔'' ابراہیم نے معنی خیز انداز میں کہا کیونکہ یہ بات وہ جانتا تھا کہ رچرڈ بہت کچھ جانتا ہے۔

''لیکن ایک کو اس طرح چھوڑنے کا مطلب ہے کہ ان پر سے ہماری دہشت ہی ختم ہو جائے۔'' ابراہیم نے کہا۔

''میرا کہنا یہ ہے کہ بات جب رقم کی تھی تو یہ لڑکی اور شادی کہاں سے آ گئی۔'' رچرڈ نے پہلے سے بھی زیادہ نرم لہجہ اختیار کیا۔ اب وہ ابراہیم سے دوسرے انداز میں ڈیل کرنا لگا تھا۔

''میں نے آپ کو بتایا نا کہ لڑکی اس لیے درمیان میں آ گئی تھی کہ ان کے پاس رقم نہیں تھی اور میں یوں خواہ مخواہ میں رہا کر نہیں سکتا تھا کہ اس طرح دوست مذاق

اڑاتے اور دشمن یہ سمجھتے کہ میں خوف زدہ ہوں۔'' ابراہیم نرم لہجے کے جال میں پھنس کر جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟'' رچرڈ نے عام سے لہجے میں سوال کیا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں رچرڈ صاحب!'' ابراہیم نے بظاہر شرمندہ ہونے والے انداز میں کہا۔

''اب میری یہ عمر ہے کہ میں لڑکیوں میں دلچسپی لیتا پھروں۔ وہ تو مجبوری کا ایک سودا تھا جو میں نے مجبوراً کر لیا تھا۔'' ابراہیم نے کہا اور رچرڈ نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے جال سمیٹا جائے۔

''اس عمر میں شاید مقامی لڑکی کو بھی نہ سنبھال سکوں جبکہ وہ تو امریکا سے آئی ہوئی لڑکی ہے جس نے نہ جانے وہاں پر کیا گل کھلائے ہوئے ہوں گے۔'' ابراہیم نرم لہجے سے غلط فہمی کا شکار ہو کر ایک بار پھر اپنی حد پار کر گیا اور اس بار رچرڈ برداشت نہیں کر سکا۔

''اپنی حدود میں رہو۔'' رچرڈ غرایا اور ابراہیم بدلتے ہوئے لہجے پر چونک گیا۔

''امان اللہ کو رہا کر دو تمہیں تمہاری رقم مل جائے گی۔'' رچرڈ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

''کون دے گا رقم؟'' ابراہیم کے لہجے میں پھر سے اکڑ آ گئی۔

''میں دوں گا اور کون دے گا۔'' رچرڈ نے کہا اور ابراہیم نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ رچرڈ ایسا کہہ سکتا ہے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ابراہیم بڑبڑایا۔

''تمہارا مطلب ہے میں رقم نہیں دے سکتا۔'' رچرڈ نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

''میرا مطلب یہ تھا کہ میں آپ سے رقم کس طرح لے سکتا ہوں۔'' ابراہیم

نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے رقم لینے میں کیا حرج ہے؟'' رچرڈ نے نرم لہجے میں مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

میرے ڈالر بھی اصلی ہوں گے جیسے دوسرے ڈالر ہوتے ہیں۔'' رچرڈ نے ماحول کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کی لیکن ابراہیم سوچ میں ڈوبا رہا۔

''میرے خیال سے مجھے کمانڈر سے اجازت لینی ہوگی۔'' ابراہیم نے اچانک پینترا بدلا۔

''جیسے آپ کی مرضی!'' رچرڈ نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر کمانڈر صاحب کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں خود ان سے بات کر لیتا۔'' رچرڈ نے بے پروا انداز میں کہا لیکن دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ کمانڈر اسے اس کام سے روک بھی سکتا ہے۔

''لیکن ان باتوں میں انہیں یقیناً دخل دینا پڑے گا جو انٹرنیشنل میڈیا میں ہمارے خلاف پروپیگنڈا بن سکتی تھی۔'' رچرڈ نے بھی اپنی انگلیاں سیدھی کرنی شروع کر دی تھیں۔

ابراہیم کے چہرے کے رنگ بدلنے شروع ہوئے۔ وہ کچھ دیر سوچنے کی ایکٹنگ کرتا رہا پھر اچانک اٹھ گیا۔

''میں ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد کل آپ کو جواب دوں گا۔'' اس نے کہا لیکن رچرڈ کے لیے اس طرح معاملے کو ادھورا چھوڑنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''آپ باہر رکیں میں کمانڈر صاحب سے آپ کی بات کرواتا ہوں۔'' رچرڈ نے اپنا لہجہ سخت کر لیا تھا۔

ابراہیم باہر گیا تو رچرڈ کے پاس کمانڈر سے بات کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن کمانڈر کے لیے اس کا ذہن کوئی اور ہی کہانی بنا رہا تھا۔

''سر! وہ لڑکی امریکا میں پلی بڑی ہے اور وہ مجھے یہ دھمکی دے چکی ہے کہ وہ معاملہ انٹرنیشنل پریس تک لے جائے گی بلکہ وہ تو کہہ کر گئی ہے کہ اس نے پورے انتظام

کر رکھے ہیں۔'' رچرڈ نے پلوشہ کا مختصر تعارف کروایا اور اس کے بارے میں بتایا کہ وہ دفتر میں آ کر کیا کہہ چکی ہے' کمانڈر کو کسی اور ہی رخ پر ڈالنے کی کوشش کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا کہہ سکتی ہے؟'' کمانڈر نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''سر! اس کا خاندان اٹھارہ برس امریکا میں گزار کر آیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ٹیپ کرنے سے لے کر امریکا میں اپنے ہمدردوں تک تصویریں بلکہ شاید اس بے وقوف کی دھمکیوں پر مبنی فلم بھی بھیج سکتی ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔

وہ خود دفتر آئی تھی؟'' کمانڈر نے سوال کیا اور رچرڈ سمجھ گیا کہ مچھلی نے کانٹا نگل لیا ہے۔

''سر! وہ خود ہی آئی تھی اور آپ سے ملنا چاہتی تھی اور میرے منع کرنے پر کہا آج آپ نہیں آئے ہیں۔ وہ اصرار کرتی رہی کہ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔'' رچرڈ نے کہا اور کمانڈر کچھ دیر خاموش رہا۔

''میرے خیال میں تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' کمانڈر کی آواز کچھ دیر بعد فون پر آئی تو رچرڈ کا دل چاہا کہ وہ فون رکھ کر ایک زوردار نعرہ لگائے۔

''اس کا اتنے عرصے بعد آنا اور دھمکی آمیز انداز میں بات کرنا یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پاس کچھ شواہد ضرور ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ اپنے کسی ہمدرد کے پاس امریکہ بھیج چکی ہوگی۔'' کمانڈر نے کہا۔ اس کی آواز میں گہری سوچ تھی۔

''سر! یہ بے وقوف براہ راست اس کے گھر میں بیٹھ کر دھمکیاں دیتا رہا ہے۔'' رچرڈ نے صورت حال کو مزید گھمبیر بنانے کے ارادے سے کہا تھا۔

''مجھے اس پورے معاملے میں شک اس لیے پیدا ہوا تھا کہ اس کی بڑی بہن جو اس وقت گھر کی سربراہ ہے ابراہیم کے سامنے نہیں آئی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ گھر میں موجود رہ کر نہیں ملی تو وجہ کچھ اور ہوگی اور اسی پر میرا ذہن اس جانب گیا تھا کہ ممکن ہے وہ چھپ کر فلم بنا رہی ہوگی۔ جبھی تو وہ کیمپ میں اتنے اعتماد سے داخل ہوئی تھی۔ ورنہ تو اسے اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔'' رچرڈ نے کمانڈر کی خاموشی سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس بے وقوف کو اپنے پاس روکو۔'' کمانڈر پر رچرڈ کی باتوں کا اس سے زیادہ اثر ہوا تھا جتنا رچرڈ چاہتا تھا۔

''میں فوری طور پر آ رہا ہوں۔'' کمانڈر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے لائن کاٹ دی۔

رچرڈ اپنے لوگوں کی کمزوروں سے بڑی اچھی طرح واقف تھا اسی لیے اس نے میڈیا کی دکھتی رگ پر دباؤ بڑھایا تھا۔ پلوشہ کو جس انداز سے اس نے کمانڈر کے سامنے پیش کیا تھا' اسی کے بعد کمانڈر کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا ثبوت اس وقت مل گیا جب کمانڈر نے ابراہیم سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''تم یہیں موجود رہو گے اور اپنے آدمیوں سے کہو گے کہ وہ اس قیدی کو لے کر یہاں آئیں۔''

کمانڈر نے جس انداز میں گفتگو کا آغاز کیا تھا' وہ ابراہیم کے لیے بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ وہ کسی اور ہی دھیان میں تھا کہ اسے کمانڈر کا یہ حکم سننا پڑا تھا۔

''وہ ہرات میں ہے۔'' ابراہیم نے کہنا چاہا لیکن کمانڈر نے ہاتھ اٹھا کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''وہ یہاں آئے گا اور تم یہاں سے جاؤ گے۔ اگر وہ زندہ یہاں نہیں آیا تو تم بھی یہاں سے لاش کی صورت میں جاؤ گے۔'' کمانڈر نے دوٹوک انداز میں فیصلہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ابراہیم کو پوری طرح احساس ہو گیا کہ بازی مکمل طور سے اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ اب اس کے لیے بہتر یہی ہو گا کہ وہ وہی کرے جو اس سے کہا جا رہا ہے۔ کمانڈو جب ابراہیم کو حکم دے رہا تھا رچرڈ یہ سوچ رہا تھا کہ لوگ کچھ غلط نہیں کہتے کہ امریکی اپنے ساتھی بھی ڈسپوزیبل رکھتے ہیں استعمال کیا اور پھینک دیا۔

پورے امریکی معاشرے میں ہر شے ڈسپوزیبل ہو چکی ہے۔ کھانے پینے کی پیک چیزوں سے لے کر رشتے تک ضرورت کے مطابق استوار کر کے ختم کرنے کا رواج ہے۔ جسم کی ضرورت پوری ہونے کے ساتھ ''فرینڈ'' بنائے جاتے ہیں اور پھر

ضرورت پوری ہونے کے بعد انہیں یوں بھلا دیا جاتا ہے کہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ پہلے کب ملے تھے۔

''اب اس کے ساتھ کیا کرنا ہے؟'' رچرڈ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا اس لیے وہ پوری طرح کمانڈر کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔

''میں اسی لڑکی کے بارے میں کہہ رہا ہوں جو یہاں آئی تھی۔'' کمانڈر نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

''اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟''

''اسے کسی طرح مطمئن کرو کہ ہم نے ابراہیم سے اس کے بھائی کو بلوایا ہے۔ جب تک اس کا بھائی رہا نہیں ہو گا ہم اسے اپنی کسٹڈی میں رکھیں گے۔'' کمانڈر نے کہا لیکن رچرڈ نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

''یہ بات ہمیں کسی کو بھی نہیں بتانی چاہیے بلکہ ابراہیم سے بھی یہ کہہ دینا چاہیے کہ یہ بات کسی کو نہ بتائے کیونکہ اگر یہ بات عام ہوئی تو یہ ہمارے خلاف ہو جائے گی کہ ہم اپنے حریفوں کے ساتھ برابر سلوک کرتے ہیں۔'' رچرڈ نے کہا۔ کمانڈر یوں سر ہلانے لگا۔ جیسے اسے رچرڈ سے اختلاف نہ ہو۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن اس کا مطمئن ہونا بھی تو ضروری ہے۔'' کمانڈر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا۔

''اگر نیویارک میں موجود اس کے حمایتیوں نے کچھ کر دیا تو ایک اور مسئلہ ہو جائے گا۔'' وہ بدستور پریشان تھا۔

''ایک صورت ہو سکتی ہے سر!'' رچرڈ کو جیسے اچانک یاد آیا۔

''اس کے والد ثناء اللہ ڈاکٹر ہیں اور زیر حراست رہ کر کام کر رہے ہیں۔'' رچرڈ نے کہا۔

''انہیں گھر جانے کی اجازت مل گئی تو پلوشہ کی حکمرانی ختم ہو جائے گی اور ڈاکٹر صاحب یقیناً کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھائیں گے۔'' رچرڈ نے ایک دوسرے زاویے سے کہا کمانڈر کو صورت حال سمجھائی اور کمانڈر فوراً ہی تیار ہو گیا۔

"اسے فوراً بلاؤ۔" کمانڈر نے کہا۔

"سر! جہاں اتنی تکلیف کی ہے ایک کام اور کردیں کہ اسپتال کا سرپرائز وزٹ کرلیں۔ وہاں اس ڈاکٹر کی رہائی کا حکم دیں کہ میں انہیں گھر پہنچا آؤں۔" رچرڈ نے کہا اور کمانڈر اس کے لیے بھی تیار ہوگیا۔

جب تک حفاظتی اسکواڈ تیار ہوتا۔ کمانڈر نے ابراہیم کو بلا کر مزید ہدایات دیں اور ابراہیم سر جھکا کر سنتا رہا۔

"ہمارے لیے وہ مشکلات پیدا نہ کرو کہ ہم کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔" نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کمانڈر نے اچانک انداز تبدیل کیا۔

اسپتال کے اچانک معائنے کا وہی اثر ہونا تھا جو ہوسکتا تھا اور معائنے کے دوران ہی جب کمانڈر کی ڈاکٹر ثناء اللہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی کہا کہ وہ امریکیوں کی زیر حراست ہیں انہیں رہا کردیا جائے۔

"آپ کی نگرانی بہت اچھی ہے۔" رچرڈ نے آخر کار گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں نے اٹھارہ انیس سال امریکا میں گزارے ہیں۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے جواب دیا۔

"پھر یہاں کیوں آگئے؟" اس بار کمانڈر نے سوال کیا۔

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔" رچرڈ نے اس بار براہ راست سوال کیا۔

"اللہ کا بڑا احسان ہے۔ بڑا کرم ہے اس مالک کا۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب کو آرام کے لیے بھی گھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔" ثناء اللہ کے ایک ساتھی نے اچانک ہی کہا لیکن فوراً ہی ثناء اللہ نے پشتو میں اسے ڈانٹا۔

"جو مالک کا حکم ہوگا وہی ہوگا پھر ان سے رہائی کی درخواست کیوں کریں۔" اس نے جونیئر سے کہا لیکن کمانڈر اور رچرڈ کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ جس کے لیے وہ یہاں آئے تھے۔

"کیوں رکھا ہے انہوں نے آپ کو زیر حراست؟" کمانڈر نے انجان بن کر سوال کیا۔

"اس سوال کا جواب تو وہی لوگ دے سکیں گے جنہوں نے یہ حکم دیا تھا۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے جواب میں کہا۔ جواب کا احساس اور لوگوں کے ساتھ خود انہیں بھی ہو گیا تھا۔

"شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ کام بہت زیادہ ہے۔" اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہوتے ہی ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا لیکن رچرڈ اور کمانڈر ہی جواب کے اس حصے سے متفق نہ ہوسکے۔

"میں اس سلسلے میں بات کرتا ہوں۔" کمانڈر نے ناراض لہجے میں کہا۔ یہ الگ بات تھی جن لوگوں سے اس نے معلومات حاصل کرنی تھی وہ سب وہیں موجود تھے۔

"آپ معلومات نہ کریں۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا۔

"ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی بہتری ہوتی ہے۔" کمانڈر کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا تھا۔

ڈاکٹر ثناء اللہ کے طالبان سے رابطے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔" اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا۔ اسپتال کے انچارج نے کہنا شروع کردیا۔ ڈاکٹر ثناء اللہ کے نرم رویے کا مطلب وہ کچھ اور ہی سمجھا تھا۔

"تب تو انہیں اسپتال میں نہیں بلکہ جیل میں ہونا چاہیے۔" رچرڈ نے فوری طور پر کہا۔

"نہیں ۔۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

اسپتال کا انچارج رچرڈ کے جارحانہ رویے سے بوکھلا گیا۔

"آپ یہ بات شاید اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس دوران واپس آئے تھے جب یہاں طالبان کی حکومت تھی؟" رچرڈ نے اپنے جارحانہ رویے بڑھاتے ہوئے سوال کیا مگر انچارج نے جواب میں کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

"جتنا میں ڈاکٹر صاحب کو جانتا ہوں اس کی بنیاد پر میں پورے وثوق سے کہا سکتا ہوں کہ ان حالات میں شاید ڈاکٹر صاحب خود بھی گھر نہ جاتے لیکن یہ پابندی لگا کر آپ نے ایک شریف آدمی کی عزت کو مجروح کیا ہے۔" رچرڈ نے واضح طور پر الزام عائد کیا اور کمانڈو نے یوں گردن ہلا دی جیسے وہ اس کی بات سے متفق ہو۔

اسپتال کے انچارج سمیت کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا لیکن ڈاکٹر ثناء اللہ کے ساتھی ڈاکٹروں کی آنکھوں میں واضح طور رچرڈ کے لیے تعریفی جذبات تھے۔

"آپ اپنا یہ حکم منسوخ کریں اور ڈاکٹر جب گھر جانا چاہیں تو انہیں عزت و احترام کے ساتھ گھر جانے دیں بلکہ یہ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیں کہ وہ کتنا وقت گھر پر رہیں گے اور کتنا وقت اسپتال کو دیں گے۔" کمانڈو نے حکمیہ انداز میں کہا اور پھر فوراً ہی اس کا رخ ڈاکٹر ثناء اللہ کی جانب ہو گیا۔

"کچھ وقت نکال کر مجھے اسپتال کی فوری ضرورتوں کی لسٹ بنا دیں۔" کمانڈر نے ڈاکٹر ثناء اللہ کو مخاطب کیا۔

"میں دونوں طرح کی فہرستیں یعنی فوری ضرورت کی اور وہ چیزیں جو کچھ دنوں بعد لائی جاسکتی ہیں جمع کروا چکا ہوا اور یاد دہانی کرواتا رہوں گا۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے جواباً کہا۔

"آپ کل شام مجھ سے مل لیں۔" کمانڈر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"جی بہتر!" ڈاکٹر ثنا اللہ نے مختصراً جواب دیا۔

کمانڈر نے اس کے ساتھ ہی قدم بڑھائے تو رچرڈ بھی آگے بڑھ گیا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر ثناء اللہ جب گھر پہنچیں گے تو پلوشہ اس کی احسان مند ہوگی۔

"بھائی بھی گھر آجائے گا ------ تو -----" اس نے پلوشہ کی خوشی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"[illegible] کیوں بھول جاتا ہوں کہ جان بچانے والی اس تجرباتی دوا نے مجھے

اس قوت سے ہی محروم کر دیا جو ایک مرد کو مرد بناتی ہے۔" رچرڈ نے سوچ کے دھاروں سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

سوچ کے دھاروں سے باہر نکلنا اس کے لیے بہتر ہی ہوا کیونکہ اس کے چند ہی لمحوں بعد کمانڈر نے اسے مخاطب کیا تھا۔

میرے خیال سے اب وہ لڑکی کوئی ایسی کارروائی نہیں کرے گی جو انٹرنیشنل میں ہماری بدنامی کا باعث بنے؟" کمانڈر نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے لیکن ساتھ ہی ہمیں اس تاثر کو بھی مستحکم کرنا ہوگا کہ ہم نے یہ کارروائی اس کے خوف سے نہیں کی؟" رچرڈ نے اپنی رائے دی اور کمانڈر ایک بار پھر اس طرح سر ہلانے لگا جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔

"جلد یا بدیر ہمیں ابراہیم جیسے لوگوں سے پیچھا چھڑوانا ہوگا جو بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔" کمانڈر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا اور رچرڈ کا دل چاہا کہ کہہ دے۔

"یہ کیا احمقانہ بات کر رہے ہیں۔"

"ابراہیم جیسے لوگ اپنے مفادات کے لیے ہماری بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔" رچرڈ کی خاموشی بڑھی تو کمانڈر نے اپنی رائے کی وضاحت کی۔

"ہمارا ان لوگوں کے ساتھ مفادات کا ہی سودا ہے۔" رچرڈ نے دبی آواز میں کہا لیکن آواز اتنی اونچی ضرور رکھی کہ کمانڈر سن لے۔

"ہمیں ان کی بہت سی سرگرمیوں کی جانب سے نظریں چرانی پڑیں گی۔" رچرڈ نے مجبوری بیان کی تو کمانڈر ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر تم یہاں نہ ہوتے تو میں فیصلوں میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر دیتا۔" کمانڈر نے رچرڈ کی جانب تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب یہ تو یقیناً نہیں ہوگا کہ مجھے مستقل یہاں پر بسر کرنا ہوگا؟" رچرڈ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا تو کمانڈر بھی مسکرا دیا۔

"کوئی اتنی بری بات تو نہیں ہے اگر ایسا ہو جائے۔" کمانڈر نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

''یہیں کی کسی مقامی لڑکی سے شادی کر لینا اور ۔۔۔۔۔'' کمانڈر نے شرارتی مسکراہٹ سے کہا اور رچرڈ کے اندر ایک ہوک سی اٹھی لیکن پھر اس نے فوراً اس پر قابو پا کر مسکرانا شروع کر دیا۔

''یہ تھائی لینڈ یا فلپائن نہیں ہے سر! یہاں سے امریکیوں کے چلے جانے کے بعد مائیں نیلی اور سبز آنکھوں والوں کو جنم دے رہی ہیں۔'' رچرڈ کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔

یہاں کے لوگوں کے مذہب کے مطابق مرد کسی بھی اہل کتاب سے شادی کر سکتا ہے لیکن لڑکی نہیں کر سکتی۔'' رچرڈ نے کہا اور کمانڈر نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ تو عورت کے ساتھ ظلم ہے؟'' کمانڈر نے کہا لیکن رچرڈ نے اس کا جواب دینا پسند نہیں کیا۔ وہ صرف کمانڈر کی جانب دیکھتا رہا۔

''کیسا ہے یہ مذہب؟'' کمانڈر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے اور عورت اپنے پسند کے مرد سے شادی بھی نہیں کر سکتی۔'' کمانڈو نے رچرڈ کی خاموشی کو تائید سمجھتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

''شاید یہ چار شادیوں والی آزادی کی ہی وجہ ہے کہ اب تک ان کی اولاد اپنے باپ کا نام ہی جانتی ہے۔'' رچرڈ نے طنز کا جواب طنز میں دیا۔

رچرڈ نے جس انداز میں کمانڈر کو جواب دیا تھا' اس نے ایک لمحہ کے لیے کمانڈر کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر حیرت زدہ نظروں سے رچرڈ کو دیکھتا رہا۔

''تم ان کی حمایت کر رہے ہو؟'' کمانڈر نے اپنی حیرت کو لفظ دیئے تو رچرڈ کے ہونٹوں پر موجود طنزیہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

''میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ شیشے کے گھر میں بیٹھ کر پتھر مارنے سے گریز کرنا پڑے گا۔'' رچرڈ نے جواب میں کہا اور کمانڈر کے چہرے کے تنے ہوئے

اعصاب آہستہ آہستہ نرم ہو گئے۔

ان کی گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ اسپتال کا انچارج جسے کمانڈر نے کسی کام کے لیے بھیجا تھا آ گیا لیکن اس کے چہرے پر بوکھلاہٹ سوار تھی۔

''ایک اور دھماکا ہو گیا۔'' انچارج نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟'' کمانڈر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''دفتر میں بھرتی کے لیے آنے والے ایک شخص نے خود کو دھماکے سے اڑا دیا۔'' انچارج نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہ خودکش دھماکے ۔۔۔'' کمانڈر باہر کی جانب جاتے ہوئے بڑبڑایا۔ رچرڈ اس کے ساتھ تھا لیکن اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کمانڈر کے اس مختصر فقرے کے پیچھے کتنی طویل کہانی ہے۔ خودکش دھماکوں نے ان میں سے ہر ایک کے اعصاب کو کمزور کر رکھا تھا اور ان پراگندہ اعصاب نے انہیں ہر ایک پر شک کرنے کی عادت میں مبتلا کر دیا تھا۔

واپسی کے سفر میں کمانڈر خاموش رہا لیکن کیمپ کے قریب آنے لگا تو اس کی زبان بھی کھل گئی پھر وہی رپورٹیں اور وہی ہدایتیں اور ساتھ ہی وہی ڈانٹ پھٹکار کہ آخر ان خودکش بم دھماکوں کو ہم کنٹرول کرنے میں کیوں ناکام ہیں۔

''دنیا میں کہیں روکنے میں انہیں کامیابی بھی ہوئی ہے؟'' رچرڈ نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''یہ بات ائرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھنے والوں کی سمجھ میں آ جاتی تو پھر کیا بات تھی۔'' کمانڈر کی بڑبڑاہٹ تیز ہوتی چلی گئی۔

''تم ایسا کرو کہ اس ابراہیم کو ڈیل کر لو۔ میں ان معاملات کو نمٹاتا ہوں۔'' کیمپ پہنچتے ہوئے کمانڈر نے حکم دیا اور رچرڈ نے سر جھکا کر اس کا حکم تسلیم کیا۔

کیمپ میں اسی طرح کی بھاگ دوڑ تھی جس طرح ہر دھماکے کے بعد ہوتی ہے لیکن رچرڈ اس جانب آ گیا تھا جہاں ابراہیم موجود تھا۔

"میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے آپ اپنے ہمدردوں کی تعداد کم کر دیں گے۔" ابراہیم نے رچرڈ پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"کیوں۔۔۔تم القاعدہ میں شامل ہو رہے ہو یا ملا عمر کی حمایت کا فیصلہ کر لیا ہے؟" رچرڈ نے اس کا فقرہ درمیان سے اچک لیا۔

"تم کسی کے جواب دہ ہو کہ کسی قیدی کو تم نے کتنی رقم لے کر رہا کیا ہے؟" رچرڈ نے اس کا سوال اس کو لوٹایا۔

میرا مطلب تھا جب یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگی۔۔۔" ابراہیم کے جارحانہ انداز میں رچرڈ کے سوال سے کمی آ گئی تھی۔

"ابراہیم کچھ دیر سوچوں میں گم رہا اور پھر بولا۔" میں اس کے بارے میں اپنے دوستوں سے ذکر کر چکا ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں لڑکی نہ ملی تو۔۔۔؟" رچرڈ نے طنزیہ انداز میں سوال کیا اور ابراہیم کی گردن اقرار میں ہل گئی۔

"چند دوستوں میں سبکی ہونا بہتر ہے لیکن اگر تمہارا نام اور تصویر دنیا بھر کے اخبارات میں تمہارے کارناموں کے ساتھ شائع ہو تو اس میں تمہاری سبکی بہت ہے۔" رچرڈ نے کہا اور ابراہیم اسے اس انداز میں دیکھنے لگا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟" رچرڈ نے کہا۔

"پلوشہ! نیویارک سے آئی ہے اور اس کے وہاں پر جو تعلقات ہیں وہ اسے استعمال کر رہی ہے اور ایسی دھمکی دے کر بھی گئی ہے۔" رچرڈ بولتا چلا گیا اور ابراہیم کی سوچ گہری ہوتی گئی۔

"آپ اس خاندان کو طالبان سے تعلقات کے جرم میں گرفتار کیوں نہیں کر لیتے۔" ابراہیم نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا اور رچرڈ کا دل چاہا کہ تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کر دے۔

"ان کے گھر میں آج کل بھی ملا عمر کے ساتھ اس ڈاکٹر کی تصویریں لگی ہوئی

ہیں۔" اپنے مشورے میں وزن پیدا کرنے کے انداز میں ابراہیم نے معلومات دینے کی کوشش کی تھی۔

"ملا عمر کے ساتھ تو تمہاری بھی تصویریں موجود ہیں۔" رچرڈ نے مشورے کو رد کرنے کے انداز میں کہا۔

"بلکہ تمہاری تصویریں تو اس سے پہلے برہان الدین اور گلبدین کے ساتھ اور اس سے پہلے روسی کمانڈروں کے ساتھ بھی رہی ہیں۔" رچرڈ کا طنز گہرا ہوتا چلا گیا۔

"لیکن اب تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔" ابراہیم کا لہجہ بالکل ہی نرم ہو گیا۔

"تم ہمارے ساتھ ہو اسی لیے ہم درخواست کر رہے ہیں کہ اس طرح کے کام نہ کرو جو تمہارے ساتھ ہمارے لیے بھی مشکلات پیدا کریں۔"

ابراہیم نے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے وہ بات سمجھ گیا ہو لیکن رچرڈ جانتا تھا کہ ابراہیم ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو آسانی سے ہتھیار ڈال دیں۔ وہ ایک مطلبی لیکن خود پسند شخص ہے۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے مطلب حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ اتنا زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ رچرڈ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی باتیں اگر پوری طرح ابراہیم کی سمجھ میں آ بھی گئیں تب بھی اس کی خود پسندی اور اس کی انا اسے ڈاکٹر ثناء اللہ کے گھر والوں سے دشمنی کرنے سے پیچھے نہیں ہٹا سکے گی۔

"وہ کب پہنچ رہے ہیں تمہارے آدمی۔" طویل ہوتی ہوئی خاموشی کو بالآخر رچرڈ نے ہی توڑا لیکن ابراہیم کے چہرے کے تاثرات میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔

"میں نے اسے پیغام بھجوا دیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ یہاں کب پہنچتے ہیں۔" ابراہیم کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ رچرڈ چونک گیا۔

"اگر تمہارے آدمیوں نے راستے میں کچھ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔"

رچرڈ نے آنے والے خطرے کو بھانپ کر اسے خبردار کرنے کی کوشش کی۔

"میرے آدمی تو ہوشیاری نہیں کریں گے لیکن اگر اس کے ساتھیوں نے۔۔۔" ابراہیم نے معنی خیز انداز میں اپنا فقرہ ادھورا چھوڑا اور رچرڈ اسے گھور رہا

تھا۔

''یہ بات تو آپ کے علم میں بھی ہوگی کہ وہ طالبان کے لیے لڑتے ہوئے گرفتار ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ طالبان اپنے ساتھی کی رہائی کے لیے۔۔۔'' ابراہیم نے ایک بار پھر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''صورت حال جو کچھ بھی ہو۔'' رچرڈ کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

''امان اللہ کے جسم میں جتنی خراشیں آئیں گی اتنی ہی لکیریں تمہارے جسم پر بھی بن جائیں گی۔'' رچرڈ نے ابراہیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور ابراہیم نظریں چرانے لگا۔

''اگر وہ زندہ نہیں رہا تو اس بات کا یقین کر لو کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔'' رچرڈ نے یہ کہا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''میں تمہارے موقف کی اس تبدیلی کو کمانڈر تک پہنچا دوں۔'' رچرڈ دروازے کی جانب بڑھا تو ابراہیم نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''میں نے تو صرف۔۔۔'' ابراہیم نے گھگیانے والے انداز میں کہا لیکن رچرڈ نے اپنے انداز میں تبدیلی نہیں آنے دی۔

''مجھے امید ہے کہ تمہارے اندیشوں سے کمانڈر صاحب بہت خوش ہوں گے۔'' رچرڈ نے اسے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ابراہیم نے اس کے بعد بھی کوشش کی کہ رچرڈ رک جائے لیکن رچرڈ باہر نکل آیا اور سیدھا اس جانب گیا جہاں اس وقت کمانڈر موجود تھا۔

توقع کے عین مطابق کمانڈر مصروف تھا۔ اس نے رچرڈ کو آتے ہوئے دیکھا لیکن اپنی مصروفیت میں کوئی کمی نہیں کی رچرڈ بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اس طرح سوال کرتے ہیں جیسے یہ دھماکے میرے ایماء پر ہو رہے ہیں۔'' کمانڈر کچھ دیر بعد خود کلامی کے انداز میں بولا تھا لیکن رچرڈ نے اس کے جواب میں خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

''تمہارے پاس کوئی حل ہے ان خودکش دھماکوں کو روکنے کا؟'' کچھ دیر مصروف رہنے کے بعد کمانڈر نے رچرڈ سے سوال کیا۔

''اس کا حل تو آپ سمیت ہر شخص جانتا ہے۔'' رچرڈ نے جواب میں کہا اور کمانڈر کی آنکھوں میں سوال ابھر آئے۔

''زندگی کو اتنا بے بس نہ رہنے دیں کہ موت زیادہ حسین نظر آنے لگے۔'' رچرڈ نے کمانڈر کی آنکھوں میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب میں کہا۔

''کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ تم یہاں کے باشندے ہو اور بھیس بدل کر امریکن ہوئے ہو۔'' کمانڈر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا لیکن رچرڈ نے دیکھا یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''آپ جانتے ہیں سر! میں موت کے بہت قریب سے ہو کر آیا ہوں۔ اس وقت جب موت مجھ سے دو یا تین قدم کے فاصلے پر تھی تو میں اس وقت یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں اپنے جسم پر بم باندھ کر خود کو دھماکے سے اڑا دوں گا۔'' رچرڈ نے پوری سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

''جانتے ہیں ایسا کیوں تھا۔۔۔ سر؟'' رچرڈ نے کمانڈر سے سوال کیا تو کمانڈر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''کیوں تھا ایسا۔۔۔؟'' اس نے اپنا سوال لوٹاتے ہوئے ہار تسلیم کر لی۔

''دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ مجھ میں زندہ رہنے کی امنگ اور ایک موہوم سی امید زندہ تھی میں ہر آتی ہوئی سانس کو زیادہ نہ سہی کم ہی سہی انجوائے کر رہا ہوں۔'' رچرڈ نے کہا اور کمانڈر نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

''اور دوسری وجہ۔۔۔؟'' کمانڈر نے دلچسپی لینے والے انداز میں سوال کیا۔

''میرے سامنے میرے مرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔'' رچرڈ نے جواب میں کہا اور کمانڈر ہنس دیا۔

''بھرتی کے دفتر میں اپنے ہی بھائیوں کو بم سے اڑانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟'' کمانڈر نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ تو رچرڈ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ

لے۔

''وہ ہم سے تعاون کرنے والوں کے دل میں یہ خوف بٹھانا چاہتے ہیں کہ جو بھی ہمارا ساتھ دے گا مارا جائے گا۔'' رچرڈ نے جواب دیا تو کمانڈر نے اس کی جانب اس طرح دیکھنا شروع کیا کہ رچرڈ کنفیوز ہو گیا۔

''تم مانو یا نہ مانو تمہارے اندر یہاں کے ہی کسی بندے کی روح ہے۔'' کمانڈر نے کہا اور رچرڈ بھی مسکرا دیا۔

''اگر آپ اسے گستاخی نہ سمجھیں تو اس حساب سے سر آپ میں بھی بھارت کے کسی ایسے شخص کی روح ہے جو سات جنم لینے پر یقین رکھتا ہے۔'' رچرڈ نے جواب میں کہا اور کمانڈر نے قہقہہ مار کر ہنسنا شروع کر دیا۔

''میں ہائی کمان سے سفارش کروں گا کہ تمہاری اس خطے کے بارے میں معلومات سے فائدہ اٹھایا جائے۔'' کمانڈر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا لیکن پھر دروازے کی جانب بڑھنے سے پہلے رک کر اس نے ایک بار پھر رچرڈ کو مخاطب کیا۔

''ابراہیم کے لوگ اس لڑکے کو لے کر آئیں تو تم اپنی حفاظت میں اس کو اس کے گھر تک پہنچانا۔'' کمانڈر نے حکم دینے والے انداز میں کہا اور رچرڈ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اندھے کو دو آنکھیں مل گئی ہوں۔

کمانڈر کو رخصت کرنے کے بعد رچرڈ نے واپس جانے کی بجائے وہیں رکنے کو ترجیح دی لیکن کیمپ میں رکنے کے باوجود اس نے ابراہیم کی جانب رخ نہیں کیا۔ یہ ہدایت البتہ اس نے دی تھی کہ ابراہیم کے لوگ جب وہاں پہنچیں تو اسے اطلاع دی جائے تاکہ وہ آگے کی کارروائی کر سکے۔

رچرڈ ریٹائرنگ روم میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ کچھ دیر کمر سیدھی کر لے گا لیکن کمر سیدھی کرنے لیٹا تو نیند نے بڑھ کر اس کو اپنی بانہوں میں اس طرح لیا کہ وہ ہر شے سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

نیند کی وادی میں پہلا قدم رکھنے سے پہلے جس خیال نے اس کے ذہن میں قبضہ کیا تھا وہی خیال خواب کی صورت میں اس کے ساتھ رہا۔ اس نے پلوشہ سے وہ

سب کچھ کہہ ڈالا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔

رچرڈ نے پلوشہ کے ساتھ ابھی نئی زندگی کا آغاز کیا ہی تھا کہ اسے بیدار کر دیا گیا۔ آنے والا اس پیغام کے ساتھ آیا تھا کہ ابراہیم کے ساتھی مطلوبہ فرد کو اپنے ساتھ لے کر پہنچ گئے ہیں۔ اس نے آنے والے کو انتظار کرنے کا کہہ کر واپس کر دیا اور خود اس سوچ میں گم ہو گیا کہ آخر اس نے اس انداز میں سوچنا کیوں شروع کیا؟

''مجھے سب سے پہلے تو اپنی کم مائیگی کا احساس ہونا چاہیے۔'' رچرڈ نے احساس محرومی کے ساتھ سوچا۔

''میں پلوشہ تو کیا کسی کے ساتھ بھی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے سوچا اور پھر اپنی جگہ چھوڑ دی۔

''کیسا عجیب اتفاق ہے۔'' رچرڈ نے ابراہیم کی جانب جانے سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو مخاطب کیا۔

''جب میں اس قابل تھا کہ زندگی ایک شریف انسان کے طور پر گزار سکوں تب میرے ذہن میں اس کا خیال بھی نہیں آیا لیکن اب۔۔۔۔'' اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ابراہیم کے لوگ اسے اس کمرے کے باہر ملے تھے جہاں وہ ابراہیم کو چھوڑ کر گیا تھا۔ رچرڈ نے اچھے موڈ میں ان سے ملنا چاہا لیکن ان کے اکھڑے انداز نے ان کو سمجھا دیا تھا کہ ابراہیم اپنے لوگوں کو بہت کچھ بتا چکا ہے۔

''ان کتوں نے ہمیشہ ہی اپنے ساتھیوں کو دغا دیا ہے۔'' رچرڈ نے آگے بڑھنے سے پہلے ان میں سے ایک کا فقرہ سنا تھا لیکن وہ کچھ ظاہر کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اپنے ساتھیوں کی طرح ابراہیم کا انداز بھی اکھڑا ہوا تھا جبکہ کمرے میں موجود نوجوان کی آنکھوں میں حیرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''کیسے ہو امان اللہ؟'' رچرڈ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے ابراہیم سے آنکھ بچاتے ہوئے اپنی دائیں آنکھ دبا دی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' نوجوان نے جواب دیا لیکن اس کی آنکھوں میں موجود

سوال کچھ اور بڑھ گئے تھے۔

''ابراہیم صاحب نے بڑا کرم کیا کہ ہماری درخواست مان لی۔ ورنہ اگر یہ اپنی ضد پر اڑ جاتے تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔'' رچرڈ نے کہا اور ابراہیم نے اسے دیکھنے کے ساتھ ہی اپنی نظریں جھکا دیں۔

''ہم سب اس تعاون پر ان کے شکر گزار ہیں۔'' رچرڈ نے ابراہیم کی کیفیت سمجھتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا لیکن اس نے محسوس کیا کہ امان اللہ کی آنکھوں میں ابراہیم کے لیے نفرت کے جذبات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''آج اور آج سے پہلے جو تعاون انہوں نے کیا ہے ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اس تعاون کا صلہ انہیں ان کی توقع سے بھی زیادہ ملے گا۔'' رچرڈ نے امان اللہ سے نظریں چراتے ہوئے بات مکمل کی۔

''آپ انہیں ان کے تعاون کا جو چاہے صلہ دیں لیکن ساتھ ہی مجھ اور مجھ جیسے لوگوں کو یہ تو بتا دیں کہ ہمیں کس گناہ کے جرم میں اذیت دی جاتی ہے۔'' امان اللہ خاموش نہ رہ سکا۔

ابراہیم نے اس کا جواب دینا چاہا لیکن رچرڈ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اور خود ہی امان اللہ کو جواب دینا شروع کر دیا۔

''جنگ زدہ علاقوں میں اس طرح کے واقعات ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔''

''ویسے مجھے یہ پوچھنے کا حق تو نہیں ہے لیکن کیا بتا سکتے ہیں ہم پر یہ جنگ مسلط ہی کیوں ہوئی؟'' امان اللہ نے تلخ انداز میں سوال کیا۔ رچرڈ سے زیادہ ابراہیم نے اسے چونک کر دیکھا بلکہ ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا تھا لیکن اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔

''کچھ دن آرام کر لو اور پھر ان سولات کا جواب مل کر تلاش کریں گے۔'' رچرڈ نے مسکراتے ہوئے کہا اور قبل اس کے کہ امان اللہ کچھ اور کہتا' رچرڈ نے ابراہیم کو مخاطب کیا۔

''آپ بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ یقیناً تھک گئے ہوں گے۔'' اس کے لہجے میں نرمی تھی لیکن ابراہیم اس کی تہہ میں چھپا ہوا پیغام سمجھ گیا تھا۔ ابراہیم اپنی جگہ سے اٹھا تو رچرڈ اسے چھوڑنے باہر تک آیا۔

''میں نے آپ کا کہا مان لیا ہے۔ اب ایک کام آپ میرا کر دیں۔'' ابراہیم نے باہر نکلتے ہی رچرڈ سے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

''کام کرنے والا ہوا تو ضرور کروں گا۔'' رچرڈ نے جواب میں کہا۔

''آپ یہ کام بہ آسانی کر سکتے ہیں۔'' ابراہیم نے زور دینے والے انداز میں کہا۔ رچرڈ سمجھ گیا کہ ابراہیم کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

''میران شاہ والے بارڈر سے مجھے کچھ گاڑیاں بھجوانی ہیں۔'' رچرڈ کی خاموشی کے ساتھ ابراہیم نے کہنا شروع کیا۔

''ان گاڑیوں کے چیسس نمبر سے لے کر رجسٹریشن نمبر تک سب پاکستان میں ہوں گے۔'' رچرڈ نے طنزیہ انداز میں کہا اور ابراہیم کھی کھی کر کے ہنسنے لگا۔

''گاڑیوں کے رجسٹریشن نمبر وہی ہوں گے جو کسی حادثے میں تباہ ہو چکی ہوں گی یا جنہیں چوری کے بعد پرزہ پرزہ کر کے بیچا جا چکا ہوگا۔'' رچرڈ نے اس کی کھی کھی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔'' ابراہیم نے اپنی کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ ان گاڑیوں کے خفیہ خانوں میں چرس یا ہیروئن چھپی ہوئی ہوگی۔'' رچرڈ نے کہا اور ابراہیم کی ہنسی میں بریک لگ گئے۔

''منافع میں آپ کا بھی حصہ ہوگا جو اس سے پہلے ہم دیا کرتے تھے۔ چاہے آپ یہاں لیں یا چاہے کسی فارن بینک میں لیں۔'' ابراہیم نے رچرڈ کے الزام کی تردید کیے بغیر آفر کی۔

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔'' رچرڈ نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن ابراہیم بھی ایک کائیاں شخص تھا۔

''سوچنے میں زیادہ وقت مت لگا دیجئے گا۔'' ابراہیم نے کہا۔

''ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ جن سے باقی زندگی آرام سے گزاری جاسکے۔'' رچرڈ کی خاموشی کا ابراہیم بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔

''میں نے کہا نا کہ میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گا۔'' رچرڈ نے ابراہیم کی لفظوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے کہا لیکن اس نے اپنا لہجہ نرم رکھا۔

''چند ایک بار ہم سے تعاون کرنے میں اتنا کچھ آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گا کہ امریکا میں آپ کی اولاد بھی عیش کرے گی۔'' ابراہیم نے اس بار رچرڈ کے نرم لہجے کا فائدہ اٹھایا۔

ابراہیم نے وہ فقرہ شاید یونہی کہہ دیا تھا لیکن رچرڈ کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے ابراہیم نے اس پر طنز کیا ہو۔ اس نے بڑے غور سے ابراہیم کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنی ہی دھن میں مگن اپنی ہی بات کہے جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ابراہیم صاحب! میں دو ایک روز میں آپ کو جواب دے دوں گا۔'' رچرڈ نے اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا لیکن ابراہیم نے یہ آخری موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

''میں نہایت بے صبری سے آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔'' ابراہیم نے مصافحہ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی بات کہہ ڈالی۔

ابراہیم کو رخصت کر دینے کے بعد بھی رچرڈ کچھ دیر وہیں رکا رہا۔ اسے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ اس کی زندگی اب محض سانس کی آمدورفت کا دوسرا نام ہے۔

''کاش اور لوگوں کی طرح میں بھی اس موذی مرض کا شکار ہو جاتا۔'' اس نے اپنی بے مقصد زندگی کے بارے میں غور کرتے ہوئے سوچا اور پھر واپسی کے لیے پلٹ آیا جہاں امان اللہ اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

''تم چاہو تو اپنے گھر فون کر کے بتا سکتے ہو تم کچھ دیر بعد گھر پہنچ جاؤ گے۔'' رچرڈ نے اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب میں کہا۔

''جب تک مجھے اپنی رہائی کا یقین نہ آ جائے میں کسی اور کو اس کا یقین کیسے

دلا سکتا ہوں؟'' امان اللہ نے رچرڈ کی آفر کے جواب میں کہا تھا۔

''تب میں ہی تمہارے گھر میں اطلاع دے دیتا ہوں کیونکہ مجھے تمہاری رہائی کا یقین ہے بلکہ میرے حساب کتاب میں تم اس وقت بھی آزاد ہو۔'' رچرڈ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی انٹرکام پر اپنے گارڈز کو روانگی کا حکم دینے لگا۔

''اگر میں آزاد ہوں تو میں فوری طور پر یہاں سے جانا چاہوں گا۔'' امان اللہ نے کہا۔

''جتنی دیر میں تیاریاں مکمل ہوتی ہیں تم شاور لے لو۔'' رچرڈ نے امان اللہ کی حالت دیکھتے ہوئے اسے مشورہ دیا لیکن امان اللہ نے نفی میں سر ہلا کر اس کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا۔

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر وہ سچ ہے تو میں شاور بھی گھر میں ہی لوں گا۔'' امان اللہ نے جواب میں کہا۔

بے یقینی اب بھی اس کے لہجے میں بہت واضح تھی۔ رچرڈ سمجھ سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے جس شخص نے ایک قدم کے فاصلے سے موت کو دیکھ لیا ہو اس کے لیے زندگی کا یقین کر لینا اتنا آسان نہیں تھا کہ وہ ایک انجانے شخص کے الفاظ پر اعتبار کر لے۔

رچرڈ نے چند لمحے امان اللہ کو بغور دیکھا اور پھر اس سے کچھ کہے بغیر اس کے گھر کے نمبر ملانا شروع کر دیے۔

''میں رچرڈ بات کر رہا ہوں۔'' رابطہ قائم ہونے اور دوسری جانب سے ہیلو کہنے پر رچرڈ نے تعارف میں صرف اپنا نام ہی بتایا۔

''یس آفیسر!'' دوسری طرف فون اٹھانے والی پلوشہ ہی تھی۔

''مس پلوشہ! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے بھائی کو دوبارہ آپ سے ملوا دوں۔'' رچرڈ نے پلوشہ کی آواز پہچاننے کے بعد کہا لیکن ساتھ اس نے محسوس کیا کہ پلوشہ کا نام سنتے ہی امان اللہ بری طرح چونکا۔

''مجھے یاد ہے اور میں اسی انتظار میں تھی کہ آپ کا وعدہ پورا ہوتا ہے یا امریکی کا وعدہ۔۔۔'' پلوشہ نے اعتماد سے کہا۔

"آپ کے بھائی اس وقت میرے دفتر میں عین اسی کرسی پر بیٹھے ہیں جس پر آپ بیٹھی تھیں۔" رچرڈ نے کہا لیکن دوسری طرف سے فوری طور سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"آپ پسند کریں تو میں ریسیوران کے ہاتھ میں دے دوں۔" رچرڈ نے کچھ دیر تک پلوشہ کی جانب سے جواب کے انتظار کے بعد کہا۔

پلوشہ کی جانب سے ایک ہلکی سی "جی" کا جواب آیا تھا اس کے ساتھ اس نے امان اللہ کی جانب ریسیور بڑھا دیا۔

"کیا تم نے میری رہائی کے لیے ان سے گفتگو کی تھی؟" امان اللہ کا لہجہ اور آواز دونوں بہت واضح طور اب بھی نرم ہی تھے لیکن اس نرمی میں ایک سختی بلکہ ناراضگی کا عنصر بھی شامل تھا۔

پلوشہ نے جواب میں جو کچھ کہا وہ تو میں نہیں سن سکا لیکن اس کے بعد امان اللہ نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ ہو گیا کہ اس نے کیا کہا۔

"غاصبوں سے بھیک سے ملی ہوئی زندگی سے تو بہتر تھا کہ تم نے مجھے مر جانے دیا ہوتا۔" امان اللہ کے لہجے میں ناراضگی بڑھ گئی۔

ان دونوں کے درمیان گفتگو ان کی مادری زبان میں ہو رہی تھی۔ وہ بغیر کسی تکلیف کے اس لیے بھی گفتگو کر رہے تھے کہ وہ خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ رچرڈ جیسا امریکن پشتو بھی جان سکتا ہے۔

امان اللہ کی گفتگو ختم ہوئی تو اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار موجود تھے۔ اس دوران جب وہ گفتگو کر رہا تھا تو اس وقت بھی رچرڈ اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتا رہا تھا اس لیے اس نے اپنی نئی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری تردید نہیں کروں گا۔" اس نے اپنے اسی روکھے انداز میں کہا۔

"تمہارا تعلق طالبان سے نہیں تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ غلط ہوا تھا۔" رچرڈ نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" امان اللہ کے لہجے میں جارحانہ پن آ گیا۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی کی کوشش سے تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی ختم ہو رہی ہے تو اس میں بری بات کیا ہے؟" رچرڈ نے سوال کیا۔

"اس سے زیادہ بری بات کیا ہو گی کہ میری بہن کو یہاں آ کر تم لوگوں کے آگے میری زندگی کی بھیک مانگنا پڑی۔" امان اللہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تم واقعی مسلمان ہو؟" رچرڈ نے اس کی تصدیق یا تردید کرنے کی بجائے سوال کیا اور امان اللہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم لوگ اب ہمارے مسلمان ہونے کی بھی تصدیق کرو گے۔" امان اللہ نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

"تمہارے مذہب کے بارے میں جتنا کچھ میں جانتا ہوں اس کے مطابق عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔" رچرڈ نے امان اللہ کے طنز کے باوجود لہجہ نرم رکھا۔

"صرف یہی نہیں اسلامی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جب خواتین نے وہ کردار ادا کیا جو عام حالات میں مرد کرتے ہیں۔" امان کی حیرت میں رچرڈ نے اضافہ کرتے ہوئے کہا اور امان اللہ کے چہرے پر موجودہ تاثرات میں کمی آتی چلی گئی۔

"شاید امریکیوں نے تمہیں خاصا کچھ پڑھا کر بھیجا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔" رچرڈ نے جواب میں کہا اور کچھ دیر فضا میں گھورنے کے بعد اس نے اپنی اور سہراب خان کی دوستی کی داستان چھیڑ دی۔

رچرڈ کی کہانی اتنی مختصر نہیں تھی کہ چند منٹوں میں ختم ہو جاتی اس لیے یہ اس وقت تک چلتی رہی جب تک امان اللہ کا واپسی کا آدھے سے زیادہ سفر ہوا تھا۔

"بہت خوش نصیب ہیں آپ!" امان اللہ نے رچرڈ کی کہانی ختم ہوتے ہی تبصرہ کیا۔

"شروع میں میرا بھی یہی خیال تھا لیکن ۔۔۔۔" رچرڈ نے ایک افسردہ

مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن اپنا فقرہ مکمل کرنے سے اس نے گریز کیا۔

"شاید ایسا نہیں ہے جیسا کہ تم سوچ رہے ہو۔" امان اللہ نے جواب دیا۔

"یعنی ۔۔۔۔" رچرڈ نے اس کی جانب کسی قدر حیرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"فی الحال میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن یہ پہاڑ جو تم دیکھ رہے ہو اس کے اندر بہت راز چھپے ہیں۔" امان اللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

رچرڈ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن جس انداز میں امان اللہ نے اس سے گفتگو کی تھی، اس میں امید کا ایک پہلو بہر حال تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ امان اللہ کو مجبور کرے کہ وہ کچھ وضاحت کے ساتھ بات کرے لیکن اس کا گھر اتنا قریب آ گیا تھا کہ مزید کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی اس لیے وہ خاموش ہی رہا۔

رچرڈ جب پہلی بار اس گھر پر پلوشہ کو ڈراپ کرنے وہاں آیا تھا تو وہ گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن جب وہ امان اللہ کے ساتھ پہنچا تو گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

جس جیپ میں امان اللہ تھا اس میں رچرڈ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید اس لیے ان دونوں نے اتنی کھل کر گفتگو کر لی تھی۔ رچرڈ نے جیپ گیٹ پر روکی تو اس نے محسوس کیا کہ گھر میں امان اللہ کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ ثناء اللہ گھر کے باہر ہی ٹہل رہے تھے جبکہ خود پلوشہ کھڑکی کے پیچھے موجود تھی۔ جیپ رکنے کی آواز نے سب کا انتظار ختم کر دیا۔ ان سب کے اندر جو تڑپ تھی اس نے ڈاکٹر ثناء اللہ کو بے تاب کر کے بیٹے کی طرف بڑھنے پر مجبور کر دیا تو پلوشہ بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھڑکی میں موجود بلائیڈر کو ہٹا کر بھائی کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

"میں تو وہ بدنصیب ہوں جسے اس کے خون نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" رچرڈ نے اس وقت کو یاد کرتے ہوئے سوچا جب وہ علاج کے بعد باری باری اپنی بہنوں کے پاس گیا تھا۔

ڈاکٹر ثناء اللہ بیٹے سے ملنے کے بعد امان اللہ کو لے کر رچرڈ کی جانب آئے

جن کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن ان کی آنکھیں جھلملا ضرور رہی تھیں۔

"پلوشہ نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس کے بھائی کی واپسی کے لیے کوشش کرو گے تو اس وقت مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وسیلہ بنایا ہے۔" انہوں نے شکریہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"فی الحال آپ انجوائے کریں۔" رچرڈ نے رخصت ہونے والے انداز میں کہا لیکن ڈاکٹر ثناء اللہ نے اسے روک لیا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" ان کا انداز دوٹوک فیصلہ کر دینے والا تھا۔

"لیکن ۔۔۔۔۔۔ یہ ۔۔۔۔۔۔" رچرڈ نے دل چاہنے کے باوجود اصرار کرنا چاہا کہ وہ واپس جانا چاہتا ہے ڈاکٹر ثناء اللہ نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اسے لے کر گھر میں داخل ہو گئے۔

"تمہیں چند منٹ انتظار کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔"

ڈاکٹر ثناء اللہ نے اسے ڈائننگ روم میں بٹھا کر اس سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"میں ذرا اس ہستی کا شکریہ ادا کر آؤں جس کی مہربانی نے ناممکن کو ممکن بنایا۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسی طرح گھر میں چلے گئے۔

رچرڈ کچھ دیر تک کچھ بھی نہیں سمجھ سکا کہ ڈاکٹر ثناء اللہ کیا کہہ گئے لیکن کچھ دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ ڈاکٹر ثناء اللہ یقیناً شکرانے کی نماز ادا کرنے گئے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کا اصرار اپنی جگہ لیکن رچرڈ ان کے ساتھ گھر میں اس لیے چلا آیا تھا کہ پلوشہ کے ان چند لمحوں کے اصرار نے اس کے اندر موجود چنگاریوں کو بھڑکتی آگ میں تبدیل کر دیا تھا۔

پلوشہ نے بلائیڈر ہٹا کر دیکھا تھا لیکن ایسے غائب ہوئی کہ نظر ہی نہیں آئی۔ خود امان اللہ بھی اس طرح غائب ہوا تھا کہ دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔

"ایسا تو نہیں پلوشہ اپنی راویات کی پابندی کرتے ہوئے سامنے ہی نہ آئے۔" رچرڈ کے ذہن میں کہیں سے بھٹکتا ہوا خیال آیا اور اسے وہاں آنا بیکار محسوس

ہوا۔

ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ وہیں بیٹھا رہا اس کی وہ امید اس وقت پوری ہوئی جب پلوشہ اس عورت اور ایک لڑکی کے ساتھ داخل ہوئی۔

لڑکی کی شکل پلوشہ سے کافی ملتی تھی لیکن اس کے چہرے کے نقوش میں نزاکت زیادہ تھی اور شاید اسی چیز نے اسے زیادہ خوب صورت بنا دیا تھا۔

"یہ میری چھوٹی بہن ہے۔" رچرڈ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تینوں کا استقبال کیا تو پلوشہ نے مسکراتے ہوئے اپنی بہن کا تعارف کروایا۔

"میں اپنی جانب سے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔" پلوشہ کے مزید کچھ کہنے سے قبل اس کی بہن نے کہا۔

"میں اگر تمہارے عقیدے کی بات کروں تو سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔" رچرڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس لیے میرا یعنی وسیلے کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اس کا شکریہ ادا کرو جس نے یہ کام کرنے پر مجھے مجبور کیا۔" رچرڈ نے مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو دونوں بہنیں مسکرانے لگیں۔

"میں اور میری بہن دونوں ہی شکرانے کی نمازیں پڑھ کر آئے ہیں۔" پلوشہ نے مسکراتے ہوئے رچرڈ کے جواب میں کہا جبکہ اس کی بہن اس عورت کو پشتو میں سمجھا رہی تھی کہ رچرڈ نے ان سے کیا کہا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کمینہ شخص آپ کی بات مان لے گا۔" پلوشہ نے کچھ دیر بعد کہا اور رچرڈ مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔" رچرڈ نے جواب میں کہا اور دونوں بہنوں کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"اسے سیدھے راستے پر لانے پر مجھے کچھ جھوٹ بولنے پڑے۔" رچرڈ نے اس وقت کہا جب ڈاکٹر ثنا اللہ کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

رچرڈ نے اپنے جھوٹ کی کہانی شروع کی تو دونوں بہنوں نے دلچسپی لے کر

سننا شروع کی جبکہ ان کے ساتھ آنے والی خاتون وہاں سے چپکے سے چلی گئی۔

"لیکن تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟" ڈاکٹر ثنا اللہ نے یہ سوال اس وقت کیا جب رچرڈ اپنی کہانی مکمل کر چکا تھا۔

"میں نہیں جانتا۔" رچرڈ نے وہی کچھ کہا جو سچ تھا وہ واقعی نہیں جانتا تھا کہ اس نے وہ سب کچھ کیوں کیا تھا۔

ڈاکٹر ثناء اللہ کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے لیکن جیسے ہی ان کا بیٹا وہاں پہنچا' وہ اپنی سوچوں کے دھارے سے باہر نکل آئے۔

"اگر میں تم سے ایک اور کام کہوں۔۔۔تو۔۔۔؟" ڈاکٹر ثناء اللہ نے رچرڈ سے سوال کیا۔

"اگر کام کرنے کا ہوا تو میں ضرور کروں گا۔" رچرڈ نے جواب دینے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی لیکن ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی امان اللہ پشتو میں اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔

"اگر آپ ہماری روانگی کی بات کرنا چاہ رہے ہیں تو ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس نے بہنوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں بابا!" ڈاکٹر ثناء اللہ کے کہنے سے قبل پلوشہ نے کہا۔

"میں کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ اس ابراہیم کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے ان دونوں کے جواب میں کہا۔

"یہ مت سمجھنا کہ وہ اپنی اس کھلی خاموشی کو برداشت کرے گا۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا اور رچرڈ نے دل میں سوچا کہ وہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔

"آپ اس جانب سے بے فکر ہو جائیں۔" امان اللہ نے باپ کو اطمینان دلانا چاہا لیکن قبل اس کے ڈاکٹر ثناء اللہ اس سے اس ضمن میں کوئی سوال کرتے' پلوشہ بول پڑی۔

"یہ بہت بری بات ہے کہ ہم اس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں جو ہمارا مہمان

نہیں سمجھ رہا ہے۔"

پلوشہ نے اس جانب توجہ دلائی تو باقی افراد کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور باقی افراد نے بھی معذرت خواہانہ انداز میں رچرڈ کی جانب دیکھا۔

ہم ایک معاملے میں اس انداز سے الجھے تھے کہ ہمیں خیال ہی نہیں رہا کہ ہم سے اتنی بڑی بدتہذیبی ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے ان سب کی ترجمانی کی۔

"آپ کچھ کہہ رہے تھے کہ۔۔۔" رچرڈ نے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔

"وہ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ فی الحال ہم کھانے کی میز پر چلتے ہیں۔" امان اللہ نے کہا اور ڈاکٹر ثناء اللہ سمیت سب اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔

رچرڈ نے کوشش کی کہ اسے واپس جانے کی اجازت مل جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کھانے سے فوراً بعد وہ وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

رات کا باقی حصہ رچرڈ پر بھاری ہی رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور ہی تھی۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کر کے نیند کو قریب لانے کی کوشش کرتا پلوشہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی اور وہ آنکھیں کھولنے پر مجبور ہو جاتا۔

"یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا لیکن اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے وہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟"

رچرڈ نے رات جس طرح گزاری تھی' اس کے اثرات اگلے ہی دن اتنے واضح تھے کہ سب سے پہلے کمانڈر نے ہی اسے ٹوکا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ صرف یہ کہہ کر رہ گیا کہ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" جب رچرڈ کوئی واضح جواب نہیں دے سکا تو وہ خود ہی تجزیہ کرنے لگا۔

"تم نے خود کو یوں بھی ہر طرح کی تفریح سے دور رکھا ہوا ہے۔" کمانڈر نے اپنی سمجھ کے مطابق کہا۔

"شراب سے تم دور ہو کہ بقول تمہارے علاج کے دوران میں کی گئی پابندی

کو تم ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہو۔"

کمانڈر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس سے آگے جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا وہ رچرڈ تو سمجھ گیا لیکن کمانڈر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ کہیں اس سے رچرڈ کی دل آزاری نہ ہو جائے۔

کمانڈر کے احساس دلانے کے بعد رچرڈ محتاط ہو گیا لیکن محتاط ہونے کے باوجود اس روز اس سے وہ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جو عام حالات میں نہیں ہوتی تھیں۔

پلوشہ اس کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو گئی تھی۔ اب جاگتے ہوئے بھی وہ اس کے خیالوں میں کھویا رہتا۔

دن تو اس نے کسی نہ کسی طرح کاٹ لیا لیکن شام ڈھلنے لگی تو اس کی وحشت بڑھنے لگی اس کے اندر کوئی چیز تھی جو اس کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ پلوشہ کی طرف جائے لیکن خود وہ جانتا تھا کہ ایسا کرنا یا ایسا ہونا ناممکن ہے۔

رچرڈ بجھے دل کے ساتھ دفتر سے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ ابراہیم اپنے چار ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔

ابراہیم کا قتل ایسا نہیں تھا کہ ہنگامی حالات نہ ہو جاتے۔ رچرڈ نے کمانڈر کو اطلاع دی اور خود اس جانب روانہ ہو گیا جہاں ابراہیم کو قتل کیا گیا تھا۔

جس جگہ ابراہیم کو قتل کیا گیا تھا' وہ کابل کے نواح میں تھی۔ ابراہیم اس مکان کے گیٹ پر پہنچ کر گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ دو موٹر سائیکل سوار افراد نے کار میں موجود افراد پر اس طرح برسٹ مارے تھے کہ پانچوں افراد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

رچرڈ کی واپسی وہاں سے رات گئے ہوئی تھی۔ جن تفصیلات کا علم اسے وہاں پہنچ کر ہوا اس نے فوراً ہی آگے بڑھا دی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمانڈر خود جائے حادثہ پر پہنچا۔ اس نے مکان میں موجود افراد سمیت ہر شے کو فوری طور پر قبضے میں لینے کا حکم دیا تھا۔

"یہ خبر کسی طرح بھی باہر نہیں آنی چاہیے کہ ابراہیم کن معاملات میں الجھا

ہوا تھا۔'' کمانڈر نے الجھے ہوئے انداز میں رچرڈ سے کہا لیکن ڈرائیو کرتے ہوئے رچرڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے کمانڈر خود کلامی میں بڑبڑا رہا ہو۔

''ابراہیم کا معاملہ تو ہم طالبان پر ڈال دیں گے لیکن ۔۔۔'' رچرڈ نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑا تو کمانڈر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کہیں تم اس قتل کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تو نہیں دیکھ رہے ہو؟'' رچرڈ کی خاموشی نے کمانڈر کو مزید الجھا دیا۔

''جو کچھ ہمیں وہاں سے ملا ہے وہ تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ قتل بھی ڈرگ مافیا کی لڑائی کا شاخسانہ ہے۔'' رچرڈ نے اپنا تجزیہ پیش کیا اور کمانڈر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

''ابراہیم جن لوگوں کے بزنس کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ یہ وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں؟'' رچرڈ نے کمانڈر کی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ گاڑیاں اور ہیروئن کی موجودگی تو یہ ظاہر کرتی ہے۔'' رچرڈ کے سوال کے جواب میں کچھ دیر سوچنے کے بعد کمانڈر نے سوچ میں ڈوبنے والے انداز میں جواب دیا۔

''لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟'' کمانڈر نے اس بار واضح طور پر خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''اس سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ہماری صفوں میں وہ کون لوگ ہیں جو اس طرح کے لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔'' رچرڈ نے ایک اور سوال اٹھایا اور کمانڈر کی سوچ اور گہری ہوتی چلی گئی۔

کمانڈر اپنی سوچ میں گم تھا۔ اس کی سوچ انہی دائروں میں گھوم رہی تھی جس میں رچرڈ چاہتا تھا لیکن خود رچرڈ کی اپنی سوچ کے دائرے ڈاکٹر ثناء اللہ کے خاندان سے الگ نہیں ہو سکے تھے۔ اس نے سوچ سمجھ کر کمانڈر کی سوچ کو اس راستے پر ڈالا تھا ورنہ تو اس کے ذہن میں ابراہیم کی موت کی خبر سننے کے ساتھ ہی جو پہلا نام گونجا' وہ امان اللہ کا تھا۔ وہ امان اللہ جس نے اپنے باپ سے کہا تھا'' کہ اسے ابراہیم کے

بارے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

رچرڈ اس معاملے کے بارے میں جتنا کچھ سوچتا' اتنا ہی اس کا شبہ امان اللہ پر قوی ہوتا چلا گیا۔

''یہ راز آج نہیں تو کل فاش ہو کر رہے گا کہ امان اللہ کے تعلقات اس گروپ سے ہیں جو افغانستان میں دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہیں۔'' رچرڈ نے سوچا۔

''یہ پتا لگانا تمہارا کام ہے کہ ہمارے کون کون سے لوگ ان کاموں میں ملوث ہیں۔'' کمانڈر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ رچرڈ نے چونک کر اسے اس انداز میں دیکھا جیسے کمانڈر نے کوئی نادانی میں بات کر دی ہو۔

''جو لوگ بھی اس کام میں ملوث ہوں گے ان میں سے چھوٹی پوسٹ کا کوئی شخص نہیں ہو گا۔'' رچرڈ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''تم اپنی تحقیق پہنچا دو باقی کام میں دیکھ لوں گا۔'' کمانڈر نے رچرڈ کو مطمئن کرنا چاہا لیکن رچرڈ جانتا تھا کہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ ڈرگ مافیا کے لوگ ہر شخص کو ہٹا دینے کے قائل تھے جو کسی طرح ان کے راستے میں آتا ہے۔ ایک بار انہیں شبہ بھی ہو جاتا کہ رچرڈ کی ذات سے انہیں کوئی خطرہ ہے تو انہیں رچرڈ کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرنے میں بھی شاید چند منٹ بھی نہ لگتے۔

وہ رات پھر رچرڈ نے کرب میں گزاری لیکن اب کی بار اس کے کرب میں شدت سے اضافہ اس طرح ہو گیا کہ اب وہ امان اللہ کی حفاظت کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

سوچ کے دھاروں میں بہتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اسے کھل کر بات کرنی چاہیے لیکن اس کھل کر گفتگو کے فیصلے تک پہنچنے کے باوجود وہ اس فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ اسے براہ راست امان اللہ سے بات کرنی چاہیے یا ڈاکٹر ثناء اللہ سے بات کر کے انہیں معاملے کی سنگینی سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ معاملات سے بہتر طور پر نمٹ سکیں۔

رچرڈ کی اگلی صبح ضرورت سے زیادہ ہنگامی تھی۔ابراہیم کے بیٹے نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی بات کی تھی۔بہت سے سردار اس ایک بات پر اس کا ساتھ دینے کے لیے نہ صرف پہنچ گئے تھے بلکہ بھرپور انداز میں اس کی تائید کر رہے تھے۔وہ جب رچرڈ کے دفتر پہنچا تب بھی اس کے لہجے میں درشتگی برقرار تھی۔رچرڈ نے اس کی بات غور سے سنی اور پھر اس سے سوال کیا کہ ”تم یہ کیسے طے کرو گے کہ ان کی موت کا ذمے دار کون ہے؟“ رچرڈ نے کہا اور ابراہیم کے بیٹے نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔

”آپ کی اطلاع کے ذرائع کمزور ہو سکتے ہیں ہمارے نہیں۔“ ابراہیم کے بیٹے نے کہا اور اس کے ساتھ آنے والوں کی گردنیں اس کی تائید میں ہلنے لگیں۔

”اپنے حواس میں رہ کر بات کرو۔“ رچرڈ نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہماری موجودگی میں وہی ہوگا جو قانون کہتا ہے۔“

رچرڈ کا لہجہ جارحانہ ہو گیا تو ابراہیم کے بیٹے کے ساتھ آنے والوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔رہی سہی کسر کمانڈر کی وہاں آمد نے پوری کر دی۔

رچرڈ گفتگو میں محتاط تھا لیکن کمانڈر کی گفتگو میں کوئی احتیاطی نہیں تھی۔اس نے براہ راست ہیروئن کی سپلائی کی بات شروع کی تو آنے والے بغلیں جھانکنے لگے۔اس دوران ہی میں رچرڈ کو ان کے آپس میں گفتگو سے وہ سب کچھ مل گیا جس کی بنیاد پر آئندہ تحقیقات کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جان گیا کہ آنے والے امان اللہ کو ابراہیم کی موت کا ذمے دار قرار دینا چاہتے تھے۔

”مجھے ڈاکٹر ثناء اللہ کے خاندان پر اپنا یہ راز فاش کرنا ہی ہوگا کہ میں ان کی زبانیں سمجھتا ہوں۔“ رچرڈ نے ان لوگوں کی روانگی سے پہلے فیصلہ کر لیا۔

رچرڈ کا ارادہ تھا کہ وہ شام کو فون کر کے ڈاکٹر ثناء اللہ کی فیملی کی جانب جائے گا لیکن شام ہونے سے پہلے ہی امان اللہ کا فون آ گیا۔

”میں کچھ دیر بعد ایک حکیم کو لے کر آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“ امان اللہ نے کہا۔

”کس سلسلے میں!“ رچرڈ نے حیرت زدہ انداز میں سوال کیا۔

”میں نے آپ کی بتائی ہوئی تفصیل انہیں بتائی تھی جس کے بعد انہوں نے آپ سے ملنا چاہا ہے۔“ امان اللہ نے کہا اور رچرڈ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

”مجھے ان کے آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن۔۔۔۔۔“ رچرڈ نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا تو امان اللہ کی جانب سے اسے قہقہہ سنائی دیا تھا۔

”میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ان پہاڑوں میں بڑے اسرار چھپے ہیں۔“ اس کے لہجے میں رچرڈ کو ایک طنز محسوس ہوا۔

رچرڈ نے اس کے بعد بحث کو مناسب نہیں سمجھا تھا وہ خود بھی امان اللہ سے ملنا چاہ رہا تھا۔اب ایک بہانے سے وہ خود آ رہا تھا تو یہ رچرڈ کے لیے اور بھی اچھا تھا۔

امان اللہ ایک ایسے شخص کے ساتھ آیا تھا جس کی بھنویں تک سفید ہو گئی تھیں لیکن اس کے باوجود اس کی صحت بہت بہتر تھی۔اس نے رچرڈ کی نبض اور آنکھوں اور زبان تک چیک کی اور اس کے بعد جو فقرہ کہا اسے سن کر رچرڈ کا دل چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگائے لیکن اس نے امان اللہ کے توجہ کرنے تک ضبط کیا تھا۔

”ممکن ہے آپ اس بات کو مذاق سمجھیں لیکن کیا حرج ہے۔اگر ہفتہ دس دن حکیم صاحب کی دوا کو ٹرائل دیا جائے۔“ امان اللہ نے کہا اور رچرڈ نے اس کی اس دلیل سے اتفاق کیا۔

امان اللہ حکیم صاحب کے ساتھ آ کر حکیم صاحب کے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا۔تب رچرڈ نے آہستہ سے کہا کہ ”وہ اس سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہے۔“

”اور وہ خاص بات ابراہیم کے حوالے سے ہو گی؟“ امان اللہ نے اتنی آہستہ آواز میں سوال کیا۔

رچرڈ نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”ابراہیم کے مارے جانے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے لیکن میں یہ بات جانتا تھا کہ اگلے دو تین روز میں ابراہیم مارا جائے گا۔“ امان اللہ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بتانا شروع کیا۔

"تم کس طرح جانتے تھے؟" رچرڈ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"پلوشہ ابھی آپ کے پاس نہ آتی اور آپ ابراہیم پر زور دے کر مجھے رہا نہ کرواتے تب بھی میں کچھ دن بعد رہا ہو جاتا۔" امان اللہ نے رچرڈ کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"ابراہیم کے ساتھیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے صرف ابراہیم کا ہی شیلٹر لیا ہے ورنہ ان کی ہمدردیاں بھی پرانے لوگوں کے ساتھ ہیں۔" امان اللہ نے کہا اور رچرڈ نے یوں گردن ہلادی جیسے اس کی سمجھ میں بات آ گئی ہو۔

"میں ان کا قیدی تھا لیکن ڈاکٹر ہونے کے ناطے میں ان کا علاج بھی کرتا تھا اور یوں ان کے زیادہ قریب ہو گیا۔ اس طرح مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ابراہیم کے دن گنے جا چکے ہیں۔" امان اللہ نے اپنی بات مکمل کی جسے رچرڈ نے بظاہر تو قبول کر لیا لیکن اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب اس نے امان اللہ سے طلب نہیں کیا۔

رچرڈ نے محض موضوع بدلنے کے لیے ہیروئن کی بات چھیڑی تھی لیکن امان اللہ نے اگلے چند منٹوں میں ایسے انکشافات کیے کہ رچرڈ کا شک یقین میں بدلتا چلا گیا۔

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کے ثبوت بھی دے سکتے ہو؟" رچرڈ نے سوال کیا اور امان اللہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"مجھے کچھ وقت دیں۔ میں آپ کو ناقابل تردید ثبوت دے دوں گا۔" امان اللہ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

ان دونوں کے درمیان یہ بات طے ہوئی کہ امان اللہ اگلے دس روز میں مکمل معلومات ثبوت کے ساتھ مہیا کرے گا لیکن اس کا ذکر نہ وہ خود نہ رچرڈ کسی سے کرے گا۔

امان اللہ زیادہ دیر رکا نہیں لیکن رچرڈ کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ امان اللہ کسی نئی مصیبت میں مبتلا ہو لیکن ساتھ ہی اسے یقین بھی آ گیا تھا کہ وہ امان اللہ کو بہت دیر تک بچا بھی نہیں سکے گا۔

"مجھے پلوشہ سے اس پر بات کرنی چاہیے۔" رچرڈ خاصی دیر سوچنے کے بعد ایک فیصلہ پر پہنچا لیکن سوال یہ تھا کہ پلوشہ سے ملاقات کس طرح ہو۔

"بہتر ہے اس کا فیصلہ بھی وہی کرے۔" رچرڈ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فیصلہ کیا۔

رات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے رچرڈ نے اپنے فیصلے پر عمل درآمد اگلے روز کے لیے ملتوی کر دیا۔ اگلے روز اسے نیند سے بیدار کر کے بتایا گیا کہ ڈاکٹر ثناء اللہ کی کار پر اسپتال جاتے ہوئے فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں ان کا ڈرائیور ہلاک ہو گیا ہے جبکہ وہ خود زخمی ہیں۔

رچرڈ نے تیار ہونے اور اسپتال پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی لیکن وہاں آپریشن تھیٹر کے باہر پلوشہ کو اکیلے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

"امان اللہ کہاں ہے؟" رچرڈ نے سوال کیا۔

"وہ بھی تھیٹر میں ہے۔" پلوشہ کا جواب تھا اور رچرڈ کو یاد آیا کہ پلوشہ اسے بتا چکی تھی کہ امان اللہ بھی ڈاکٹر ہے۔

"کچھ اندازہ ہے کہ یہ حملہ کس نے کیا ہو گا؟" رچرڈ نے ایک اور سوال کیا۔

"ڈرائیور مرنے سے پہلے بیان دے کر مرا ہے۔" پلوشہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔" رچرڈ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا اور پلوشہ اس کی جانب اس انداز میں دیکھنے لگی جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"یہ ایسی جگہ نہیں ہے کہ ہم اس موضوع پر بات کریں اور نہ ہی یہ وقت ایسا ہے کہ ہم وہ بات کریں۔"

رچرڈ نے پلوشہ کی نظروں سے ابھرنے والے سوالوں کے جواب میں کہا۔

"مقام اور وقت سے فرق نہیں پڑتا۔" پلوشہ نے جواب میں کہا اور رچرڈ سوچ میں پڑ گیا کہ اب وہ کیا کرے۔

"میں منتظر ہوں۔" رچرڈ کی خاموشی بڑھی تو پلوشہ نے اسے ٹوکا۔

''کیا آپ کو اندازہ ہے کہ امان اللہ کے کچھ تعلقات بنیاد پرستوں سے ہیں۔'' رچرڈ نے محتاط انداز میں کہا۔

''بنیاد پرست آپ کس کو کہتے ہیں؟'' رچرڈ نے سوال کیا۔ اس کے لہجے یا انداز میں کسی قسم کی کوئی پریشانی یا گھبراہٹ نہیں تھی۔

''میرا مطلب تھا کہ مجھے شبہ ہے کہ اس کے دہشت گردوں سے رابطے ہیں۔'' رچرڈ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنا مقصد دوسرے انداز میں بیان کیا تو پلوشہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''جو کچھ پہلے افغانستان اور پھر عراق میں ہوا کیا وہ دہشت گردی نہیں تھی؟'' پلوشہ نے ایک سوال کیا تو رچرڈ اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''اسلام میں دہشت گردی کی گنجائش ہی نہیں ہے آفیسر!'' پلوشہ نے کچھ دیر انتظار کے بعد کہا اور رچرڈ کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔

''ہماری تعلیمات کا ایک حصہ یہ ہے کہ جنگ سے ہر ممکنہ حد تک گریز کیا جائے یہاں تک کہ ہمیں حکم ہے کہ ان کے جھوٹے خداؤں کو بھی برا نہ کہو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے سچے خدا کو جھوٹا کہنے لگیں۔'' پلوشہ جب یہ کہہ رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی چمک تھی کہ اس پر نگاہ ٹھہرانا مشکل ہو رہا تھا۔

''پہلے حصے کے برعکس دوسرا حصہ ہمیں واضح حکم دیتا ہے کہ بات اگر تمہارے ذہن کو زک پہنچنے تک پہنچ رہی ہو تو پھر آخری شخص اور آخری سانس تک ڈٹ جاؤ۔'' پلوشہ بولتے بولتے رکی تو رچرڈ کو بولنے کا موقع مل گیا۔

''میں مذہب پر بحث نہیں کرنے آیا ہوں؟'' اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تو تسلیم کریں گے کہ یورپ اور امریکا نے مذہب کی بنیاد پر ایک جنگ کا آغاز کیا ہوا ہے۔'' پلوشہ نے جواب دیا اور رچرڈ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

''میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کے آپ لوگوں کو نقصان نہ پہنچے۔۔۔'' رچرڈ کے دل کی بات آخر کار زبان پر آ ہی گئی جس کے بعد پلوشہ اسے کچھ دیر صرف دیکھتی

رہی۔

''آپ جانتے ہیں آفیسر! کہ میں اور بھائی دونوں طالبان کی بہت سی پالیسیوں کے سخت خلاف تھے۔'' پلوشہ نے ایک وقفے کے بعد کہنا شروع کیا لیکن رچرڈ صیغہ ماضی کے استعمال پر بری طرح چونکا۔

''یعنی۔۔۔کہ۔۔۔اب مخالف نہیں رہے۔'' رچرڈ نے قطع کلامی کی لیکن پلوشہ نے فوری طور پر اس کا جواب نہیں دیا۔

''کیا آپ نے ہمارے لیے کوئی راستہ چھوڑا ہے؟'' پلوشہ نے اس کے سوال کے جواب میں سوال کر کے ایک طرح سے الزام کو قبول کر لیا۔

''یہاں بات صرف میرے بھائی کی نہیں ہے۔'' پلوشہ نے رچرڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوبارہ بات شروع کی۔

''آپ کو اور آپ کے پالیسی سازوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہے کہ اپنے لوگوں پر ظلم ہوتا دیکھ کر اور کوئی دوسرا راستہ نہ پا کر آج کتنے ہی نوجوان انتہا پسندی کے راستہ پر چل پڑے ہیں۔'' پلوشہ کہتے کہتے رکی تو رچرڈ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دلائل کی ٹوکری بالکل ہی خالی ہو گئی ہے۔

''میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ آپ لوگ محفوظ رہیں۔'' رچرڈ نے دبی آواز میں کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' پلوشہ نے نظریں جھکا لیں لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ رچرڈ نے اس کا جواب سنا اور پلوشہ کو یوں دیکھا جیسے پلوشہ کسی اور ہی زبان میں بات کر رہی ہو۔

''عورت کسی بھی علاقے کی ہو وہ اپنی جانب اٹھنے والی نظروں کو پہچانتی ہے۔'' پلوشہ نے کہا اور رچرڈ نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں' اس میں ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔'' پلوشہ نے کہا اور رچرڈ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ ہو۔

"ایک راستہ ہے۔" خاموشی کے اس وقفے میں رچرڈ کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے مانند آیا اور اس نے اس کا فوری اظہار بھی کر دیا۔

"آپ امریکہ میں بیٹھ کر اس پروپیگنڈے کے خلاف جنگ کر سکتی ہیں جو یہاں کے بارے میں ہو رہا ہے۔" رچرڈ نے رائے دی اور پلوشہ مسکرا دی۔

"سینکڑوں ٹی وی چینلز اور ہزاروں اخبارات کے خلاف جنگ؟" پلوشہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"اگر آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ آخری فتح سچ کی ہوتی ہے اور آپ حق پر ہیں تو پھر آپ کا یہ سوچنا کہ مقابلہ کس سے ہے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔" رچرڈ نے دلیل دی اور پلوشہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

"جب تک آپ کسی فیصلے پر پہنچیں تب تک یہ مشورہ تو آپ دے سکتی ہیں کہ باقی لوگوں کو محتاط رہنا چاہیے۔" رچرڈ نے کہا اور پلوشہ نے حامی بھر لی کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

رچرڈ اس کے بعد وہاں رکا نہیں۔ اسے یہ فکر تھی کہ مرنے والے ڈرائیور نے کیا بیان دیا ہے۔ رچرڈ نے وہ بیان حاصل کیا تو وہ وہی تھا جس کا اندیشہ اسے پہلے سے تھا۔

کمانڈر نے اس روز بگڑتی ہوئی صورت حال پر ایک ہنگامی میٹنگ بلائی تھی۔ رچرڈ کو حیرت ہوئی کہ میٹنگ میں موجود اکثر لوگوں نے ان تمام افراد کی حمایت میں دلائل دیئے تھے جو کسی نہ کسی طرح ان جرائم میں ملوث تھے۔

"ہمیں کسی طرح بھی ان لوگوں سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہیے جو اب تک ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔" ان سب کی رائے تھی۔

"ہمیں ان کے اندرونی معاملات سے بھی خود کو الگ رکھنا چاہیے۔" ابراہیم اور اس کے بیٹے کے لیے دلائل دینے والے شخص نے ایک نظر رچرڈ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"چاہے وہ ہیروئن جیسے گھناؤنے جرم میں بھی ملوث ہوں۔" کمانڈر نے

طنزیہ انداز میں سوال کیا تو رچرڈ کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے اس شخص نے اس کی بھی حمایت کر دی۔

"ایک بڑے مقصد کے لیے کچھ چھوٹے جرائم سے نظریں ہٹانی ہوں گی۔" اس نے کہا۔

میٹنگ کے دوران رچرڈ کو یوں محسوس ہوتا رہا کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور پھر اس کا اظہار کمانڈر نے میٹنگ کے بعد خود رچرڈ سے بھی کر دیا۔ وہ خود اس صورت حال سے خوش نہیں تھا لیکن اس کا کوئی حل بھی اس کے پاس موجود نہیں تھا۔

کمانڈر نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ بیشتر لوگ اس لیے خفا ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق رچرڈ کو غیر ضروری اہمیت دی جا رہی ہے۔

"ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تمہیں ان معاملات میں بھی ملوث کیا جاتا ہے جہاں تمہارا کوئی رول نہیں ہونا چاہیے۔" کمانڈر نے بے بس ہو جانے والے انداز میں کہا۔

"اس کی وجہ میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی۔" رچرڈ نے کھل کر بات کرنے کی بجائے محتاط انداز میں کہا اور کمانڈر نے یوں گردن ہلا دی جیسے وہ بات کو سمجھ رہا ہو۔

رچرڈ نے اس کے بعد کا وقت دفتر میں ہی گزارا لیکن اس نے محسوس کیا کہ کمانڈر بھی اس سے کچھ الگ تھلگ رہنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن شام میں ڈاکٹر ثناء اللہ کی طرف جاتے ہوئے کمانڈر نے اسے ساتھ لیا۔

ڈاکٹر ثناء اللہ کے ساتھ کمانڈر کی ملاقات رسمی سی تھی۔ رچرڈ کیونکہ خود محتاط تھا اس لیے اس نے بھی کوئی زیادہ گفتگو نہیں کی لیکن جب کمانڈر نے ڈاکٹر ثناء اللہ سے۔۔۔ اچانک امن و امان پر بات کی تو رچرڈ چوکنا ہو گیا۔

"جب تک مقامی لوگوں کا اعتماد بحال نہیں ہو گا صورت حال میں واضح فرق نہیں آئے گا۔"

ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا اور کمانڈر کا اگلا سوال اسی کے متعلق تھا کہ "اعتماد کیسے بحال کیا جائے؟"

"اس کا جواب آپ کے پاس ہے۔" ڈاکٹر ثناء اللہ نے ذو معنی انداز میں

کہا۔

''اس خطے کی تاریخ بتاتی ہے کہ باہر سے آنے والوں کو آخر یہاں سے جانا پڑا ہے۔اب اچھی بات یہ ہوگی کہ جلد از جلد کام نمٹایا جائے۔'' ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا اور کمانڈر نے رچرڈ کی جانب اس انداز میں دیکھا جیسے چاہتا ہو کہ وہ کچھ کہے لیکن رچرڈ نظریں چرا گیا۔وہ خود بھی ڈاکٹر ثناء اللہ سے متفق تھا۔

کمانڈر رچرڈ پر مہربان تھا۔وہ رچرڈ کی کیفیت کو سمجھتا تھا اور اسی لیے اس نے واپسی کے سفر میں رچرڈ کی دل جوئی کرنے کی کوشش بھی کی۔رچرڈ بھی ایک فیصلے تک پہنچ گیا تھا۔

اگرچہ ایک ہستی ایسی تھی جو اسے اس کے فیصلے تک پہنچنے تک روک رہی تھی پھر بھی اس نے کمانڈر سے دبے الفاظ میں اپنی بات کہہ ڈالی جسے سن کر کمانڈر نے خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے بھی یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ہم ایک ایسے جال میں الجھ گئے ہیں جس سے نکلنے کا فی الحال کوئی راستہ نہیں ہے۔'' کمانڈر نے کافی دیر بعد کہا۔

وہ رات رچرڈ پر باقی راتوں سے زیادہ بھاری تھی۔یہ احساس کہ وہ پلوشہ سے دور ہو جائے گا' اسے بے چین کر رہا تھا۔دوسری جانب اس بات کا بھی اسے شدت سے احساس تھا کہ اب وہ لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا ہے لیکن اسے ایک درمیانہ راستہ نظر آیا اور اس راستے پر پہلا قدم اس نے اگلی صبح ابراہیم کے بیٹے سے بات کرتے ہوئے اٹھایا۔

''تمہارے والد نے آخری ملاقات میں ایک آفر کی تھی۔'' رچرڈ نے کہا اور ابراہیم کے بیٹے کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات بکھر گئے۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔

''تب تو تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں نے ان سے کیا کہا تھا۔'' رچرڈ نے کہا اور ابراہیم کے بیٹے نے اس کا بھی اقرار کر لیا کہ وہ یہ بھی جانتا ہے۔

''میں اس کام کے لیے تیار ہوں۔'' رچرڈ نے آہستگی سے کہا۔ابراہیم کے

بیٹے نے اپنی خوشی کا اظہار بھرپور انداز میں اس طرح کیا کہ اس نے رچرڈ سے ہاتھ ملا لیا۔

ابراہیم کے بیٹے سے تفصیلات طے کرنے میں رچرڈ کو زیادہ وقت نہیں لگا تھا باپ اور بیٹے میں صرف چہرے اور نام کا ہی فرق تھا۔

جو رقم رچرڈ کو آفر کی گئی تھی' وہ اتنی تھی کہ رچرڈ باقی زندگی آرام سے گزار سکتا تھا۔اس کے باوجود اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن وہاں رکے رہنے کے لیے اسے اس طرح کا کوئی سہارا چاہیے تھا۔اس کا وہاں رکنا اس لیے ضروری تھا کہ پلوشہ وہاں تھی۔

ابراہیم کے بیٹے سے ڈیل کرنے کے بعد رچرڈ مطمئن ہو گیا لیکن چند گھنٹوں بعد ڈاکٹر ثناء اللہ سے ہونے والی گفتگو نے اسے بے چین کر دیا۔انہوں نے اسپتال سے فون کیا تھا کہ وہ رچرڈ سے ملنا چاہتے ہیں۔رچرڈ ان سے ملا تو انہوں نے کسی تمہید کے بغیر براہِ راست وہیں سے بات شروع کی جہاں پر پلوشہ سے ختم ہوئی تھی۔

''مجھے تمہاری بات میں وزن محسوس ہوا تھا اس لیے میں نے امریکا میں مقیم اپنے دوستوں سے بات کی ہے اور وہ بھی اس سے متفق ہیں۔'' ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' رچرڈ نے بجھے دل کے ساتھ کہا۔

''تمہاری مدد کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔'' ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا۔اس کے بعد ان کے درمیان چپکے چپکے بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

''میرے خیال سے اب وقت آ گیا ہے کہ ماڈرن اور تہذیب یافتہ دنیا کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں اس دورافتادہ اور غیر تہذیب یافتہ علاقے میں کون کون سے انسانیت سوز مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔'' ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا اور رچرڈ ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس ملاقات کے بعد کا ہفتہ رچرڈ کی زندگی کا سب سے مشکل ترین ہفتہ تھا ایک جانب اگر یہ معجزہ ہو رہا تھا کہ حکیم کی دوا اپنا اثر دکھا رہی تھی تو دوسری طرف پلوشہ امریکا روانہ ہو رہی تھی جبکہ خود اپنی جگہ برقرار رہنے کے لیے رچرڈ ابراہیم کے بیٹے کے

ساتھ تعاون کر رہا تھا۔

دنیا بھر کے اخبارات میں جب مظالم کی تصاویر شائع ہوئیں تو سوئی ہوئی دنیا جاگنے لگی۔ ابتداء میں جھوٹ کو فروغ دینے والوں نے اسے جھٹلایا لیکن پھر انہیں وہ سب کچھ تسلیم کرنا پڑا۔ کچھ لوگوں کو عدالتوں تک لایا بھی گیا لیکن ساتھ ہی اس کی تحقیقات بھی ہوتی رہیں کہ یہ سب کچھ باہر کس طرح آ رہا ہے۔ آخر کار وہ لوگ رچرڈ تک پہنچ ہی گئے۔

رچرڈ نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا لیکن اسے دوسرے الزامات کے تحت کورٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑا اور مختصر سی پیشیوں کے بعد اسے تین برس سزا بھی سنا دی گئی۔

رچرڈ اس وقت قطر میں ہے۔ اپنی سزا پوری کر رہا ہے۔ ایک سال بعد وہ رہا ہو جائے گا تو سیدھا نیویارک پہنچے گا جہاں پلوشہ اس وقت اپنے کام میں مصروف ہے۔

رچرڈ نہیں جانتا تھا کہ پلوشہ اس کا استقبال کس طرح کرے گی لیکن ایک موہوم سی امید اسے ضرور ہے کہ پلوشہ اسے یعنی محمد رؤف کو قبول کر لے گی۔ اپنے آخری خط میں رچرڈ نے اسے اطلاع دی تھی۔ ساتھ ہی ابراہیم کے بیٹے اور ان جیسے لوگوں سے کمائی ہوئی تمام رقم بھی اس نے پلوشہ کے نام کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے اس کا استعمال کرے۔

❀ ❀ ❀

کشتی ماہ نور

جان محمد نے گہری سانس لی اور فضا میں موجود تازگی کو اپنے پھیپھڑوں میں سمونے کی کوشش کرنے لگا۔ دو گھنٹے پہلے وہ کراچی کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے تھے۔

جان محمد اس کشتی ماہ نور کا بحری کپتان تھا جس پر اس کے علاوہ پانچ ماہی گیر سوار تھے۔ ان میں اس کے دو بھائی ولی محمد اور غلام محمد تھے۔ ان کے علاوہ تین ماہی گیر ابراہیم، نادر اور قاسم تھے۔ سب تجربہ کار ملاح تھے۔ گزشتہ دس بارہ سال سے مچھلی پکڑنے کے لیے کھلے سمندر میں جاتے رہتے تھے۔ اب سمندر میں جانا اتنی عام سی بات تھی جتنی کہ کسی شخص کیلئے دفتر جانا۔ سمندر کا خوف ان کے دلوں سے مٹ چکا تھا۔ اس کے باوجود روانگی سے پہلے وہ دعا مانگتے تھے۔

"اے خدا! تیرا سمندر وسیع ہے اور ہماری کشتی چھوٹی سی ہے، اسے اپنی

حفاظت میں رکھ۔۔۔۔''

جان محمد دوسرے ملاحوں سے منفرد دعا مانگتا تھا۔وہ پیروں ،فقیروں اور مزارات پر جانے کا قائل نہیں تھا۔

جب اسے کسی مزار پر چلنے کو کہا جاتا تو وہ کہتا ''اللہ سے بہتر حفاظت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

گھر والے اور دوست احباب الزام اس کی تعلیم کو دیا کرتے تھے۔جان محمد اپنے گھرانے بلکہ خاندان کا واحد فرد تھا جس نے کالج کا منہ دیکھا تھا۔وہ سیکنڈ ائیر کے بعد باپ کے مرنے کے بعد اس کی کشتی سنبھالنے پر مجبور ہو گیا تھا۔کیونکہ اب گھر کا بڑا وہی تھا۔اس سے چھوٹے دو بھائی بچپن میں باپ کے ساتھ سمندر میں جانے لگے تھے انہیں پڑھنے لکھنے اور اسکول جانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔دوسری تیسری کلاس سے چھوڑ کر انہوں نے باپ کے ساتھ کام شروع کر دیا تھا۔جان محمد بھی کئی بار باپ کے ساتھ سمندر میں گیا مگر اسے کشتی چلانے اور مچھلیاں پکڑنے سے خاص دلچسپی نہیں تھی البتہ جب ذمہ داری سر پر پڑی تو اس نے اپنا کام پوری توجہ اور لگن سے کیا۔جلد ہی اس نے اپنے آپ کو ماہ نور کا بحری کپتان تسلیم کروالیا۔حتیٰ کے اس کے باپ کا دوست اور اس کا نائب خدا بخش بھی اس کی صلاحیت کا قائل ہو گیا تھا۔

اس نے کہا ''اڑے مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے۔''

خدا بخش جب تک اس کے ساتھ رہا، اس نے اس کے تجربے سے بھرپور فائدہ اٹھایا پھر اسے عمر نے کشتی چھوڑنے پر مجبور کیا تو جان محمد نے کشتی کو خود چلانا شروع کر دیا۔کئی مواقع ایسے آئے جب ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئی تھیں لیکن جان محمد نے موت سے رسہ کشی کر کے اپنے ساتھیوں اور کشتی کو مشکل سے نکال لیا تھا۔

لیکن ایک طوفان سے بچ کے نکلنا خدا کے بعد جان محمد کا مرہون منت تھا اچانک آنے والے اس طوفان میں کئی ماہی گیر کشتیاں غائب ہو چکی تھیں۔جن پر درجنوں ماہی گیر سوار تھے۔جان محمد کی کشتی بچ کر آنے والی چند کشتیوں میں سے ایک تھی بلکہ طوفان کا سامنا کرنے کے باوجود بچ کر آنے والی واحد کشتی تھی۔

جان محمد متوسط قامت اور جسامت کا خوش رو نوجوان تھا۔سر کے ہلکے گھنگریالے بال اور دو تین دن کی بڑھی ہوئی شیو اس پر بجتی تھی۔کشتی کا انجن کھلے سمندر میں آتے ہی بند کر دیا گیا تھا۔تقریباً سینتیس فٹ لمبی اور پندرہ فٹ چوڑی ماہ نور انجن کے علاوہ دو عدد بادبانوں کے سہارے بھی سفر کرتی تھی۔بادبان چڑھانے کے بعد وہ اپنے کاموں میں لگ گئے اور جان محمد کشتی کے اگلے حصے میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور دسمبر کا آخر ہونے کی وجہ سے اس کی حرارت خوشگوار لگ رہی تھی وہ جانتا تھا کہ کھلے سمندر میں موسم بدل جائے گا اور انہیں اتنی سردی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

جان محمد جب کشتی لے کر شکار پر نکلا کرتا تھا تو اس کے ذہن میں ہمیشہ آگے کا خیال ہوتا تھا کہ اس بار انہیں کیسا شکار ملے گا۔موسم کیسا رہے گا اور واپسی میں کتنا عرصہ لگے گا؟ مگر آج وہ گزرے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔اس کی نسبت اس کے بچپن میں خدا بخش کی لڑکی مہر والنساء سے طے پا گئی تھی۔اس بار سمندر میں جانے سے پہلے دونوں بزرگوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ واپسی پر مہرو کو اس کی دلہن بنا دیں گے۔

''مہرو!'' اس نے مسکرا کے زیر لب نام لیا۔یہ نام اس کے لیے مٹھاس کی علامت تھا۔مہرو کا گھر اس کے گھر سے دو گلی آگے تھا۔جب وہ دونوں بھائی شکار پر جاتے تو ان کے پیچھے مہرو اماں کا خیال رکھتی تھی۔ایک بار اتفاق سے وہ لوگ جلدی واپس آ گئے۔جان محمد گھر آیا تو مہرو صحن میں لگے نیم کے درخت سے جھولا جھول رہی تھی۔یہ پینگ خاص طور سے جان محمد نے اس کے لیے لگوائی تھی۔دس بارہ سال سے اس جھولے میں نئی پیڑھی لگتی تھی۔

باپ کے مرنے کے بعد ماں نے نئی پیڑھی لگانے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔اس معاملے میں وہ اتنی حساس تھی کہ سوائے مہرو کے کسی کو اس جھولے میں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ولی اور غلام کبھی کبھی اماں سے مذاق کرتے۔

''ماں۔۔۔!جب بڑا بھائی کا بیوی جھولا جھولے گا تو ہمارا بیوی لوگ منہ دیکھے گا۔۔۔اس لئے وہ بھی جھولا جھولے گا یہی والا۔۔۔''

''یہ مہرو کا جھولا ہے۔''

''اچھا پھر ہماری بیوی کے واسطے دوسرا جھولا لاؤ۔۔۔''

''وہ جھولا نہیں جھولے گا۔ ادھر مہرو کی خدمت کرے گا۔ ہمارے بعد وہ گھر کا بڑا ہو گا۔''

جان محمد کے اندر آتے ہی مہرو جھولے میں ہی سمٹ گئی اور جان محمد دم بخود سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ ان کے ہاں پردے کا رواج نہیں تھا۔ لیکن مہرو شاذ ہی اس کے سامنے آتی تھی۔ اس روز اس نے اوڑھنی بھی ایک طرف رکھی تھی اور جب اس بات کا احساس ہوا تو وہ بدحواسی میں جھولے سے اترتے ہوئے گر گئی۔ جان محمد نے پھرتی سے اسے زمین سے اٹھا لیا۔ اس کے مضبوط بازوؤں میں چند ثانیے تک مہرو کا بدن لرزتا رہا پھر وہ جلدی سے دوڑ گئی۔ اس کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی۔ وہ اوڑھنی لے کر اندر جانے لگی۔ جان محمد نے دھیرے سے پکارا۔

''مہرو۔۔۔!''

''جی؟'' وہ روک گئی۔

''میرا آنا اچھا نہیں لگا تجھے۔''

''نہیں۔'' وہ شرماتی ہوئی بولی۔

''پر تو اچانک آ گیا۔''

''اچھا بتا اماں کیسی ہے اور تیرا بابا کیسا ہے؟ اس بار وہ بندرگاہ پر نہیں ملا۔''

''ماں ٹھیک ہے اندر سو رہی ہے۔ بابا کی طبیعت کل سے خراب ہے۔ سردی لگ رہی تھی۔''

''میں انہیں دیکھنے آؤں گا۔ اچھا میں تیرے لیے ایک چیز لایا ہوں۔''

''کیا؟'' مہرو سراپا اشتیاق بن گئی۔

''یہ دیکھ۔۔۔۔'' جان محمد نے کرتے کی جیب سے ڈبا نکالا اور اس میں سے چاندی کے کڑے نکالے ''پر اپنے ہاتھ سے پہناؤں گا'' اس نے شرط لگا دی۔

''ہاتھ سے پہنائے گا۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''میرا ابا مارے گا تو مار کھائے گا۔''

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' جان محمد سادگی سے بولا۔

''اچھا ایسا کر میں ابھی پہنا دیتا ہوں تو گھر جا کر اتار دینا۔''

''کیا میں وہ چیز اتار سکتی ہوں جو تو پہنائے گا۔'' وہ بے ساختہ بولی اور پھر شرما گئی۔

''اچھا ایسا کر چھپا کر رکھ لے۔'' جان محمد نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''جب مجھے حق مل جائے گا تو میں تجھے خود پہناؤں گا۔''

مہرو نے کسی قدر ہچکچا کر اس سے کڑے لے لیے اور پھر اندر بھاگ گئی۔ ہر بار جب وہ کشتی لے کر سمندر میں جاتا تو مہرو اس سے ضرور ملنے آتی۔ اس بار جب وہ جا رہا تھا تو ایک دوپہر مہرو اس سے ملنے آئی تھی۔ ماں عادت کے مطابق آرام کر رہی تھی ولی اور غلام باہر گئے ہوئے تھے۔ روانگی سے پہلے ضروری راشن لینا تھا۔ جان محمد کو معلوم تھا کہ مہرو ضرور آئے گی اس لیے وہ گھر میں انتظار کر رہا تھا مخصوص دستک۔ اور پھر پازیب کی چھن چھن نے اسے بتا دیا کہ مہرو آ گئی ہے۔ وہ نیم کے پیچھے چھپ گیا۔ مہرو اندر گئی۔ گھر دیکھا اور پھر افسردگی سے جھولے میں آ کر بیٹھ گئی۔ اسے خیال آیا کہ اس بار جان محمد اس سے ملے بغیر چلا گیا ہے۔

جان محمد نے چپکے سے درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

''جان!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''تجھے کیسے پتہ چلا؟'' وہ اس کے سامنے آ گیا تو مہرو کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا لمس اس کے ذہن میں رچا بسا ہے۔

''میں سمجھ رہی تھی کہ تو ملے بغیر چلا گیا ہے۔'' مہرو بولی۔

''پاگل ایسا ہو سکتا ہے۔ میں تجھے ملے بغیر موت کے فرشتے کے ساتھ بھی نہ جاؤں۔''

''خدا نہ کرے!'' مہرو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسی باتیں نہ کر۔ میرا دل پہلے ہی گھبرا رہا ہے۔''

''حالانکہ تجھے خوش ہونا چاہیے۔ میں جلد واپس آؤں گا۔''

''مذاق نہ کر۔ میں سچ سچ پریشان ہوں۔ میں نے کل خواب میں دیکھا ہے کہ کشتی آ گئی ہے پر تو نہیں آیا ہے۔''

''ہوسکتا ہے کسی جل پری کا دل آ گیا ہو مجھ پر۔'' جان محمد بدستور مذاق کے انداز میں بولا۔

''پاگل یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' جان محمد سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''میرے بغیر کشتی کیسے جائے گی اور کشتی نہیں جائے گی تو مچھلیاں کیسے لائیں گے۔ اس بار تو مجھے ہمیشہ سے زیادہ مچھلیاں لانی ہیں۔ آخر تیرے لیے کپڑے اور زیور بھی تو بنانا ہے۔''

مہرو کے چہرے پر ذرا سرخی آ گئی مگر اس کی فکر میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے منع کرنے پر جان محمد رکے گا نہیں۔ یہ اس کے روزگار کا سوال تھا اور کوئی مرد عورت کے کہنے پر روزگار نہیں چھوڑ سکتا۔

''اچھا وعدہ کر اپنا خیال رکھے گا۔''

''بابا۔۔۔۔خیال تو رکھتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''دیکھ مہرو! اپنا کام سمندر سے کھیلنا ہے۔ مچھلی پکڑنے کے لیے سمندر میں جانا پڑتا ہے۔ مچھلی پکڑتے ہیں تو گھر کا چولہا جلتا ہے۔ آئندہ کبھی مجھے جانے سے مت منع کرنا۔ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔ روزی سے بندہ منہ موڑے تو روزی بھی اس سے منہ موڑ لیتی ہے۔''

''اچھا نہیں روکوں گی۔'' مہرو نے آنکھیں صاف کیں۔

''میں تیرا انتظار کروں گی۔''

''مہرو! یقین رکھ میں آؤں گا۔ تیرا انتظار مجھے لائے گا۔ اپنے رب پر پورا بھروسا ہے اس بار بھی وہ مجھے کامیاب لائے گا۔''

''اللہ بھلا کرے!'' مہرو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اسے خدا حافظ کہہ

کر تیزی سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

''اڑے بابا! کب تک ادھر بیٹھا رہے گا۔'' یہ ابراہیم تھا۔

''خیریت تو ہے نہ۔ تین گھنٹے سے مسکرا رہا ہے۔'' ابراہیم کا لہجہ معنی خیز تھا۔ جان محمد جھینپ گیا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔''

ابراہیم ہنسنے لگا۔ ''یہ ٹائم ادھر بھی گزرا ہے۔ شادی کے بعد سمندر میں جانا عذاب لگتا تھا پر اب ٹھیک ہے۔ چار بچے ہیں گھر والی ان میں لگی رہتی ہے۔ جاؤ تو بات کرنے کو وقت نہیں ملتا ہے۔''

''کیوں بھابھی کے لیے ایسا بولتا ہے۔ وہ تو آنکھیں بچھا کر تیرا انتظار کرتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

ابراہیم بتیس برس کا توانا اور لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کا باپ بدمعاش تھا جوئے کا اڈا چلاتا تھا۔ بیوی اور بیٹا اس کے کام کے خلاف تھے۔ ابراہیم ابھی بارہ برس کا تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں سمیت اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ بارہ برس سے ابراہیم روزگار پر لگ گیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایک باربردار کشتی پر ملازم ہو گیا اور چھ سال سے جان محمد کے ساتھ تھا۔ عمر میں اس سے پانچ سال بڑا تھا لیکن دونوں میں دوستوں جیسی بے تکلفی تھی۔ ابراہیم ان میں سب سے زیادہ جفاکش تھا۔ اسی وجہ سے جان محمد اسے سب سے زیادہ معاوضہ دیا کرتا تھا۔ منوں مچھلی سے بھرا جال وہ آسانی سے کشتی پر کھینچ لیتا تھا۔

اس بار سرکریک کی طرف جانے کے ارادے سے نکلے تھے۔ سمندر کا یہ حصہ انڈیا کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھا اور اس طرف ماہی گیری کرنا خاصا مشکل کام تھا۔ ماہی گیری کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس بات سے خطرہ رہتا تھا کہ بھارتی کوسٹ گارڈ کے لوگ انہیں کشتی سمیت پکڑ کر نہ لے جائیں۔ اکثر بھارتی ماہی گیر اس سمندر میں غیر

قانونی طور پر آتے تھے اور وہاں گشت کرنے والی میری ٹائم کی وہ لانچیں انہیں گرفتار کر کے لے جاتی تھی۔ جواب میں بھارتی اپنے ماہی گیروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پاکستانی حدود میں گھس کر پاکستانی ماہی گیر کشتیوں کو مع ماہی گیروں کے پکڑ کے لے جاتے تھے۔ بظاہر اس کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ گرفتار ہونے والے پاکستانی ماہی گیروں کو اپنے گرفتار ماہی گیروں کو چھڑانے کے لیے بطور حربہ استعمال کیا جائے۔ آئے دن دونوں طرف سے ماہی گیروں کی گرفتاری اور رہائی کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔

لیکن اس معاملے میں دیکھا گیا تھا کہ ایک طرف پاکستان کے حکام گرفتار کیے جانے والے بھارتی باشندوں کے ساتھ بہتر سلوک کرتے تھے اور دوران قید ان کی حفاظت دیکھ بھال کے ساتھ کی جاتی تھی تو دوسری طرف پاکستانی ماہی گیروں کے ساتھ بھارتی حکام کا رویہ حد درجہ متعصب اور کسی حد تک بہیمانہ ہوتا تھا۔ اب تک کئی ماہی گیر بھارتی جیلوں میں تشدد، ناقص خوراک اور علاج نہ کروانے کی وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں اور جو زندہ بچ کر آئے تھے وہ بھی بے چارگی اور بے بسی کی منہ بولتی تصویر بن کر آئے تھے۔ ان میں شاید ہی کوئی پاکستانی ایسا ہوتا جس کے جسم میں بھارتی تشدد کے نشانات نہ بنائے گئے ہوں۔

سر کریک کا علاقہ صدیوں سے ماہی گیروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ کچھ علاقے میں زلزلے آنے سے خشکی کا اایک بڑا حصہ سمندر کی نظر ہو گیا تھا۔ ان کھاڑیوں کے اتھلے پانیوں میں مینگروز اور دوسرے ساحلی پودے پائے جاتے ہیں۔ یہ پودے نہ صرف مچھلیوں اور جھینگوں کے لیے پناہ گاہ ہوتے ہیں بلکہ وہ یہیں پر انڈے بچے دیتے ہیں اور ان سے غذائی مواد بھی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں پر پائی جانے والی لذیذ اقسام کی مچھلیوں کی وجہ سے ماہی گیر کراچی اور دوسرے ساحلی شہروں سے سینکڑوں میل سفر کر کے اس سمندر کا رخ کرتے ہیں۔

بہر حال خطرہ بھارت جیسے دشمن کا ہی کیوں نہ ہو۔ غریب مچھیرے روزگار کے لیے کریک جاتے تھے اور وہاں سے مچھلی پکڑ کر لاتے تھے اپنی بساط کے مطابق قومی

معیشت میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی مچھلی کا فائدہ درمیانی تاجر لے جاتے تھے جو سارے سال سکون سے بندرگاہ پر اپنے دفتروں میں بیٹھے رہتے تھے اور ماہی گیروں سے اونے پونے دام مچھلی خرید کر شہریوں کو مہنگے ترین دام بیچا کرتے تھے۔ جو بے چارے جان پہ کھیل کر اور مہینوں گھروں سے دور وقت گزار کر یہ مچھلی لاتے تھے انہیں بس اتنا ملتا تھا کہ ان کے گھروں کے چولھے روشن رہیں۔ ان کے بوسیدہ جال اور کشتیاں مرمت ہوتی رہیں اور اگلے پھیرے ان کے پاس ایندھن اور راشن خریدنے کی رقم ہو۔

جان محمد اور اس کے بھائیوں نے اپنے باپ سے ورثے میں پچیس سال پرانی یہ لانچ پائی تھی جو اب حد سے زیادہ بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اس کے مرمت طلب حصوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے مکمل اوور ہالنگ اور انجن کی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ ماہ نور کا سرد خانہ مچھلیوں کو دو ہفتے سے زیادہ محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس میں برف آنے سے مچھلیوں کی تعداد میں بھی کمی آ جاتی تھی اور ہالنگ کے بعد اس میں بیس پچیس فی صد مچھلی آ سکتی تھی لیکن اس کام کے لیے ان کے پاس رقم نہیں تھی۔ دوست محمد ان کے سر دو لاکھ کا قرض بھی چھوڑ گیا تھا۔ اس نے کشتی کا انجن بدلوایا تھا۔ عام طور سے انجن کی زندگی دس سال ہوتی ہے۔ لیکن ماہی گیر اسے پندرہ بیس سال بھی چلا سکتے ہیں انجن اور کشتی ہمیشہ ہی قرض پر لی جاتی ہے اور اس کی مدت حیات ختم ہونے سے پہلے اس کا قرض بھی پورا نہیں ہوتا ہے۔ جب قرض اور کشتی ایک ساتھ ختم ہوتے ہیں تو نئی کشتی سے نیا قرض چڑھ جاتا ہے۔ یہی معاملہ انجن کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی مدت حیات تک استعمال کر کے ماہی گیر قرض ادا کرتے ہیں اور پھر اونے پونے بیچ کر رقم سے کچھ عرصہ عیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد قرض لے کر نیا انجن لے لیتے ہیں۔

جان محمد اور اس کے بھائیوں نے قرض تقریباً ادا کر دیا تھا اور اب کشتی کو نئے انجن کی ضرورت تھی۔ لیکن جان محمد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس انجن کو اونے پونے نہیں بیچے گا بلکہ اس کی مرمت کروا کے اسے مناسب قیمت میں بیچ کر انجن خرید لے گا۔ سود خوروں کے مقابلے میں بینک کا سود مناسب تھا اور آسانی سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ جان

محمد کا اندازہ تھا کہ اس طرح وہ سال میں بیس پچیس ہزار بچا لیں گے۔

اب تک عادل سرمانی کو مچھلی دیتے رہے تھے لیکن پچھلے دو سال سے اس نے ریٹ میں اضافہ نہیں کیا تھا جبکہ برآمدات کھلنے کے بعد مچھلی کے دام خاصے چڑھے تھے جانے سے پہلے جان محمد نے اس سے بات کی اور اسے وارننگ دی تھی کہ اس نے دام نہیں بڑھائے تو وہ مچھلی بے شک سمندر میں پھینک دے لیکن اسے نہیں دے گا۔ عادل سرمانی نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ اس بار دام ضرور بڑھائے گا لیکن یہ تسلی وہ پچھلے ایک سال سے دے رہا تھا۔ جان محمد جانتا تھا کہ اگر اس نے ریٹ نہیں بڑھائے تو وہ اسے مچھلی دینے پر مجبور ہوگا۔ درمیان میں ایک بار اس نے بولی بھی لگوائی تھی لیکن اس میں اسے اتنے کم دام ملے کہ اس نے آئندہ کے لیے توبہ کر لی تھی۔

سورج غروب ہونے پر اس نے نیچے کیبن میں جھانکا۔ اس مختصر کیبن میں کچن اور اسٹور تھا۔ اس میں ان کا سامان رکھا تھا۔ سوتے وہ اوپر ہی تھے۔ دن میں سورج کی روشنی سے بچنے کے لیے کشتی کے سامنے والے حصے میں سائبان تھا۔ کشتی کا بیشتر حصہ سرد خانے پر مشتمل تھا۔ رقم کم ہونے کی وجہ سے انھوں نے صرف سو گیلن ڈیزل لیا تھا۔ اس کی مدد سے کشتی کوئی سو میل کا فاصلہ انجن کی مدد سے طے کر سکتی تھی۔ مگر انجن وہ اشد ضرورت کے وقت استعمال کرتے۔ خاص طور پر جال ڈالتے وقت۔

ماہ نور میں تقریباً چھ ہزار کلوگرام مچھلی لادنے اور محفوظ کرنے کی گنجائش تھی۔ روانگی سے پہلے چار ٹن سے زیادہ برف اس کے سرد خانے پر پڑ گئی تھی۔ کشتی پر بوجھ کم کرنے کیلئے وہ اضافی مچھلی بھی لاد سکتے تھے لیکن اس کا انحصار ملنے پر تھا۔ اگر پہلے ہفتے میں خاصا شکار مل جاتا تو ان کے پاس راشن اور پانی زیادہ ہوتا پھر ایندھن بھی اتنا استعمال نہ ہوتا۔ اس وجہ سے وہ کشتی پر اضافی بوجھ نہیں لاد سکتے تھے۔ البتہ دوسرے ہفتے تک وہ خاصی مچھلی لے جا سکتے تھے لیکن وہ اضافی مچھلی کے چکر میں پڑنے کی بجائے جلد از جلد کوٹا مکمل کر کے واپس جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح پھیرے کے اخراجات تو کم ہوتے ہی تھے انہیں سیزن میں زیادہ سے زیادہ پھیرے لگانے کا موقع ملتا تھا۔ مگر اس بار جان محمد کا ارادہ تھا کہ وہ کشتی کو آخری گنجائش تک بھر کے لے جائے گا

کیونکہ اس کی شادی تھی اور اسے زیادہ سے زیادہ رقم کمانی تھی۔ شاید اس لیے اس نے ایندھن پانی اور راشن کی مقدار معمول سے کم رکھی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ نو دس دن میں واپس آ جائے۔ تاکہ مہرو جلدی سے اس کی ہو جائے۔

رات کا کھانا کھا کر وہ لالٹین کی روشنی میں تاش کھیلنے لگے۔ نادر دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس وقت جان محمد کھیل میں شریک تھا اس لیے وہ رقم نہیں لگا سکتے تھے اسے رقم لگا کر کھیلنا پسند نہیں تھا۔ البتہ جب جان محمد شامل نہیں ہوتا تھا تو وہ نظر بچا کر داؤ بھی لگا لیتے تھے۔ رقم بعد میں ہاتھ آنے پر ادا کر دی جاتی تھی۔ ولی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ ایک طرف لیٹا تھا۔ دو گھنٹے بعد جان نے بیزار ہو کر پتے پھینک دیئے۔ اس نے نادر سے رخ کا پوچھا۔

"ابھی جنوب مشرق کی طرف جانا پڑا ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

ہوا کا رخ یہی تھا اور وہ بادبانوں کے سہارے تقریباً دس ناٹ کی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ اگر اس رفتار سے سفر جاری رہتا تو وہ پرسوں صبح یا دوپہر تک سر کریک تک پہنچ جاتے۔ اس کے بعد ان کے پاس شکار کے لیے پانچ، چھ دن ہوتے، راستے میں انہیں جا بجا بحری جہاز، ٹرالر اور لانچیں سفر کرتی نظر آتی تھیں۔ لیکن وہ جیسے جیسے کراچی سے دور جا رہے تھے، نظر آنے والے جہازوں اور کشتیوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔

لیکن پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ جب تک وہ مطلوبہ مقام تک نہیں پہنچ جاتے تھے۔ دن رات ایک آدمی کشتی کے اردگرد نظر رکھتا تھا اگر وہ حادثاتی طور پر کسی بڑے بحری جہاز کے سامنے آ جائے تو اس کی معمولی سی ٹکر ان کی کشتی کو غرق کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ وہ اس بے کراں سمندر کی چھوٹی مچھلی تھے۔ جسے اپنی بقا کے لیے ہمہ وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا۔

رات بارہ بجے جان محمد ابراہیم کو جگا کر سو گیا۔ نگہبانی کے فرائض وہ خود انجام دیتا تھا یا ابراہیم کے ذمے تھا۔ اسے اس معاملے میں کسی اور پر اعتماد نہیں تھا۔ شروع میں بارہا ایسا ہوا کہ اس نے جسے نگہبانی پر لگایا، وہ سوتا پایا گیا۔ اس لیے اب یہ فریضہ

جان محمد اور ابراہیم خود ادا کرتے تھے۔صبح اس کی آنکھ چھ بجے کھلی تھی۔روشنی نمودار ہونے میں وقت تھا۔اس نے کمبل سے نکل کر انگڑائی لی۔نیچے کیبن سے چائے کی خوشبو آ رہی تھی۔وہ پیچھے آیا۔ہوا تیز اور سرد تھی۔اس نے اندر جھانکا ولی ناشتہ بنا رہا تھا اور اپنے کام میں خاصا ماہر ہو گیا تھا خاص طور سے پراٹھے لاجواب بناتا تھا۔

''بھائی ناشتہ کرنا ہے؟''اس نے جان محمد کو دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں لیکن پہلے ایک پیالہ چائے دے۔''

جان محمد نے کلی کی اور چائے لے کر قاسم کے پاس آیا۔نادر سو گیا تھا۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

قاسم ہنسا''باس کوئی مسئلہ ہوتا تو تیرے سے چھپا رہتا۔اب یہ کوئی بحری جہاز تو ہے نہیں کہ کچھ ہو جائے اور کپتان پڑا سوتا رہے۔''قاسم نے کہیں سے لفظ باس سنا تھا تب سے وہ جان محمد کو باس کہنے لگا۔جان محمد نے اندازہ لگایا کہ وہ کراچی سے کوئی سوا سو میل جنوب مشرق کی طرف آ گئے ہیں۔اب ان کو اپنا رخ مشرق کی طرف کرنا تھا لیکن پہلے ناشتہ ضروری تھا۔اب نیچے سے پراٹھوں کے ساتھ انڈے تلنے کی ایسی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی کہ سب ہی اٹھ گئے حتیٰ کہ چار گھنٹے پہلے سونے والا نادر بھی جاگ گیا تھا۔اس نے سب سے پہلے پراٹھوں اور انڈوں پر حملہ کیا تھا۔ناشتے کے بعد جان محمد اور ابراہیم کشتی کا رخ بدلنے لگے۔

مشرق کی طرف ہوا اتنی موثر نہیں تھی پھر بھی کشتی چھ سات ناٹ کی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔جان محمد کو کسی قدر مایوسی ہوئی تھی۔اس رفتار سے وہ اگلے روز تک ہی سر کریک پہنچ سکتے تھے۔کشتی اب ابراہیم چلا رہا تھا۔ان کی کشتی میں ریڈیو تھا۔میڈیم ویوز پر یہ ساری دنیا کے اسٹیشن کیچ کر سکتا تھا لیکن شارٹ ویوز پر یہ محدود فاصلہ تک پیغام بھیج سکتا تھا۔کسی ہنگامی صورت حال پر سو میل کے دائرے میں یہ پیغام نشر کیا جا سکتا تھا۔ویسے آج تک اس کے استعمال کی نوبت کم ہی آئی تھی۔زیادہ تر وہ اس پر گانے سنا کرتے تھے۔ولی محمد کو موسیقی کا زیادہ ہی شوق تھا۔اس کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا جسے وہ صندوق میں چھپا کر رکھتا تھا اور جب آرام کرتا تو اس پر گانے سنتا

تھا۔محدود تعداد میں بیٹری سیل لانے کی وجہ سے وہ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔جان محمد پڑھنے کے لیے کوئی کتاب یا رسالہ لاتا تھا۔لیکن اسے پڑھنے کے لیے فالتو وقت ہی نہیں ملتا تھا۔باقی افراد فارغ وقت میں تاش کھیل کر یا گپ شپ کر کے جی بہلایا کرتے تھے۔نادر کو تیراکی کا شوق تھا۔اکثر کشتی کے ساتھ رسی باندھ کر تیرنے لگتا تھا۔ویسے سب کا دل پسند مشغلہ سونا تھا تاکہ جال ڈالنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ آرام کر لیں۔کیونکہ اس کے بعد آرام کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔جال سمیٹنے اور کشتی بھرنے کے بعد ہر ممکن تیزی سے واپسی کا سفر کیا جاتا ہے۔اس میں آرام کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔اس لیے چھ میں سے تین افراد لازماً سوئے پائے جاتے تھے۔

ناشتے کے بعد نادر، قاسم اور ولی دوبارہ سو گئے۔جان محمد پائلٹ ابراہیم کے پاس آیا''کیا خیال ہے اس بار مچھلی کتنی ہاتھ لگے گی؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''وہ بولا۔

''قسمت کا کیا پتا۔ویسے تین دن پہلے خانو کی لانچ آئی تھی۔اس کے پاس بہت مچھلی تھی۔خانو کہہ رہا تھا کہ سمندر مچھلی سے بھرا پڑا ہے۔''

''لیکن ادھر بھارتی بھی زیادہ آنے لگے ہیں۔''

''اس سے فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی بھارتی سے مراد ماہی گیر ہے۔میں بھارتی کوسٹ گارڈ کی بات کر رہا ہوں۔وہ آئے دن ہماری سمندری حدود میں گھس کر ماہی گیر کشتیاں پکڑ کر لے جاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو بھارت کی سمندری حدود سے پکڑا ہے۔''

''ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا ہے۔''ابراہیم بے پروائی سے بولا۔

''لیکن آج کل زیادہ ہو رہا ہے۔بہتر ہوگا ہم کریک کے مغربی حصے تک محدود رہیں۔مشرقی حصہ زیادہ خطرناک ہے۔''

''میں بھی یہی کہنے والا تھا اور کسی خطرے کی صورت میں انجن اسٹارٹ کر کے پوری رفتار سے بھاگنا ہے۔ورنہ بھارتی کوسٹ گارڈ کے ہاتھ پکڑے گئے تو گھر والے برسوں صورت نہیں دیکھ سکیں گے۔''

جان محمد نے مایوسی سے انجن کی طرف دیکھا۔

''یہ بے کار ہو چکا ہے۔ اگر اس کو پوری رفتار سے چلایا جائے۔ تب بھی کشتی بارہ ناٹ سے اوپر نہیں جاسکتی۔ سنا ہے بھارتیوں کی کشتیاں تیس چالیس ناٹ کی رفتار سے دوڑ سکتی ہیں۔''

''وہ جن کی کشتیاں ہیں۔ ان کے پاس توپیں ہیں جو میل بھر دور کشتی کو نشانہ بنا سکتی ہیں۔''

''اس کے باوجود چوروں کی طرح آ کر بے گناہ ماہی گیروں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔'' جان محمد حقارت سے بولا۔

''ان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ پاکستانی کوسٹ گارڈ کا سامنا کر سکیں۔ میری ایک نیوی کے افسر سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ پہلے بھارتی فضائیہ کے جاسوس طیارے ہماری سمندری حدود میں گھس کر دیکھتے ہیں کہ پاکستانی کوسٹ گارڈ یا نیوی کی کشتیاں ہیں یا نہیں اور پھر ان کی لانچیں ادھر آنے کی ہمت کرتی ہیں۔''

''خدا ہمیں ان سے محفوظ رکھے۔'' ابراہیم نے پتوار کو درست کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت کشتی اتھلے پانی سے گذر رہی تھی۔ بے حد شفاف سمندر کی تہہ چالیس فٹ سے گہری نہیں تھی۔ یہاں پر مرجان اور مونگے کی چٹانیں تھیں۔ ناقابل یقین حد تک زیادہ رنگوں والی چٹانیں پودے اور ان پر کھلے پھول اس جگہ کو ایک سمندر کی حیثیت دے رہے تھے۔ اس باغ میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ جان محمد جانتا تھا کہ یہ باغ جتنا حسین نظر آتا ہے' اتنا ہی سنگین بھی ہے۔ ان پر بعض ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ جن کا ڈنگ انسان کو چند منٹ میں موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ بڑی شکاری مچھلیاں بھی ہوتی تھیں۔ شارک جب غول بنا کر شکار پر جھپٹتی ہیں تو یہ منظر دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اکثر اوقات وہیل مچھلیاں بھی نظر آتی تھیں لیکن وہ کھلے سمندر میں رہنا پسند کرتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی وہیل مچھلی آ کر ساحل پر پھنس جاتی تھی۔

شام تک ہوا کا رخ زیادہ موافق نہیں تھا لیکن سورج غروب ہونے کے بعد ہوا کے رخ اور اس کی رفتار میں تبدیلی آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بارہ تیرہ ناٹ کی رفتار سے سفر کرنے لگے۔ ان کا رفتار بتانے والا آلہ فرسودہ ہو چکا تھا لیکن تجربہ کی مدد سے وہ باآسانی جان جاتے تھے کہ کشتی کس رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ انہوں نے ماہی گیروں کے مخصوص گیت گاتے ہوئے جال عرشے پر درست کرنا شروع کر دیا تھا۔ ولی اور قاسم جال کی دیکھ بھال پر لگ گئے تھے کہ اس میں سوراخ نہ ہو۔ جان محمد انجن کی دیکھ بھال کرنے لگا کیونکہ شکار کے دوران اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔

انجن میں چند معمولی خرابیاں تھیں جو اس نے خود ٹھیک کر لیں۔ اتنا عرصہ اس انجن کے ساتھ گزار کر اس کے پرزے پرزے سے واقف ہو گیا تھا۔ کئی بار پورا انجن اس کے سامنے کھول کر جوڑا گیا تھا۔ اس لیے وہ اچھا خاصا خود مکینک بن گیا تھا اسے معلوم تھا کہ چند ہزار کے خرچے سے یہ انجن بہترین ہو جائے گا اور اچھی قیمت میں بک جائے گا۔ اکثر غریب ماہی گیر جو اپنے ناکارہ ہو جانے والے انجنوں کے بدلے نیا انجن خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اس قسم کے پرانے انجن خرید لیا کرتے تھے۔ رات تک وہ تیاری کی حالت میں لا کر اسے چیک بھی کر چکا تھا۔ ہوا کی رفتار اور رخ موافق اب بھی تھا۔ جان محمد اس امید کے ساتھ سویا تھا کہ اگلے روز وہ دوپہر تک سر کریک کے علاقے میں ہوں گے۔ اس رات وہ مہرو کو خواب میں دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

گپتا شلوانی بوٹ آریان کا کپتان تھا۔ گزشتہ چار سال سے وہ اس روسی ساختہ جنگی کشتی کے کپتان کے فرائض انجام دے رہا تھا اور اسے حال ہی میں جنوبی فلیٹ سے مغربی فلیٹ میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس کا کام سر کریک پر ملنے والی پاکستانی اور بھارتی سمندری حدود کی نگرانی کرنا تھا۔ گپتا کا تعلق مدراس سے تھا۔ اس کا باپ اسکول ٹیچر تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی تربیت بعض اصولوں کے مطابق کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گپتا کی سروس بک اہم افسران کے مقابلے میں کہیں بہتر تھی۔ اس کا نیول بیس دوارکا اسٹیشن تھا۔

مغربی فلیٹ میں آتے ہی حالات اس کے لیے تبدیل ہونے لگے تھے۔اپنے نظریات کی بنا پر وہ یہاں کے افسران اور ماتحتوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اپنے مادر وطن کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جان دینا ہر سپاہی کا فرض ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے دوسری سرحدوں کی حفاظت کا بھی احترام کرنا چاہیے۔یہ بات بھارتی بحریہ کے افسران اور نوجوانوں کے لیے ناقابل قبول تھی جو پاکستان دشمنی کا سبق گھٹی میں لے کر پلے بڑھے تھے اور پھر فوج کی تربیت نے سونے پر سہاگا کا کام کیا تھا۔انہیں فوج کی پیشہ ورانہ تربیت سے زیادہ پاکستان کی نظریاتی مخالفت کی تربیت دی گئی تھی۔

پھر ایک واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔کپتان کی بوٹ گشت پر تھی کہ اسے اطلاع ملی کہ ماہی گیروں کی کشتیاں بھارت کی سمندری حدود کے نزدیک آ گئی ہیں۔انہیں چیک کیا جائے۔کیونکہ نہ تو کشتیاں بھارتی حدود میں آئی تھی اور نہ ہی اوپر سے گپتا کو ان کی گرفتاری کے احکام ملے تھے۔اس نے وہاں جا کر معائنہ کیا۔پاکستانی ماہی گیر اپنی حدود میں جال ڈالے ہوئے تھے۔گپتا کے نائب کالی داس نے مشورہ دیا۔

''سر ہم ان ماہی گیروں کو گرفتار کر سکتے ہیں۔''

گپتا نے چند لمحے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''وہ اپنی سرحد میں ہیں۔'' کالی داس معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''سر! یہ کون سا مسئلہ ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے انہیں بھارت کی حدود سے پکڑا ہے۔''

گپتا نے چند لمحے سوچا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں یہ دوہرا غیر قانونی کام نہیں کر سکتا۔ایک تو دوسرے ملک کی حدود میں جانا اور پھر بے گناہ کو گرفتار کرنا۔''

''سر! آپ اس کی فکر نہ کریں۔کوئی ہمیں چیلنج نہیں کرے گا۔''

''چیلنج کی نہیں ہے۔اصولوں کی ہے۔''

کالی داس طنزیہ انداز میں مسکرایا''سر! آپ کن اصولوں کی بات کر رہے ہیں۔ملکوں کے درمیان صرف طاقت کا اصول چلتا ہے اور طاقت کا توازن ہمارے حق میں ہے۔''

''تم مجھے یہ سمجھانے کی کوشش نہ کرو کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔'' گپتا نے خشک لہجے میں کہا۔اس نے میگا فون پر پاکستانی ماہی گیروں کو وارننگ دی کہ وہ بھارت کی سمندری حدود کے نزدیک آ گئے ہیں اس لیے محتاط رہیں۔پاکستانی ماہی گیر پہلے ہی بھارتی بیوک بوٹ کو دیکھ کر ہراساں ہو رہے تھے۔انہوں نے عجلت میں اپنے جال سمیٹے اور جان بچنے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔کالی داس یہ دیکھ کر تلملا رہا تھا۔لمبی ناک اور پتلے ہونٹ تھے۔سگریٹ کثرت سے پیتا تھا اپنے خاندانی پس منظر اور مخصوص انتہا پسند نظریات کی وجہ سے اس نے کافی تیزی سے ترقی کی تھی اور لیفٹیننٹ کمانڈر بن گیا تھا۔واپسی پر کالی داس نے گپتا کی رپورٹ کی اور اسے ہیڈ کوارٹر طلب کر لیا گیا۔اس طلبی پر اسے اچھی خاصی سننا پڑی تھی۔اسے واضح الفاظ میں کہا گیا۔

''مسٹر گپتا! اگر کسی کو پاکستان یا اس کے باشندوں کے خلاف کچھ کرنے کا موقع ملے اور وہ نہ کرے تو اسے غدار کے برابر سمجھا جاتا ہے۔''

''بٹ سر! میں نے اپنی ڈیوٹی نبھائی ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''اپنی تربیت بھول جاؤ۔یہاں تمہاری صرف ایک ڈیوٹی ہے اور وہ ہے پاکستان کی مخالفت کرنا اور اسے نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔''

اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔کیونکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔رول کے مطابق اس نے اپنی ڈیوٹی انجام دی تھی۔البتہ اس کو جتا دیا گیا کہ وہ اوپر والوں کی نظر میں ہے اور اگر آئندہ اس سے ایسی حرکت ہوئی تو اسے اپنی ترقی کا خواب بھول جانا چاہیے۔اس کے باوجود گپتا نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے اصول ترک نہیں کرے گا۔اس کے باپ نے اسے سکھایا تھا کہ اصول ہی آدمی کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔اصول ترک کر دینے والا شخص جانوروں کے مرتبے سے بھی گر

جاتا ہے۔

آریان اس وقت سر کریک کے نزدیک سمندری حدود میں گشت کر رہی تھی۔ گزشتہ رات وہ نیول بیس سے روانہ ہوئے تھے۔ جب گپتا آرام کرتا تھا تو کالی داس بوٹ کمانڈ رہتا تھا۔ اپنے کیبن میں آرام کے دوران گپتا نے محسوس کیا کہ کئی بار بوٹ کا رخ بدلا ہے۔ حالانکہ اسے سمندری حدود کے ساتھ جنوب اور شمال کی طرف سفر کرنا تھا۔ چھ گھنٹے بعد اوپر آ کر گپتا نے چارج لیا اور اس کے بعد اس نے سفری چارٹ چیک کیا تو یہ دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی کہ چارٹ کے مطابق انہوں نے دو مقام پر پاکستان کی سمندری حدود کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس نے مڑ کر کالی داس کی طرف دیکھا جو بے پروائی سے کھڑا تھا۔

''ہم نے اپنی سمندری حد کیوں عبور کی؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''غلطی ہے سر!'' کالی داس بولا۔

''مجھے شبہ ہوا تھا کہ کچھ کشتیاں ہماری حد کی طرف آ رہی ہیں۔ ان کا جائزہ لیتے ہوئے ہم حد پار کر گئے۔''

''یہ واقعہ سنگین ہے۔ مجھے اوپر رپورٹ کرنا پڑے گی۔''

کالی داس ہنسا۔ ''سر! اس قسم کی سنگین خلاف ورزیاں ہم آئے دن کرتے ہیں۔ ہماری جیلیں پاکستانی ماہی گیروں سے بھری ہیں اور ان میں سے اکثر کو ہم ان کی حدود سے پکڑ کر لاتے ہیں۔''

گپتا اسے گھور رہا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے ہم نے انہیں بے گناہ پکڑا ہے اور رائٹس کی خلاف ورزی کی ہے۔''

''سر! یہاں رائٹس نہیں بلکہ مائٹ از رائٹ کا اصول ملتا ہے۔ ابھی ریڈیو پر مجھے حکم ملا ہے کہ کم از کم ایک کشتی اور اس پر سوار ماہی گیر گرفتار کر کے لائے جائیں۔''

''یہ حکم اوپر سے آیا ہے؟'' گپتا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

''اٹ از ٹوٹلی ان لیگل۔۔۔۔''

''سر! اٹ از ٹوٹلی پولیٹکس۔۔۔۔''

''میں اپنی بوٹ پر کوئی ایسا کام نہیں ہونے دوں گا۔''

''تب سر! اوپر کے حکم کو منوانے کے لیے مجھے بوٹ کا چارج سنبھالنا پڑے گا۔''

گپتا کو ایسا لگا جیسے وہ بھارتی بوٹ کا کپتان نہ ہو بلکہ زمانہ قدیم کے قزاق جہاز کا کپتان ہو جس کا عملہ اس سے بغاوت پر آمادہ ہو۔ اس نے زیر لب کہا۔

''میرے خدا! کیا ہم دنیا کی چھٹی بڑی بحری قوت ہونے کے دعوے دار ہیں۔''

''سر! آپ فیصلہ کر لیں۔ ہمیں شام سے پہلے کارروائی کرنی ہے۔'' کالی داس فیصلہ کن انداز میں بولا۔

''سر کریک کے مغرب میں چند پاکستانی ماہی گیر کشتیاں ہیں اور ہمارے جاسوس طیاروں کے مطابق وہاں دور تک کوئی پاکستانی نیول بوٹ نہیں ہے۔''

''میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔'' گپتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اس صورت میں اوپر سے آنے والے حکم کے مطابق آپ کی جگہ اب میں اس بوٹ کا کپتان ہوں۔'' اس نے پرنٹر سے نکلا کاغذ اسے تھما دیا۔

☆......☆......☆

ابراہیم' قاسم' نادر اور ولی ل پھینک رہے تھے جبکہ جان محمد کشتی چلا رہا تھا۔ بادبان سمیٹ دیئے گئے تھے اور کشتی کو انجن کی مدد سے چلایا جا رہا تھا۔ نیم دائرے میں کشتی سست رفتاری سے چکر لگا رہی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے جال سمیٹنے کا وقت صبح کا طے کیا گیا تھا۔ جان محمد احتیاط سے کشتی چلا رہا تھا کہ انجن کے پنکھے جال سے نہ لپٹ جائیں۔ ان کا جال کئی سو گز طویل تھا۔ عام طور پر ایک بار جال سمیٹنے پر ٹن سے زیادہ مچھلی ہاتھ آتی تھی۔ روشنی میں انہوں نے اتھلے پانیوں میں مچھلیوں کے کئی جھنڈ دیکھے تھے اور انہیں امید تھی کہ اس بار اچھی مچھلی ہاتھ لگے گی۔ جال پوری طرح پھیلا کر انہوں نے کشتی روک کر لنگر ڈال دیا تھا۔ سب تھکن سے چور تھے لیکن خوش بھی تھے۔ قاسم نے فوری طور پر ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ آج رات کے لیے اس نے گوشت بنایا تھا۔ ان کے

ذخیرے میں محدود مقدار میں گوشت بھی تھا۔ وہ ختم ہو جاتا تو مچھلی استعمال کرتے۔

کھا پی کر سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ البتہ جان محمد جاگتا رہا تھا۔ رات دو بجے اس نے نادر کو اٹھایا اور اسے چوکس رہنے کی ہدایت کر کے خود سو گیا۔ ویسے اسے ابراہیم کو اٹھانا تھا لیکن گزشتہ سارا دن وہ ایک لمحہ رکے بغیر کام میں مصروف تھا۔ اس لیے جان محمد نے اسے سونے دیا۔

"کوئی بات ہو تو مجھے جگا دینا۔" اس نے سونے سے پہلے نادر سے کہا۔

جب نادر نے اسے صبح چھ بجے جھنجھوڑا تو وہ جان گیا کہ کوئی خاص بات ہے۔

"کیا ہے ارے؟"

"مشرق کی طرف۔۔۔۔" جان محمد نے تشویش سے کہا۔

"اس طرف بھارت ہے۔ یعنی وہ کوئی بھارتی کشتی ہو سکتی ہے۔"

نادر نے اسے دوربین تھما دی "خود دیکھ لو استاد۔۔۔!"

آسمان صاف تھا اس لیے چاند نہ ہونے کے باوجود بوٹ کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ کوئی میل بھر کے فاصلے پر تھی اور اس کے اوپر گردش کرتا ریڈار بتا رہا تھا کہ وہ جنگی کشتی ہے۔ جان محمد نے چیخ کر سب کو کہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اگر یہ بھارتی بوٹ تھی تو وہ کس سنگین حادثے سے دوچار ہونے والے تھے۔ وہ یقینی طور پر پاکستانی حدود میں تھے اور بھارتی نیت کی خرابی کی وجہ سے ہی ادھر کا رخ کر سکتے تھے۔ ذرا سی دیر میں سب اٹھ گئے تھے۔ جان محمد نے انجن اسٹارٹ کیا اور کشتی کو پیچھے لے جانے لگا لیکن پھر اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ جال کشتی کے ساتھ بندھا تھا اور رات بھر مچھلیوں سے بھر گیا تھا۔ اس کے بوجھ سے کشتی سست رفتاری سے حرکت کر رہی تھی۔

"ابراہیم جال کی رسیاں کاٹ دے!" اس نے چیخ کر کہا۔ ابراہیم نے پھرتی سے جال کی رسیاں کاٹ دیں۔ بوجھ سے آزاد ہوتے ہی کشتی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی گئی لیکن عقب میں آنے والی بوٹ کی رفتار زیادہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بوٹ ان کے سر پر آ گئی اور اس سے سرچ لائٹ ماہ نور پر ڈالی جانے لگی پھر کسی نے

بگڑی اردو میں کہا۔

"رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردی جائے گی۔"

اس کے ساتھ ہی مشین گن کا برسٹ آ کر قریب ہی پانی میں گرا تھا۔ وہ پوری طرح ان کی زد میں تھے۔ روشنی ہوتے ہی انہوں نے بوٹ پر لہراتا بھارتی نیوی کا پرچم دیکھ لیا تھا۔ جان محمد نے محسوس کیا کہ اگر اس نے فوری طور پر کشتی نہ روکی تو یہ لوگ ان سب کو مار دیں گے۔ اس نے جلدی سے رفتار کم کی۔ رفتہ رفتہ ماہ نور رک گئی۔ نیول بوٹ سے اگلا حکم ملا۔

"کشتی پر موجود تمام افراد عرشے پر آ جائیں۔ سب کے ہاتھ سروں پر رہیں۔"

جان محمد اور اس کے ساتھیوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ انہیں سامنے آنے والی افتاد کا پوری طرح احساس تھا ان کی بستی کے بعض افراد سالوں سے بھارتی جیلوں میں تھے اور اب تک ان کی رہائی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ سال چھ مہینے میں ان کی جانب سے کوئی خط مل جاتا تھا۔ جس سے ان کی حالت زار کا پتہ چلتا تھا اور اب ان کا بھی اپنے ساتھیوں کا سا حشر ہونے والا تھا۔ وہ سب خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر عرشے پر کھڑے ہو گئے۔ حکم عدولی کی سزا سوائے موت کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

دفعتاً نادر نے رونا شروع کر دیا۔

"اڑے۔۔۔ میری گھر والی کا کیا بنے گا۔ اس کا بچہ ہونے والا ہے۔"

نادر کی سات مہینے پہلے شادی ہوئی تھی۔ گھر میں سوائے اس کے اور اس کی بیوی کے کوئی نہیں تھا۔ وہی اس گھر کا واحد کفیل تھا۔

"ہم سب مصیبت میں ہے یار!" جان محمد نے اسے تسلی دی۔

"ہم تین بھائی ہیں ذرا ہمارے گھر کا سوچ۔۔۔"

نادر چپ ہو گیا تھا۔ بھارتی بوٹ قریب آ گئی۔ حتیٰ کہ ان کی کشتی سے صرف ایک گز کا فاصلہ رہ گیا۔

فوراً ہی چار مسلح افراد اس پر سے کودے اور انہیں گھیر لیا سب سے پہلے ان کی

تلاشی لی اور پھر وہاں موجود رسی سے ان کے ہاتھ پشت پر باندھے جانے لگے۔اس موقع پر جان محمد نے احتجاج کیا۔

"ہم اپنی حد میں ہیں۔تم ادھر غلط آیا ہے۔کس قانون کے تحت ہمیں باندھا ہے؟"

"قانون کے بچے!" ایک سپاہی نے اس کے سر پر بٹ مارا اور وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ولی اور غلام چیخے تھے لیکن چار مشین گنوں کے سامنے وہ بے بس تھے۔وار زیادہ سخت نہیں تھا اس لیے جان محمد بے ہوش نہیں ہوا تھا۔اس کے باوجود خاصی دیر تک اس کا سر چکراتا رہا اور بھارتی اس کی کشتی پر قبضہ کر چکے تھے۔سب کو باندھ کر نیول بوٹ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور ماہ نور کو زنجیر کی مدد سے نیول بوٹ پر منتقل کیا جا رہا تھا۔وہ کھڑا ہوا تو اس کو بھی دھکے دے کر نیول بوٹ پر منتقل کر دیا گیا تھا۔وہاں جاتے ہی اس نے کہا تھا۔

"صاحب! ہمارا کیا قصور ہے؟"

دس بارہ افراد ان پر ٹوٹ پڑے انہیں زمین پر گرا کر بے دریغ ٹھوکروں سے مارنا شروع کر دیا۔وہ بچنے کی کوشش کرتے رہے مگر دس بارہ افراد سے بچنا جبکہ ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہوں کس طرح ممکن تھا۔دس منٹ میں ان سب کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔سب کے جسم سے کہیں نہ کہیں سے خون بہہ رہا تھا۔جان محمد کا ماتھا پھٹ گیا تھا کسی کے جوتے کی نوک لگی تھی وہ سب بوٹ کے عرشے پر پڑے ہانپ رہے تھے۔ایک افسر عرشے پر آیا۔وہ کالی داس تھا جس کا چہرہ چمک رہا تھا۔اس نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تم لوگ بھارتی حدود میں غیر قانونی طور پر گھسے تھے۔اس لیے تمہیں تمہاری کشتی سمیت گرفتار کیا جا رہا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" جان محمد اس بار بھی بولنے سے باز نہیں آیا۔

"ہم پاکستان کی حدود میں ہیں۔غیر قانونی طور پر تم لوگ ادھر آئے ہو؟"

کالی داس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔اس نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی گما کر

اسے مارنے کی کوشش کی مگر جان محمد نے اپنا بازو بچا لیا تھا۔اس پر مشتعل ہو کر دو سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ایک ٹھوکر اس کے سر پر لگی تو آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔اسی لمحے گپتا عرشے پر آ گیا وہ غصے میں تھا۔

"بند کرو یہ تماشا!" اس نے چلا کر کہا۔

"یہاں سے چلو تمہیں احساس ہے ہم دوسرے ملک کی سمندری حدود میں غیر قانونی طور پر ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔اس وقت دور دور تک کوئی پاکستانی کشتی نہیں ہے۔" کالی داس بے پروائی سے بولا۔

"ہاں، ورنہ تم یہاں سے دم دبا کر بھاگنے کی فکر میں ہوتے۔" گپتا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تمہارا سارا زور ان نہتے اور کمزور لوگوں پر چلتا ہے۔واپس چل کر تمہیں اپنے اقدام کا جواب دینا ہوگا۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں"۔کالی داس بولا اور پھر بوٹ کے عملے کو حکم دیا۔

"ان سب کو بند کر دو۔"

وہ لوگ انہیں گھسیٹ کر نیچے لے گئے۔جہاں قیدی رکھنے کے لیے مختصر سے سیل بند تھے انہیں تین تین کر کے اس میں ڈھونس دیا گیا۔جان محمد بے ہوش تھا اسے بے دردی سے اندر پھینکا گیا تھا۔اس کے چند منٹ بعد کشتی حرکت میں آ گئی۔وہ بیس ناٹ کی رفتار سے بھارتی سمندری حدود کی طرف جانے لگی اور چند گھنٹے کے بعد وہ پاکستانی حدود سے نکل چکے تھے۔کالی داس اور اس کا عملہ مطمئن تھا۔انہوں نے اپنا مشن پورا کر لیا تھا۔ان کے پاس مشق ستم کے لیے چھ عدد پاکستانی ماہی گیر تھے۔صبح پوری آب و تاب سے روشن ہوئی تھی لیکن ان غریب لوگوں کے لیے ایک طویل رات کا آغاز ہو گیا۔جس کی صبح غیر یقینی اور نامعلوم تھی۔اپنی حدود میں آتے ہی کالی داس نے بوٹ روکنے کا حکم دیا۔لنگر ڈال دیا گیا۔کالی داس عرشے پر آ گیا۔اس نے پیٹی افسر کو حکم دیا۔

''اس بڑبولے اور اس کے دونوں ساتھیوں کو لے آؤ۔''

کالی داس کٹر تعصب پسند قسم کا ہندو تھا۔ بچپن سے وہ آر۔ایس۔ایس کا رکن رہا تھا اور بال ٹھاکرے اس کا آئیڈیل تھا۔ متعصب ہندو جماعتیں اسی فکر میں رہا کرتی تھیں کہ پولیس، خفیہ، ایجنسیوں اور آرمڈ فورس میں ان کے زیادہ سے زیادہ کارکن جائیں۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ترغیب سے کام لیا جاتا تھا اس کے باوجود ان شعبوں کی طرف جانے والے لوگ کم ہی تھے۔ اس کے بجائے نوجوان کارکن سرکاری ملازمتوں کو زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔ جو ذرا بدمعاش تھے۔ وہ زیرزمین مافیاؤں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آرمڈ فورس کی سوکھی تنخواہیں کسی کو بھی ناپسند تھیں لیکن کالی داس خود نیوی میں شامل ہوا تھا کیونکہ اس کا باپ بھی ایک بحری جہاز کا کپتان رہ چکا تھا۔ کالی داس نچلی ذات کا ہندو تھا مگر اپنے باپ کے مرتبے اور دولت کی وجہ سے اونچے مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے اپنی ذات بھی بدل لی تھی۔ وہ خود کو راجپوت کہتا تھا۔ حالانکہ اس کے جاننے والے واقف تھے کہ وہ نچلی ذات کا ہندو ہے اور اس کے آباؤ اجداد چماروں کا پیشہ کرتے تھے۔ انگریزوں کے دور میں اس کے خاندان کی قسمت بدلی تھی۔ کالی داس کا دادا انگریز فوج میں کیمشنڈ کے عہدے تک پہنچنے والا اولین نچلی ذات کا ہندو تھا۔ اس نے کرنل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لی تھی۔ اسے مہاراشٹر میں زمین اور خطاب ملا اور اس کی حالت اپنے لوگوں سے بہتر ہوئی تھی۔ کالی داس موقع شناس قسم کا آدمی تھا۔ اس نے کم عمری میں بھانپ لیا کہ اس ملک کی ترقی کرنے کا سب سے آسان گر پرچم بلند کرتا ہے۔ جو شخص جتنی بلندی سے یہ نعرہ لگائے اتنی جلدی اوپر آ جائے گا۔

جان محمد ابھی تک بے ہوش تھا اس لیے پیٹی افسر نادر اور ابراہیم کو سیل سے نکال لایا۔ ان کے ہاتھ بدستور عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ گزشتہ چار گھنٹے سے وہ اس تنگ سے سیل میں پڑے تھے۔ نادر نے گڑگڑا کر کہا۔

''صاحب! ہمارا قصور؟''

''داڑھی کیوں رکھی ہے؟'' کالی داس نے اس کے شانے پر چھڑی رسید کی۔

''صاحب! بس رکھی ہے۔ مولوی صاحب کہتا ہے۔''

''گویا تم لوگ پکے مسلمان ہو۔''

''خدا قبول کرنے والا ہے۔'' نادر نے سادگی سے کہا لیکن ابراہیم کالی داس کے سوالات کے عقب میں چھپی خباثت سے واقف تھا۔

''صاحب! تم مطلب کا بات کرو۔'' ابراہیم نے اسے گھورا۔

''ان کی داڑھی صاف کرو۔'' کالی داس نے پیٹی افسر کو حکم دیا۔

''صاحب! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' نادر نے گھبرا کر پوچھا۔

کیونکہ مجھے بنیاد پرست مسلمانوں اور ان کی ہر چیز سے نفرت ہے۔''

''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے صاحب!'' ابراہیم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کم از کم آسانی سے نہیں ہونے دیں گے۔''

''مجھے بھی اس طرح مزہ نہیں آئے گا۔'' کالی داس مسکرایا اور پھر پیٹی افسر پہ دہاڑا۔

''منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ باربر کو بلاؤ۔''

نصف گھنٹے بعد ان کی داڑھی اس حالت میں صاف کی جا رہی تھی کہ وہ زخموں سے چور عرشے پر پڑے تھے۔ ان پر پانچ افراد نے اس حد تک تشدد کیا تھا کہ ان کے حواس گم ہو گئے تھے۔ باربر اناڑی تھا یا جان بوجھ کر غلط استرا چلا رہا تھا۔ ان کے چہرے پر بال کم اتر رہے تھے اور کھال زیادہ اتر رہی تھی۔ کالی داس اس منظر سے پوری طرح لطف لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ساحل پر پہنچ کر قیدی اسے ملٹری پولیس کے حوالے کرنے پڑیں گے۔ اس سے پہلے وہ اپنے ارمان نکال لینا چاہتا تھا۔ اس کے ماتحتوں نے نادر اور ابراہیم کو اتنی بے دردی سے مارا تھا کہ ابراہیم کی دائیں کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ نادر کی بھی پسلیوں پر شدید ضربیں لگی تھیں اور اسے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ داڑھی صاف کرا کے کالی داس نے واپس انہیں سیل میں پھنکوا دیا۔

اس نے یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ دونوں آدمی زخمی ہیں اور انہیں طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ایک ماتحت نے دبی زبان میں اس طرف توجہ دلائی۔

"سر! ان لوگوں کی مرہم پٹی کی جائے یا نہیں؟"

"بکومت۔۔۔ مرنے دو ان مسلوں کو۔۔۔ انہیں طبی امداد دینا سانپ کو دودھ پلانا ہے۔"

"سر! ہم سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔"

کالی داس مسکرایا تو اس میں سفا کی نمایاں تھی۔

"تم فکر نہ کرو۔ ہم سے کوئی جواب طلب نہیں کرے گا۔ اوپر والے پوری طرح ہمارے حق میں ہیں کیا تمہیں گپتا کے انجام سے پتہ نہیں چلا۔"

"میرا انجام ایک سازش ہے۔" گپتا کنٹرول روم میں آیا تھا۔

"لیکن کالی داس اپنے انجام کے بارے میں سوچو۔ جب جنگ ہوتی ہے تو یہ سازشیں کام نہیں آتیں۔ جنگ میں تربیت اور حوصلہ کام آتا ہے اور تم ان دونوں سے محروم ہو۔"

کالی داس مسکرایا۔ "فی الحال تو مجھے شاباش ہی ملے گی اور جنگ کس نے دیکھی ہے۔ پاکستان کبھی ہندونیوی کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"یہ خوش فہمی ہمیں پینسٹھ اور اکہتر میں تھی۔ مشرقی بنگال کی بات نہ کرنا۔ وہاں ہمارے سورماؤں نے وہی کیا تھا جو آج تم نے ان ماہی گیروں کے ساتھ کیا ہے۔"

کالی داس سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے عجب سے لہجے میں کہا۔

"سر! مجھے شبہ ہو رہا ہے۔ آپ دشمن کی زبان بول رہے ہیں۔ آپ کے لیے یہ تاثر خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"میں صرف اصول پسند آدمی ہوں۔"

"آج کل دنیا میں صرف ایک ہی اصول مانا جاتا ہے۔ اپنا مفاد ہر قیمت پر حاصل کر لو اور بس۔"

شام کو نیول بوٹ آریان بندرگاہ سے لگ چکی تھی۔ قیدیوں کو بوٹ سے اتار کر بندرگاہ کے حکام کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ان کی ابتر حالت کا اب تک کسی نے

نوٹس نہیں لیا تھا۔ کیونکہ یہاں پر لائے جانے والے اکثر قیدی انہی حالوں میں پہنچتے تھے۔ گپتا اور کالی داس بیس کمانڈر کے دفتر میں حاضر ہوئے۔ گپتا نے کالی داس کے اقدام پر احتجاج کرتے ہوئے اوپر سے آنے والے حکم کو غیر قانونی قرار دیا تھا لیکن بیس کمانڈر کا انداز اس کے لیے سرد تھا۔

"مسٹر گپتا شلوانی۔ حکم حکومت کی طرف سے آیا تھا اور ایک فوجی کمانڈر کو چوں چرا کرنے کی بجائے آرڈر پر عمل کرنا چاہیے۔ اٹ از یور ڈیوٹی۔"

"یس سر!" گپتا نے مردہ لہجے میں کہا۔

"اس بار تمہیں صرف وارننگ کے ساتھ معاف کیا جا رہا ہے اور تمہاری ڈیوٹی بیس پر لگائی جا رہی ہے۔ بوٹ اب کالی داس کی کمانڈ میں ہوگی۔"

گپتا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"یس سر۔۔۔۔!"

گپتا جانتا تھا کہ احتجاج بے کار ہے لیکن جانے سے پہلے اس نے یہ ضرور کہا۔

"سر! کالی داس نے بے گناہ ماہی گیروں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اگر پاکستان کے احتجاج پر کسی انٹرنیشنل ہیومن رائٹس نے ان قیدیوں کا معائنہ کیا تو دیش کی بدنامی ہوگی۔"

بیس کمانڈر نے کچھ دیر سوچا۔

"او کے! میں ان لوگوں کا مسئلہ دیکھوں گا۔"

"تھینک یو سر!" گپتا سلوٹ کر کے باہر آ گیا۔

☆......☆......☆

ان سب کو مختصر سی کوٹھی میں بند کر دیا گیا تھا۔ ابراہیم حوصلے سے اپنی کلائی کی تکلیف برداشت کر رہا تھا لیکن نادر کی حالت بری تھی۔ اس کے منہ سے خون آ رہا تھا۔ پسلی نے ٹوٹ کر پھیپھڑے کو زخمی کر دیا تھا۔ اس سے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ باقی سب کی حالت اب بہتر تھی۔ مرہم پٹی تو در کنار انہیں خوراک تک نہیں دی گئی تھی۔ بندر

گاہ پر اترنے کے بعد انہیں ایک گندے سے ڈول میں پینے کے لیے پانی دیا گیا تھا۔ عام حالات میں وہ اس پانی کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتے لیکن گزشتہ سولہ گھنٹے سے انہوں نے پانی نہیں پیا تھا۔ اس جیل یا حوالات میں ان کا استقبال لاتوں، مکوں اور گالیوں سے کیا گیا تھا۔ بظاہر مذہبی نظر آنے والے سیلرز کا رویہ زمانہ قدیم کے قزاقوں اور ڈاکوؤں سے بھی زیادہ وحشیانہ تھا۔ نادر کراہ کراہ کر بار بار پانی مانگ رہا تھا لیکن ان کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

جان محمد سے برداشت نہیں ہو سکا۔ اس نے لوہے کا دروازہ بجایا۔

''کوئی ہے۔ میرے ساتھی کی حالت خراب ہے۔ اسے پانی تو دو۔''

کئی بار کی چیخ و پکار کے بعد ایک دبلا پتلا سیاہ رنگ کا شخص آیا۔

''چپ رہو شالا لوگ۔۔۔۔''

''میرا ساتھی پیاسا ہے اسے پانی پلا دو۔'' جان محمد نے لجاجت سے کہا۔

''ابھی کچھ نہیں ملے گا۔'' وہ بے رخی سے کہتا ہوا چلا گیا۔ اس نے جان محمد اور اس کے ساتھیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

''تم۔۔۔۔لوگ چپ رہو'' نادر کراہ کر بولا۔

''ورنہ یہ ظالم تمہیں بھی ماریں گے۔''

جان محمد کا غصے سے برا حال تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لوہے کا دروازہ اکھاڑ پھینکے۔ اسے رہ رہ کر ماں اور مہرو کا خیال آ رہا تھا۔ جب یہ خبر ان تک پہنچے گی تو ان کا کیا حال ہوگا۔ نادر، ابراہیم اور قاسم کے گھر والے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ نادر اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ اس کے ہونے والے بچے کا اب تک انہوں نے ذکر ہی سنا تھا نہ جانے اسے دیکھنا بھی نصیب ہو یا نہ ہو۔ وہ صبر کر کے بیٹھ گئے تھے کہ ان لوگوں سے رحم کی امید نہیں ہے لیکن کچھ دیر بعد وہی سیاہ رو شخص آیا اس نے ٹین کا ڈبہ سلاخوں سے نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

''شالا لوگ جلدی پانی پیو۔۔۔۔شاب آتا ہوگا ابھی۔۔۔۔''

جان محمد نے جھپٹ کر ٹین کا مگ لیا اور نادر کو سہارا دے کر نادر کو پانی پلانے

لگا۔ اس نے نصف ٹین پی لیا۔

''بس اب تم لوگ پیو۔۔۔۔''

''ہم نے پی لیا تھا راستے میں۔'' جان محمد نے اسے تسلی دی اور سیاہ شخص سے کہا۔

''کیا ہم یہ ٹین رکھ سکتے ہیں؟ اس کی طبیعت خراب ہے اسے دوبارہ پیاس لگے گی۔

نہیں کشی نے دیکھ لیا تو امارہ شامت آئے گا۔۔۔۔اور وہ۔۔۔۔''

مجبوراً انہوں نے پانی پی کر ٹین واپس کر دیا۔ وہ شخص ان سے ہمدردی کر رہا تھا اسے پھنسانا صحیح نہیں تھا۔ وہ بعد میں بھی کام آتا۔ جان محمد نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا تھا۔ ان کی ساری چیزیں چھین لی گئی تھیں سوائے ان کے تن کے کپڑوں کے۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ جان محمد نے سیاہ رو سے کہا۔

''میرے ساتھی کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔''

''ابھی کش نئیں ہو شکتا اے۔'' وہ چلا گیا۔

بھارتی حکام نے ابھی تک ان سے کچھ پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ ان کا سارا زور مار پیٹ اور ان کی تذلیل پر رہا تھا۔ انہیں ان سے پوچھ گچھ کرنے میں شاید کوئی دلچسپی تھی بھی نہیں۔ دن ڈھل گیا اور رات ہو گئی۔ بندرگاہ کی طرف سے آنے والی آوازیں دھیمی پڑ گئی تھیں۔ وہ ابھی تک فوجی حکام کے پاس تھے۔ جان محمد جانتا تھا کہ بالآخر انہیں بھارتی پولیس یا خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ زیادہ امکان تھا کہ انہیں پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ اس طرح کم سے کم حکومت پاکستان کو ان کے بارے میں بتا دیا جائے گا اور گھر والوں تک اطلاع پہنچ جائے گی کہ وہ زندہ ہیں کسی حادثے میں ڈوبے نہیں ہیں۔ رات بارہ بجے کے قریب چند افراد ان کے قید خانے تک آئے۔ ان کی جان لبوں پر آ گئی تھی کہ اب انہیں بہیمانہ تشدد کے نئے دور سے گزرنا پڑے گا مگر مسلح افراد کے ساتھ ایک ڈاکٹر تھا۔ اس نے قید خانے میں داخل ہوتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"فکر نہ کرو میں تمہارا علاج کرنے آیا ہوں۔"

☆......☆......☆

گپتا گھر کی جانب جاتے ہوئے تھکا ہوا اور مایوس تھا۔ اس واقعے نے اس کی شان دار سروس بک پر پانی پھیر دیا تھا۔ حالانکہ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے رولز کی بات کی تھی۔ نیول آفیسرز کے لیے کالونی بندرگاہ سے ذرا فاصلے پر اس پہاڑی پر بنی تھی۔ یہاں پر انگریزوں کے زمانے کے بنے مکانات اور بیرکس تھیں۔ ان میں بعض فارم ہاؤس ٹائپ کے تھے۔ گپتا کو بھی ایسا ہی ایک سال خوردہ مکان ملا تھا۔ جس کے بیشتر کمرے ناقابل رہائش تھے۔ ان کو کل چار کمرے ملے تھے۔ ایک بیڈروم تھا۔ ایک ڈرائنگ روم تھا۔ ایک کمرہ ششمیتا نے جم بنالیا تھا۔ اسے ایکسرسائز کرنے کا شوق تھا۔ ششمیتا گپتا کی بیوی تھی اور مس انڈیا سے ششمیتا کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

گپتا نے کار مکان کے پورچ میں روکی اس کا چوکیدار اور اردلی بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"نمستے صاحب!"

اس نے سر ہلا کر جواب دیا "دیارام کیسے ہو؟"

"بھگوان کی کرپا ہے۔" وہ دانت نکال کر بولا۔

"ششمی کیا کر رہی ہے۔"

"بیگم صاحب تو کہیں گئی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کہاں۔۔۔۔ کس کے ساتھ؟" گپتا کا موڈ خراب ہو گیا۔

"کمار صاحب کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔ وہ آج کل روز آ رہے ہیں۔"

"کمار۔۔۔۔" گپتا غرایا، کمار ششمیتا کا کزن تھا۔ اس نے بھی نیوی جوائن کی تھی لیکن سروس چھوڑ کر وہ فوج میں آ گیا، اس نے خاصے پیسے کما لیے تھے اور ایک پہاڑی پر اچھا خاصا محل نما مکان بنا لیا تھا۔ گپتا کی شادی سے پہلے وہ ششمیتا کے امیدواروں میں سے تھا لیکن وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی۔ اب صورت حال مختلف تھی۔ کمار کے پاس دولت تھی۔ بے شک وہ سر سے گنجا سہی اور گول شیشوں کی عینک

اسے مضحکہ خیز بناتی تھی اس کے پاس بے حساب پیسہ تھا۔ جس کی ششمیتا کو ہمیشہ سے خواہش رہی تھی۔

گپتا جھنجلاتا ہوا اندر آیا۔ اس نے کپڑے بدلے اور فون پر کمار کا نمبر ملایا۔

فون کمار کے کسی ملازم نے اٹھایا۔

"ششمیتا کو بلاؤ میں اس کا شوہر گپتا بات کر رہا ہوں۔"

"وہ تو جی کمار صاحب کے ساتھ کہیں باہر گئی ہیں۔" ملازم نے جواب دیا۔

"وہ آئے تو اسے کہنا فوراً گھر آئے۔" گپتا بولا اور فون پٹخ دیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ کمار کے ساتھ کہیں باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ کہاں جا سکتی تھی اس چھوٹے سے علاقے میں تفریح گاہیں کم تھیں۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کمار شہر کی جانی پہچانی شخصیت تھا۔ بالآخر ایک نائٹ کلب میں اس کا سراغ مل گیا وہ اور ششمیتا فلور پر ناچنے والے جوڑوں میں شامل تھے۔ ششمیتا کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پیے ہوئے ہے اور نشے میں ہے۔ گپتا اچانک اس کے سامنے آیا وہ چند لمحے کو اسے دیکھتی رہی پھر ہنسنے لگی۔

"گپتا کب آئے؟"

"چلو میرے ساتھ۔۔۔۔۔" گپتا نے کمار کو نظر انداز کر کے کہا۔

"ابھی ڈارلنگ! ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تم نے پی رکھی ہے۔ تم جانتی ہو شراب پینا مجھے پسند نہیں ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"تمہارا بس چلے تو تم مجھے سانس بھی نہ لینے دو۔"

"گھر چلو اس وقت تم نشے میں ہو۔" وہ اسے کھینچتا باہر لایا اور گاڑی میں دھکیل دیا۔

ششمیتا کا سر گاڑی کے دروازے کے کنارے سے لگا وہ گپتا کو برا بھلا کہنے لگی۔ "جنگلی۔۔۔۔ وحشی۔۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" اس کا غصہ بے قابو ہونے لگا۔ اس نے ششمیتا کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

"چہ چہ چہ۔۔۔۔۔۔" گپتا کو پاس سے آواز آئی۔

"مجھے آپ سے اس طرح کی حرکت کی امید نہیں تھی۔"

گپتا نے ڈرائیونگ سیٹ سے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر کالی داس کھڑا تھا اور استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" گپتا دہاڑا۔

"تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔"

"میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ اپنے افسر کو اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک کرتے دیکھ کر رک گیا۔ لگتا ہے آپ کو دیوی جی پر اتنا رحم نہیں آتا۔ جتنا ان پاکستانی ماہی گیروں پر آ رہا تھا۔"

اس دوران گپتا اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔

"مسٹر کالی داس۔۔۔ اٹ از مائی پرسنل میٹر۔۔۔۔۔۔ ناؤ گو۔۔۔۔"

"یس سر! کالی داس نے اسے سیلوٹ کیا اور کلب کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ششمیتا دانت پیس رہی تھی۔

"تم نے اپنے ماتحت کے سامنے میری انسلٹ کی ہے۔"

"اور جو تم وہاں سر عام ناچ رہی تھیں۔ اس اوباش کتے کے ساتھ۔۔۔ اس سے تو میری بڑی عزت افزائی ہو رہی تھی۔" گپتا نے طنزیہ انداز میں کہا اور جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کمار میرا بچپن کا دوست ہے میرے اس سے ایسے ویسے تعلقات نہیں ہیں۔" ششمیتا نے لہجہ بدل کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اس جیسے شخص کے ساتھ صبح شام پھرنا بھی مناسب نہیں ہے۔"

"اس جیسے شخص سے کیا مراد ہے؟" ششمیتا نے احتجاج کیا۔

"کمار ایک اچھا شخص ہے اور میرا کزن ہے تمہاری غیر موجودگی میں کبھی کبھی میرا دل بہلانے کے لیے باہر لے جاتا ہے اور بس۔۔۔۔۔"

"اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔" گپتا آہستہ سے بولا۔

"کمار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر نیوی افسران کی بیویوں کو ورغلاتا ہے اس کے خلاف لوگوں میں غصہ ہے۔"

"بہرحال میں نے اسے شریف آدمی پایا ہے۔ تم نے اتنا اچانک حملہ کیا تھا کہ وہ گنگ رہ گیا۔ ایک لفظ بھی نہیں بول سکا تھا۔"

"اگر وہ ایک لفظ بھی بولتا تو میں اسے مزہ چکھا دیتا۔"

ششمیتا خاموش رہی لیکن صاف لگ رہا تھا۔ کمار کے معاملے میں وہ اس سے متفق نہیں ہے۔ گھر آ کر گپتا نے بیڈروم کا رخ کیا اور ششمیتا شاور لینے چلی گئی۔ گپتا نے ٹی وی کھولا اور ایک مقامی نیوز چینل لگایا۔

نیوز کاسٹر پاکستانی ماہی گیروں کی بھارتی سمندری حدود سے گرفتاری کی خبر سنا رہا تھا۔ اس نے باوثوق ذرائع کا حوالہ دے کر کہا۔

"ان ماہی گیروں کے قبضے میں بعض حساس آلات (یعنی ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر) بھی برآمد ہوئے تھے ان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ پاکستانی جاسوس ہیں۔"

"بکواس۔۔۔" اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اعلیٰ سطح کے افسران اس قسم کا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ اسے بھارتی فوج میں پندرہ سال گزار کر بھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ شاور لے کر ششمیتا جب اس کی طرف بڑھی تو وہ اپنا غصہ بھی بھول گیا۔

☆......☆......☆

بارہ دن بعد انہیں ملٹری پولیس کی تحویل سے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ نادر کی حالت بہتر تھی۔ البتہ ابراہیم کے ہاتھ کا زخم خراب ہو رہا تھا۔ ٹوٹی ہڈی کو جوڑنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ علاج کرنے والے ڈاکٹر نے پلاسٹر کرنے کی بجائے ہڈی بٹھائے بغیر سخت پٹی کر دی تھی۔ اندر ٹوٹی ہڈی کی وجہ سے سوجن بڑھ گئی تھی۔ اس

کی حالت اچھی نہیں تھی۔ رات بھر وہ درد سے کراہتا رہا تھا۔ محض پندرہ دن میں وہ آدھا رہ گیا تھا۔ سرخ رنگت سیاہ پڑ گئی تھی اور آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ہاتھ کی سوجن میں چمک دار سیاہی شامل ہوگئی تھی اور یہ بے حد خطرناک بات تھی۔ ان لوگوں کے بار بار احتجاج کرنے کے باوجود ابراہیم کا علاج نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ دو بار ملٹری پولیس کے جلادوں نے اس مطالبے پر ان سے تشدد بھی کیا تھا۔

اس نئی جگہ پر آنے کے بعد انہیں امید بندھی تھی کہ شاید ان کے ساتھ بہتر سلوک ہو۔ عجیب بات تھی کہ یہ لوگ پولیس والے نہیں لگتے تھے۔ انہیں اس جگہ تک آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر لایا گیا تھا اور ان کی آنکھ سے پٹی تہ خانے میں کھولی گئی تھی۔ جہاں انہیں سلاخوں والے سیل میں دھکیل دیا گیا تھا۔ یہ چھ بائی آٹھ کا سیل تھا۔ جس میں وہ چھ افراد بند تھے۔ ان سب کی حالت خستہ تھی۔ ان میں مختلف قسم کے لوگ تھے، دوسروں کے برعکس جان محمد محسوس کرنے لگا کہ وہ کسی خطرناک جگہ میں آ پھنسے ہیں۔ بے شک یہ لوگ سادہ لباس میں تھے لیکن ان کے پتھریلے چہرے بتا رہے تھے کہ اندر سے وہ وردی والوں سے زیادہ سفاک تھے۔ پہلے دن انہیں معمولی خوراک دی گئی لیکن اس کی مقدار مناسب تھی۔ ملٹری پولیس کی تحویل میں خوراک کی مقدار بھی کم تھی۔

دوسرے دن جان محمد کو وہاں سے نکالا گیا۔ ملٹری پولیس نے بار بار پوچھ گچھ کرکے ان سے ان کے سارے کوائف معلوم کرلیے اس لیے کہ بھارتیوں کے علم میں تھا کہ جان محمد ہی ان ماہی گیروں کا سپہ سالار ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی وہ سب سے زیادہ ہے۔ اسے تہ خانے کی اوپر والی عمارت میں لایا گیا۔ کھلا آسمان یہاں بھی نہیں تھا۔ اسے ایک چمک دار، سیاہ رنگ اور چھوٹے قد والے شخص کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ نقوش سے وہ جنوبی بھارت کا رہنے والا تھا۔ اس نے صاف ستھری زبان میں جان محمد کو مخاطب کیا۔

''بیٹھو۔'' اس کا اشارہ کرسی کی جانب تھا۔ جان محمد حیران تھا جب سے وہ گرفتار ہوئے تھے پہلی بار ان سے اتنا اچھا سلوک ہوا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم پڑھے لکھے ہو تمہیں معلوم ہے کسی دوسرے ملک کی سرحد میں داخل ہونا کتنا سنگین جرم ہے۔''

''یہ غلط ہے۔'' جان محمد بول اٹھا۔

''بھارتی نیوی کی کشتی نے پاکستان کی حدود میں گھس کر ہمیں گرفتار کیا تھا۔''

مدراسی کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے تلخی نمودار ہوئی تھی۔ پھر اس نے گویا صبر وتحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''یہ مجھے معلوم نہیں کیونکہ ریکارڈ کے مطابق تم لوگوں کی لانچ بھارتی سمندر سے پکڑی گئی ہے۔ اب معاملہ عدالت تک جائے گا۔ الزام ثابت ہونے پر تمہیں نو سے سات سال کی سزا ہو سکتی ہے۔''

''الزام تو ثابت ہے صاحب!'' جان محمد تلخی سے بولا۔

''آپ لوگوں کو کون روکے گا۔''

''ہمیں اب بھی تمہاری بچت کا طریقہ معلوم ہے۔'' مدراسی آگے کی طرف جھکا۔

''اگر تم ہم سے تعاون کرو تو ایک سال کے اندر اپنے گھر میں ہوگے۔''

''وہ کیسے صاحب؟'' جان محمد نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا۔

مدراسی نے پھر سوچنے کی اداکاری کی جیسے موزوں الفاظ تلاش کر رہا ہو پھر اس نے کہا۔

''ہمارا ایک باشندہ غلطی سے سرحد عبور کرکے پاکستان چلا۔ وہاں اسے پاکستانی ایجنسیوں نے گرفتار کرلیا اور پھر اس پر جھوٹے مقدمے بنا دیئے کہ اس نے پاکستان کی سرزمین پر دہشت گردانہ کارروائیاں کی ہیں۔ اس پر الزام لگا کر عدالت میں پیش کیا گیا اور اسے بددیانتی سے سزائے موت سنا دی گئی۔

''آپ شاید گوربچن سنگھ کی بات کر رہے ہیں۔'' جان محمد چونکا۔

''میں نے اسے ٹی وی پہ دیکھا تھا اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ وہ پاکستان

میں بے گناہ لوگوں کے قتل میں ملوث ہے۔"

"مدراسی مسکرایا۔" اگر ہم چاہیں تو ایک ہفتے بعد تم بھی ٹی وی پر ایسا ہی اعتراف کرتے نظر آؤ۔"

جان محمد تلخی سے بولا۔" پاکستان میں سچ مچ لوگ مرے تھے۔ جن کے قتل کا اعتراف گوربچن سنگھ نے کیا تھا۔"

"بھارت میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں۔" مدراسی کھسیا گیا تھا۔

"بہرحال گوربچن سنگھ بے گناہ ہے اسے پھانسی ہونے سے عالمی سطح پر بھارت کی بدنامی ہوگی۔"

"تو ہم کیا کر سکتے ہیں صاحب؟"

"اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو تو ہم گوربچن سنگھ کو پاکستان سے بچا سکتے ہیں۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے تو گوربچن کے لیے کیا کریں گے؟"

"تم اپنے لیے بھی کر سکتے ہو۔ گوربچن کو بچانے کے صلے میں بھارتی حکومت تمہیں معاف کر دے گی۔" مدراسی کا لہجہ نرم تھا۔

"صاحب! آپ صاف صاف بات کرو۔ ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہم تم سے کیا چاہیں گے۔" اس نے لہجہ بدل دیا۔

"تم تو خود ہماری قید میں ہو اور بے بس ہو۔ مجھے تم پر رحم آ رہا ہے اس لیے بات کی۔"

"چلو ہم پر رحم ہی سہی۔" جان محمد جلدی سے بولا۔ اسے ڈر تھا کہ یہ مدراسی ناراض نہ ہو جائے اور ان کا رویہ جو کسی قدر بہتر تھا پھر سے بدل جائے۔

"بات اتنی سی ہے تم ہم سے تعاون کرو تو تمہیں اچھے طریقے سے رکھا جائے گا اور تمہیں جلد ہی گوربچن سنگھ کے بدلے پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

اس بار جان محمد خاموش رہا۔ مدراسی نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پریس کانفرنس میں میڈیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ وہاں ہم تم لوگوں پر جو الزام لگائیں گے انہیں بے چوں و چرا تسلیم کر لینا ہے۔ اس سامان کی ملکیت بھی تسلیم کر لینا جو دکھایا جائے گا۔"

"صاحب! سامان اور الزام کیا ہوگا؟" جان محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تم لوگ پاکستان کے جاسوس ہو جو تخریب کاری کے لیے بھارت آ رہے تھے۔ تمہارے پاس سے بارود اور بم برآمد ہوں گے۔"

"دہشت گردی کا الزام ہوگا۔" جان محمد چونکا۔

"اس طرح تو ہمیں سزائے موت ہوگی۔"

"یہی تو پوائنٹ ہے پاکستان کو دھمکی ضرور دیں گے لیکن تم لوگوں کو سزائے موت نہیں دی جائے گی۔ ورنہ ہم گوربچن کو کیسے بچائیں گے؟"

"گویا آپ لوگ ہمارے بدلے گوربچن کا مطالبہ کرو گے۔"

"اب تم ٹھیک سمجھے۔" مدراسی نے اسے خراج تحسین پیش کیا۔

"فرض کریں پاکستان کی حکومت نے اس کے باوجود گوربچن کو معاف نہیں کیا تو؟" جان محمد نے نکتہ اٹھایا۔ مدراسی کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"تب بھی کچھ نہیں ۔۔۔۔۔ بہرحال ہم ناانصافی نہیں کر سکتے لیکن بھارت کے ایک فرد کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

جان محمد نے سوچا۔" صاحب یہ مشکل کام ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہوگا اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ہمیں رہا کرا دو گے؟"

"کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اگر تم ساری عمر بھارتی جیلوں میں نہیں سڑنا چاہتے تو تمہیں یہ کرنا ہوگا۔" مدراسی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تمہارے انکار کے بعد تمہیں مقامی پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"صاحب! دھمکی نہ دیں۔" جان محمد تلخی سے بولا۔

"آپ لوگ اس سے زیادہ کیا کرو گے جو ہمارے ساتھ پچھلے دنوں سے ہو

رہا ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے اور اس کا علاج بھی نہیں کیا گیا۔ اس کا زخم اندر ہی اندر خراب ہو رہا ہے ہم آپ کے اچھے سلوک پر کیسے اعتبار کریں۔''

''او کے! میں اسے ہسپتال بھجوا دیتا ہوں۔'' مدراسی نے کہا۔

''مگر یہ مت سمجھنا کہ کوئی سختی باقی نہیں رہی ہے۔ ابھی ہمارے جلادوں کے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ تمہارے جسم پر ایک خراش نہیں آئے گی اور تم ہماری بات راضی خوشی مانو گے۔''

جان محمد خاموش رہا۔ مدراسی نے آدمی طلب کر کے اسے واپس جیل میں لے جانے کو کہا۔

☆......☆......☆

گپتا اور ششمیتا کے تعلقات ایک ہفتے سے زیادہ جاری نہیں رہتے تھے۔ ششمیتا کو اس سے شکایت تھی کہ وہ اسے خرچ کرنے کے لیے کھلا پیسہ نہیں دیتا۔ اسے اس سڑے ہوئے گھر میں باندھ رکھا ہے اس کے ساتھی افسران عیاشی کی زندگی گزارتے ہیں اور وہ سوکھی تنخواہ میں گزارہ کر رہا ہے اس کے پاس پندرہ سال پرانی بھارتی کار ہے۔ ششمیتا زندگی کو بھرپور طریقے سے گزارنا چاہتی تھی ایک گھر میں بند ہو کر وقت گزارنے کے خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اس لیے وہ دوسرے تیسرے دن شام کو گھر سے نکل جاتی تھی۔ جب گپتا گھر آتا تو وہاں سوائے چوکیدار کے کوئی نہیں ہوتا تھا کھانا بھی اسے زہر مار کرنا پڑتا تھا۔ بہر حال وہ ششمیتا کے پکائے کھانوں سے بدرجہ بہتر تھا۔ کیونکہ ششمیتا کو کھانا بنانے سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ کچن میں جانا اس کے نزدیک جہنم میں جانے کے برابر تھا۔ اس شام بھی گپتا گھر پہنچا تو ششمیتا کہیں جانے کے لیے تیار تھی' اس نے چابی مانگی۔ گپتا نے پوچھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

''چابی دینی ہے تو دو ورنہ میں ٹیکسی منگوا لیتی ہوں۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''کیا خیال ہے آج کھانا باہر نہ کھائیں۔''

''سوری میں نے دن کی طرح اپنی شام بھی غارت نہیں کرنی ہے۔'' ششمیتا نے صاف انکار کر دیا۔

''کیوں آج کسی کے ساتھ جانا ہے؟''

''وہ کوئی بھی ہو تمہاری طرح بورنگ تو نہیں ہے' پلیز آپ چابی تو دو۔''

''ایسا کرو فون کر کے اسے بلا لو۔'' گپتا نے تلخ لہجے میں کہا اور اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے ششمیتا کو ٹیکسی میں جاتے دیکھا۔ ایک خیال سے اس نے عجلت میں کپڑے بدلے اور باہر کی طرف لپکا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور نیول کالونی سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ ٹیکسی کچھ دیر پہلے روانہ ہوئی تھی۔ اس نے دس منٹ میں اسے پا لیا۔ تاریکی میں اسے امید تھی کہ ششمیتا کو اس کی کار نظر نہیں آئے گی۔ نیول کالونی سے ٹیکسی نکل کر شہر کی طرف جانے والے راستے پر گھوم گئی۔ ذرا دیر بعد گپتا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ تفریح گاہوں کے علاقے کی طرف جا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک معروف ہوٹل میں رکی۔ ششمیتا ٹیکسی سے اتر کر اندر چلی گئی۔ گپتا نے ایک کونے میں کار پارک کی اور اتر کر ہوٹل کی طرف بڑھا۔ اس نے دربان سے ششمیتا کے بارے میں پوچھا۔

''یہ جو ابھی خوبصورت سی لڑکی اندر گئی ہے نیلے رنگ کی ساڑھی میں۔۔۔۔''

''مسز گپتا۔۔۔۔!'' دربان نے دانت نکالے۔

''افسوس پہلے ہی کسی سے ملنے آئی ہے۔''

گپتا کا خون کھولنے لگا لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔

''تم اس کے بارے میں خاصا جانتے ہو۔''

''جی صاحب! اپنے بارے میں انہوں نے خود بتایا تھا۔''

''وہ کبھی گپتا صاحب کے ساتھ نظر نہیں آئیں۔ سنا ہے بھارتی سینا کے بڑے افسر ہیں۔''

''اس وقت وہ کس کے پاس آئی ہے۔''

دربان باتونی تھا اور گپتا کی شخصیت سے متاثر بھی۔ اس لیے جتنا پوچھا

جا رہا تھا اس سے زیادہ ہی بتا رہا تھا۔

''آج کل ایک نیوی افسر کے ساتھ نظر آ رہی ہیں۔ کچھ دن پہلے ایک فوجی کنٹریکٹر کے ساتھ آئی تھی۔''

ابھی تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ششمیتا کمار سے ملنے آئی ہے مگر یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ اس نے دربان سے ڈائننگ ہال کا پوچھا اس عقل مند نے پہلے ہی مطلب سمجھ کر بتایا۔

''صاحب! وہ بال روم میں ملیں گی۔''

ششمیتا بال روم میں ہی تھی اور کالی داس کے ساتھ تھی۔ دونوں سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ گپتا کچھ دیر بے حس وحرکت کھڑا انہیں دیکھتا رہا پھر خاموشی سے وہاں سے چلا آیا۔ کار کا رخ اس نے گھر کی طرف موڑ دیا۔ وہ واپس پہنچا تو چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ بیڈروم میں ٹہلتا رہا پھر اس نے چوکیدار کو بلایا۔

''میں جو کچھ پوچھوں گا بالکل ٹھیک بتانا۔۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔۔''

''جی صاحب!''

''میری غیر موجودگی میں اس گھر میں کون کون آتا ہے؟''

چوکیدار پہلے آئیں بائیں شائیں کرتا رہا لیکن پھر اسے کھلنا پڑا۔

''صاحب۔۔۔۔۔! کچھ دن پہلے کمار صاحب آتے تھے اور پھر ایک ہفتے سے کوئی اور صاحب آ رہے ہیں۔''

چوکیدار نے گال پر ہاتھ رکھا۔ ''صاحب ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی بیگم صاحب مجھے چھٹی بھی دے دیتی ہیں۔''

گپتا نے سر تھام لیا تھا۔ اس کی بیوی اس کی عزت یوں نیلام کرے گی اس نے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، اپنے اردلی کو بھی نہیں۔

وہ کمرے میں چکر لگاتا رہا اور اس کا خون کھولتا رہا تھا۔ کالی داس اس کے نزدیک ناپسندیدہ شخص تھا لیکن اس وقت اسے قابل نفرت ترین لگ رہا تھا۔ اگر وہ اس

کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے قتل کر دیتا۔ وہ دانت پیستا رہا۔

☆......☆......☆

جان محمد نے جیل میں آ کر ان لوگوں کو مدراسی سے ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا۔ ابراہیم جوش میں آ گیا۔ ہرگز نہیں ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔ چاہے ساری عمر جیل میں رہیں۔''

''دل تو میرا بھی نہیں مان رہا ہے۔'' جان محمد نے گہری سانس لی۔

''لیکن ہم ان کے قبضے میں ہیں۔ یہ ہم سے جو چاہیں منوا سکتے ہیں۔''

''کم از کم مجھ سے نہیں منوا سکتے۔'' ابراہیم نے پرعزم انداز میں اعلان کیا۔

''تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔'' جان محمد نے اسے سمجھایا۔

''ہاں لیکن اس قیمت پر نہیں۔ اپنے ملک سے غداری کرنے کے مقابلے میں مرنا بہتر ہے۔''

جان محمد اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ''میں نے جواب دینے کے لیے مہلت مانگی ہے۔ اس دوران یہ تمہارا علاج بھی کرائیں گے۔ اس کے بعد ہم چاہیں تو انکار بھی کر سکتے ہیں۔''

ابراہیم مسکرایا۔ ''تو انہیں اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔ یہ میری ایک ہڈی جوڑیں گے اور انکار کرنے پر کتنی ہڈیاں توڑیں گے۔''

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ابھی تو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' ابراہیم نے سر ہلایا۔

''ویسے مجھ سے پوچھے گا تو میں انکار کر دوں گا۔ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

''بھروسا میں بھی نہیں کر رہا لیکن ہمیں کوئی موقع مل رہا ہے تو ہم کیوں چھوڑیں۔''

باقی سب لوگ اس معاملے کو نہ سمجھ رہے تھے اور نہ ہی دلچسپی لے رہے تھے۔ ان کے لیے جان محمد کا کہا کافی تھا۔ کچھ دیر بعد جیل کا دروازہ کھلا اور دو افراد اندر

آئے۔

''تم چلے گا۔'' ایک نے ابراہیم سے کہا۔

''اسے کہاں لے کر جارہے ہو؟'' جان محمد اٹھا۔

''تم خاموش بیٹھے رہو۔'' وہ شخص غرایا۔

''اسے علاج کے لیے لے کر جارہے ہیں۔''

جان محمد کو ان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے لیکن وہ مجبور تھا۔ باہر دو مسلح افراد بھی کھڑے تھے۔ اندر آنے والوں نے ابراہیم کو بازوؤں سے اٹھایا اور باہر لے گئے۔ ابراہیم سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ اس کے بازو کی سوجن اور نیلاہٹ میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ اسے لے گئے اور جان محمد اضطراب میں ٹہلتا رہا۔ بے شک مدارسی نے کہا تھا کہ وہ ابراہیم کا علاج کروائے گا لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس معاملے میں ان سے دھوکا ہورہا ہے۔ ابراہیم کو گئے ہوئے کافی دیر گزر گئی تھی اور واپس نہیں آیا تھا۔ سارا دن گزر گیا تھا رات آگئی لیکن ابراہیم کا کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ شخص رات کا کھانا دینے آیا۔ جان محمد نے اس سے پوچھا۔

''ہمارا ساتھی کہاں ہے اسے اب تک کیوں نہیں لائے۔''

''مجھے معلوم نہیں۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

''میں صرف کھانا دینے آیا ہوں۔''

''ہمیں اس کے بارے میں پریشانی ہے۔'' جان محمد چلایا۔

''میں کیا کروں۔'' وہ چلا گیا۔ جان محمد اسے آوازیں دیتا رہ گیا تھا۔

رات میں پھر جیل کا دروازہ کھلا اور ابراہیم کو اندر پھینک دیا گیا۔ وہ بالکل بے جان لگ رہا تھا۔ وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جان محمد نے اسے سیدھا کیا اور اسکی حالت دیکھ کر لرز گیا تھا۔ ظالموں نے اسے زخم زخم کردیا تھا۔ اس کے چہرے پر نیل کے بے شمار نشان تھے۔ بازو کی ہڈی اس تشدد کے نتیجے میں مکمل ٹوٹ گئی تھی۔ ابراہیم بے ہوش تھا اور اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ جان محمد اس کی حالت دیکھ کر دیوانہ ہوگیا۔ اس نے سلاخیں جھنجھوڑ کر انہیں گالیاں دینا شروع کردیں۔

''ذلیل کتو! کیا کیا ہے اس بے چارے کے ساتھ۔''

مدارسی چلتا ہوا سامنے آیا۔ ''تم دیکھ نہیں رہے ہو۔ اس کے بعد تمہاری باری ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو' ہمیں بے وقوف بنا سکتے ہو۔''

جان محمد نے بے قابو ہو کر اسے بے نقط سناڈالیں۔ وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

''تم لوگوں کے پاس میری بات ماننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ہم میں سے کوئی تمہاری بات نہیں مانے گا۔'' جان محمد نے چیلنج کیا۔

''تم منوا کر دیکھ لو۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' مدارسی سلاخوں کے پاس آیا۔

''جب تم لوگ پولیس کے حوالے ہوگے اس وقت تمہیں میری آفر بہت یاد آئے گی۔''

''ہمیں ان لوگوں سے کوئی اچھی امید نہیں ہے۔''

مدراسی نے زمین پر پڑے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

''اسے صرف تم لوگوں کو دکھانے کے لیے بھیجا ہے۔ اسے اب ہسپتال بھیجنا ہے ممکن ہے یہ بچ نہ سکے۔''

''مر بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا۔'' مدراسی بے پروائی سے بولا۔

''ہم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔''

قاسم اور ولی رو رہے تھے۔ وہ ابراہیم کے زیادہ نزدیک تھے۔ جان محمد کا دل بھی رو رہا تھا۔ لیکن وہ خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ نادر نے کتنی بار چیخ کر ان لوگوں کو بلایا کہ ابراہیم کو طبی امداد دی جائے مگر کوئی نہیں آیا۔ ابراہیم کی حالت بدستور خراب ہو رہی تھی۔ صبح کے قریب اسے ہوش آیا۔ اس نے خفیف سی آواز میں پانی مانگا لیکن ان کے پاس پانی کہاں تھا۔ نادر نے پانی کے لیے شور مچایا پر کوئی نہیں آیا تو وہ سلاخوں سے ٹکرانے لگا اور ولی نے بامشکل اسے قابو کیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''یا اللہ۔۔۔۔! یہ انسان ہیں یا جانور۔۔۔۔۔''

''جانوروں کی بے عزتی نہ کرو۔'' جان محمد تلخی سے بولا۔

"یہ قوم درندگی میں جنگل کے جانوروں سے بڑھ کر ہے۔"

وہ ابراہیم کو پیار کرتے تھے۔اس پر آنسو نچھاور کرتے تھے اس وقت وہ اس کے لیے یہی کر سکتے تھے۔ابراہیم کٹے ہونٹوں کے ساتھ مسکرایا اور پھر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر سنجیدہ ہو گئی۔کچھ دیر بعد جان محمد کو احساس ہوا کہ وہ سانس نہیں لے رہا ہے۔اس نے لرزتی آواز میں اناللہ پڑھی تو باقی افراد رونے لگے۔خاص طور پر نادر کی حالت بری تھی۔وہ رو رہا تھا اور گالیاں دے رہا تھا۔جان محمد سمجھ گیا تھا کہ ان کی گفتگو کہیں سنی جا رہی تھی۔ورنہ ابراہیم کا یہ حشر کیوں ہوتا۔جان محمد سوچ رہا تھا کہ کاش ایک بار مدراسی اسے اپنے کمرے میں طلب کرے تو وہ جان پر کھیل کر اسے قتل کر دے گا مگر ان کے عزائم سے واقف ہونے کے بعد اعتبار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

کالی داس نے ششمیتا کی طرف دیکھا۔وہ ہاتھ میں مارٹینی کا گلاس لیے صوفے پر نیم دراز تھی۔اس نے کھلا سا گاؤن پہن رکھا تھا جس میں اس کا جسمانی حسن نکھر گیا تھا۔وہ گپتا کی شان میں باتیں کر رہا تھا۔

"تمہارا شوہر بالکل کاٹھ کا الو ہے۔"

"اتنا بھی نہیں ہے۔" ششمیتا نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"ہمارا اس طرح کھلے عام پھرنا اس سے چھپا نہیں رہے گا۔"

کالی داس شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔"کیا تمہیں اس کی پروا ہے۔ویسے میرا خیال ہے تمہیں اب اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔اسکے ساتھ تم صرف وقت ضائع کر رہی ہو۔"

ششمیتا نے نفی میں سر ہلایا۔"بے شک میں اس کے ساتھ خوش نہیں ہوں لیکن میں اس کی بیوی ہوں اور میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑ سکتی جب تک مجھے اس سے اچھے مقام کا یقین نہ ہو جائے۔"

کالی داس نے اسے غور سے دیکھا۔"اس فضول سی جگہ میں تمہارا کیا مقام ہو سکتا ہے۔اگر تم ممبئی میں ہوتی یا پھر کلکتہ جیسے بڑے شہر میں......"

"مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" ششمیتا نے اس کی بات کاٹی۔ممبئی میں میری جیسی لاکھوں عورتیں ہوں گی۔"

کالی داس نے شانے اچکائے"مرضی تمہاری۔"

"تم گپتا کے ماتحت ہو۔کیا تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے؟"

"میں اس کا ماتحت ضرور ہوں لیکن میری رسائی کہیں اوپر تک ہے۔ویسے بھی گپتا اعلیٰ افسران کے نزدیک بلیک لسٹ ہے۔میں جانتا ہوں......گپتا نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے اپنا کیریئر تباہ کر لیا ہے۔اب وہ ساری عمر بھی ملازمت کرتا رہے تو جونیئر افسران میں رہے گا۔اب کبھی پالیسی میکنگ میں شامل نہیں کیا جائے گا۔"

ششمیتا سوچ میں پڑ گئی تھی پھر اس نے چونک کر کالی داس کی طرف دیکھا

"گپتا کے خلاف ہونے والی سازشوں میں تم بھی شامل ہو؟"

"میں نہ ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"گپتا نے اپنا کیریئر خود تباہ کیا ہے۔"

مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہیں ہے۔اب تم جاؤ۔رام داس آنے والا ہے۔میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہیں یہاں دیکھے۔"

"میں چلا جاتا ہوں لیکن ایک بار......" کالی داس نے کہا۔

"نہیں اور آئندہ یہاں مت آنا۔ہم باہر ملیں گے۔"

"باہر......" کالی داس مرے ہوئے انداز میں بولا۔

باہر ملنے کا مطلب تھا اچھا خاصا خرچا۔یہاں تو شراب کی ایک بوتل میں کام چل جاتا تھا۔

"یہاں کیا مسئلہ ہے؟"

"گپتا۔میں نے کہا نا فی الحال میں اس کی بیوی رہنا چاہتی ہوں۔معاملات ایک حد میں رہیں تو اچھا ہے۔اب تم باز رہو۔" وہ اٹھ کر راہداری کی طرف چلی گئی۔

"کتیا کہیں کی۔" اس کے جانے کے بعد وہ نفرت سے ہونٹ چبا کر بولا اسے خوش فہمی تھی کہ ششمیتا اس پر ریجھ گئی ہے لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ

اسے استعمال کررہی ہے۔اس سے اپنی بدرنگ زندگی میں رنگ بھر رہی تھی۔اس نے تیار ہوکر کہا۔

''میں جارہا ہوں۔''

ششمیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔اندر سے شاور کی آواز آرہی تھی۔مارے طیش کے کالی داس دندناتا ہوا اس کے گھر سے نکل گیا۔جب اس کی کار بنگلے کی طرف سے جارہی تھی۔تو گلی کے دوسرے سرے سے گپتا کی کار داخل ہورہی تھی۔کالی داس کی جھلک دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا۔آج وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دفتر سے جلدی اٹھ گیا تھا۔شاید اسی وجہ سے اس نے کالی داس کو دیکھ لیا تھا۔اس کو ششمیتا کا کالی داس سے تفریح گاہوں میں ملنے کے بارے میں معلوم تھا لیکن یہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے گھر میں چلا آئے گا۔رام داس کو غائب پا کر اس کا شبہ پختہ ہوگیا تھا۔رام داس نے بتایا تھا کہ جب ششمیتا سے ملنے کوئی مرد آتا ہے تو وہ اسے کسی کام سے کہیں بھیج دیا کرتی تھی۔کیا آج اس نے کالی داس کی وجہ سے رام داس کو شہر بھیجا تھا؟

اندر ششمیتا واش روم میں تھی اور بستر کی الجھی چادر اسے بہت کچھ بتارہی تھی۔وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ایک گھنٹے بعد وہ دوبارہ بنگلے میں داخل ہوا تو ششمیتا تروتازہ ؟ لان میں موجود تھی اور رسالہ دیکھ رہی تھی۔وہ اس کے پاس چلا آیا۔ششمیتا نے گرم جوشی سے شوہر کا استقبال کیا تھا۔کراہت کے باوجود گپتا نے مسکرا کر اسے جواب دیا۔کچھ دیر بعد اس نے ششمیتا کو بتایا میں پریشان ہوں ایک ہفتے کے لیے مجھے ممبئی جانا پڑرہا ہے۔

''تم اکیلے کیسے رہوگی؟''

ششمیتا خوش ہوگئی تھی لیکن عام سے انداز میں بولی۔''کوئی بات نہیں جب تم جاتے ہو تب بھی تو میں اکیلی رہتی ہوں۔''

''وہ بات الگ ہوتی ہے۔میں تم سے رابطہ کرسکتا ہوں لیکن اس ایک ہفتے کے دوران میں تم سے بالکل بھی رابطہ نہیں کرسکوں گا۔کیونکہ میں ایک خفیہ مشن پر جارہا ہوں اس کے دوران ہمیں گھر والوں سے رابطے کی اجازت نہیں ہوگی۔''

''نو پرابلم۔رام داس تو ہوگا۔''

''اور شاید کالی داس بھی۔'' یہ جملہ گپتا نے دل میں کہا۔اس کا ظاہری سکون دیکھتے ہوئے ششمیتا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے اندر آتش فشاں سا کھول رہا ہے۔

☆......☆......☆

ابراہیم کی موت نے انہیں سہادیا تھا۔چند ہفتے پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تندرست اور ان سب سے زیادہ طاقت ور ابراہیم یوں آسانی سے موت کو گلے لگائے گا۔نہ جانے ان جلادوں نے اس پر کیا تشدد کیا تھا کہ اس نے چند گھنٹوں میں جان دے دی تھی۔ابراہیم کی لاش وہ صبح کے وقت لے گئے تھے۔لے جانے والوں نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیا کریں گے۔بعد میں نادر نے تلخی سے کہا۔

''کیا کرے گا کسی گڑھے میں دبادے گا۔''

جان محمد محسوس کررہا تھا اب جان بچانے کے لیے حکمت عملی ضروری تھی لیکن ایک بار ہی اس کے بارے میں بات کرکے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کے ساتھی کتنے مشتعل تھے۔عین ممکن تھا کہ وہ اصرار کرتا تو اس پر ٹوٹ پڑتے۔حتیٰ کہ اسے اپنے بھائیوں میں بھی غصہ نظر آیا تھا۔نادر نے کہا تھا۔

''باس! اتنی جلدی ابراہیم کا خون بھول گیا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' جان محمد تیزی سے بولا۔

''وہ ہمیں ایک ایک کرکے ماردیں گے۔'' قاسم کی کیفیت سب سے زیادہ خراب تھی۔

''ہم بے بس ہیں۔'' ولی بولا۔

''ان لوگوں سے رحم کی توقع نہیں کرسکتے۔''

اس دن مدارسی نے جان محمد کو اپنے دفتر میں بلالیا۔اس بار اس کی میز پر انگریزی میں نام کی تختی بھی رکھی تھی۔شرما انکردھ وہ سمجھتا تھا کہ شاید جان محمد انگریزی

سے ناواقف ہے۔اس لیے اس نے تختی ہٹانے کی زحمت نہیں کی۔

''ہاں دوست! کیا سوچا تم نے؟''

''کیا سوچنا ہے۔'' جان محمد تلخی سے بولا۔

''ہمیں شاید مرنا ہے۔تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگیں گے۔''

''مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔پولیس حکام تمہیں تحویل میں لینے کے لیے بے چین ہے اور تمہارے ساتھی نے اسپتال جاتے ہوئے میرے آدمیوں پر حملہ کیا تھا۔سزا کے طور پر اسے مارا گیا۔مجھے افسوس ہے وہ مر گیا۔اس میں میرے آدمیوں کا کوئی دوش نہیں ہے۔''

جان محمد نے خود دیکھا تھا۔ابراہیم کے جسم پر تیز دھار آلات کے زخم تھے لیکن شرما سے یہ بات کہنا بے کار تھا۔وہ ان کے قبضے میں تھے اس لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھے۔وہ چپ رہا شرما نے دو تین بار اس سے پوچھا اور جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے غصے میں آ کر اپنے آدمی بلائے۔

''اسے جا کر جیل میں پھینک دو۔اب بھارتی پولیس ان سے نمٹے گی۔''

جان محمد کھڑا ہو گیا۔''میرے مرنے والے ساتھی کی لاش کہاں رکھی ہے؟''

شرما مسکرایا۔''ہم نے صرف پانچ ماہی گیر گرفتار کیے ہیں۔چھٹا گرفتاری کے دوران مقابلہ کرتے ہوئے سمندر میں گر کر ہلاک ہو گیا اور اس کی لاش بھی نہیں ملی۔''

''تم لوگ جھوٹ بولنے میں ماہر ہو۔''

''ہم جو کہتے ہیں دنیا اسے سچ مانتی ہے۔''

جان محمد جیل میں واپس آ گیا۔اس کے ساتھی اداس چہروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ولی اور غلام نے اسے دیکھ کر سکون کی سانس لی تھی۔ورنہ وہ پریشان تھے کہ جان محمد کا حشر بھی ابراہیم کی طرح نہ ہو۔اس نے بتایا۔

''کہ میں نے ان لوگوں کو انکار کر دیا ہے کہ ہم پاکستان کے جاسوس ہونے کا اقرار نہیں کریں گے۔چاہے یہ کچھ بھی کر لیں۔ہم مر جائیں گے لیکن ان کی بات نہیں مانیں گے۔'' نادر بولا۔

''شاید اسی وجہ سے انہوں نے ہمیں بھارتی پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

سیل کی تاریکی میں انہیں باہر کے موسم اور دن رات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔البتہ جب اندر جلتے بلب بجھ جاتے تھے تو انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ رات ہو گئی ہے اب انہیں سو جانا چاہیے۔اس وقت بھی بلب بجھے ہوئے تھے جب ان کی جیل کا دروازہ کھلا اور چار مسلح افراد نے انہیں باہر آنے کو کہا۔وہ انہیں لے کر اوپر آئے۔پہلی بار انہوں نے عمارت سے کھلا آسمان دیکھا۔

اوپر سے یہ خاصی مختصر عمارت تھی جس کے چاروں طرف اونچی دیوار تھی۔موسلادار بارش ہو رہی تھی۔برآمدے میں بھارتی پولیس کے نوجوان کھڑے تھے ان کے پاس رائفلیں تھیں۔انہوں نے سب سے پہلے جان محمد اور اس کے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں لگائیں اور پیروں میں بیڑیاں پہنائیں اور اس کے بعد انہیں ایک بند وین کے عقبی حصے میں سوار کرایا۔وین کے باہر دیکھنا ناممکن تھا اس لیے وہ چار دیواری سے باہر آنے کے باوجود عمارت کا محل وقوع نہیں دیکھ سکتے تھے اور دیکھ بھی لیتے تو کیا کر سکتے تھے۔

☆......☆......☆

ششمیتا متفکر تھی کیونکہ ابھی کمار نے اسے فون پر آنے کی اطلاع دی تھی اس نے کوشش کی کہ کمار نہ آئے لیکن وہ طیش میں تھا۔

''مسز گپتا! اگر میں ابھی نہیں آیا تو جب گپتا گھر ہو گا تو پھر آؤں گا اور یہ ملاقات تمہارے لیے بہتر نہیں ہو گی۔''

''پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔آج کل گپتا نے مجھ پر سختی کر رکھی ہے۔''

''اس کے باوجود تم اس نیوی افسر کالی داس کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی ہو جس نے تمہارے شوہر کے خلاف سازش کی ہے۔'' کمار کا لہجہ زہریلا تھا۔

''مجھے تم سے خاصا حساب کتاب کرنا ہے۔''

''کیسا حساب کتاب؟'' ششمیتا تیزی سے بولی۔

"میں آکر بتاؤں گا۔"

ایک گھنٹے کے بعد ہی وہ اس کے سامنے تھا۔آج گپتا کی رات کی ڈیوٹی تھی اور تیز بارش اور ہلکے ہلکے سے طوفان کی وجہ سے ششمیتا بھی مجبوراً گھر میں بند تھی۔بارش کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہوگیا تھا اور وہ نشست گاہ میں آتش دان کے سامنے بیٹھی تھی۔بلند اور کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے سردی کی شدت میں اضافہ ہورہا تھا۔ششمیتا کمار کے آنے سے پریشان تھی لیکن اسے اعتماد تھا کہ وہ اسے قابو میں کرسکتی ہے۔گزشتہ کچھ عرصہ میں کمار نے اس کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔کمار ایک گھنٹے بعد آ گیا تھا۔

"کیوں آئے ہو؟" ششمیتا نے بے گانگی سے کہا۔

"میں نے کہا نا۔میں حساب کرنے آیا ہوں۔" کمار نے اوورکوٹ اتار کر صوفے پر ڈال دیا۔اس کا بالوں سے محروم سر اور چہرہ بھیگا ہوا تھا۔وہ آتش دان کے پاس جاکر ہاتھ تاپنے لگ گیا۔

"میرا خیال ہے ہمارا ایک دوسرے پر کوئی حساب کتاب باقی نہیں رہا ہے۔" ششمیتا نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔اس کے ہاتھ میں جام تھا اور اس نے کمار سے رسماً بھی نہیں پوچھا تھا۔

کمار نے اس کی طرف دیکھا۔"میں نے اب تک تم پر ایک لاکھ خرچ کیا ہے۔"

"اس کے بدلے میں تمہیں تمہاری مرضی کی رفاقت فراہم کرچکی ہوں۔" ششمیتا نے بے پروائی سے جواب دیا۔

کمار کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔"ششمی! تم اتنی آسانی سے مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی ہو۔کیا کالی داس پر اس لیے دل آیا ہے کہ وہ خوبصورت اور قدآور ہے۔وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔"

"اس بات کا فیصلہ تم کیسے کرسکتے ہو؟"

کمار اچانک غرایا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

"اس کا فیصلہ میں اس طرح کرسکتا ہوں۔"

"چھوڑو۔۔۔مجھے۔۔۔کم۔۔۔کمینے۔۔۔!" ششمیتا نے گلا چھڑانے کی کوشش کی اور کمار کے منہ پر تھپڑ دے مارا اور پھر کمار پر جنون طاری ہوگیا اور اس نے پورے زور سے ششمیتا کا گلا دبانا شروع کردیا۔موت کو سامنے دیکھ کر ششمیتا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کمار کی طاقت کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔چند منٹ کی کشمکش میں اس کا جسم سرد پڑ گیا۔کمار نے ایک آخری جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔وہ صوفے پر گر گئی۔کمار بے فکر نظر آرہا تھا۔اسے آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔اس نے اپنی کار چند گلیاں پہلے ہی پارک کردی تھی۔وہ نشست گاہ کا براہ راست باہر جانے والا دروازہ کھول کر باہر آیا۔اوورکوٹ پہن کر اس نے باہر کی طرف دیکھا۔بجلی چمکی تو سارا ماحول روشن ہوگیا تھا۔کچے ڈرائیو وے پر کار کے پہیوں کے نشان واضح تھے۔البتہ رام داس غائب تھا غالباً وہ اپنی کوٹھڑی میں پڑا سو رہا تھا۔وہ مطمئن ہوکر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

☆......☆......☆

گپتا نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔اس کا خیال تھا کہ وہ ششمیتا کی سرگرمیوں پر نظر رکھے گا۔اس کے خلاف ثبوت حاصل کرے گا اور پھر اسے طلاق دے کر بدنامی کے اس باب کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے گا۔وہ رات گئے دفتر سے روانہ ہوا۔دو دن سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے ساتھی کو چارج دے کر نکل آیا۔بارش مستقل برس رہی تھی اور اس کے رکنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔اس کی پرانی مگر مضبوط کار سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔اس کا سر درد کی شدت سے چکرا رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جائے۔ایک کپ گرم چائے پیئے اور بستر میں گھس کر سو جائے۔

وہ بے دھیانی میں تیز ڈرائیو کررہا تھا۔اچانک اسے سامنے گاڑی کا ہیولا نظر آیا۔خطرے کا احساس ہوتے ہی اس نے پوری طاقت سے اسٹیئرنگ کاٹا اور اس کی کار کچے میں اتر گئی۔چند زبردست جھٹکے لینے کے بعد وہ ساکت ہوگئی تھی۔گپتا حادثے

سے بال بال بچا تھا۔اسے احساس تھا کہ وہ صرف گاڑی سے بچا تھا وہ سڑک پر الٹی پڑی تھی۔شاید اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا اور اس میں موجود افراد کو مدد کی ضرورت تھی۔یہ خیال آتے ہی وہ گاڑی سے اتر کر اس طرف پہنچا یہ بند وین تھی جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا تاریکی سے نکل کر چند افراد نے اسے گھیر لیا تھا۔ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کا رخ اس کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

ان کے ساتھ صرف دو سپاہی تھے وہ پانچوں بے بس تھے۔پولیس والے مسلح تھے۔اس لیے وہ پوری طرح مطمئن تھے۔جان محمد اور ان کے ساتھیوں کو قطعی علم نہیں تھا کہ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔اگر انہیں پولیس کے حوالے کیا گیا تھا تو ان پر مقدمہ بھی چلتا وہ حسب سابق غیر قانونی قید میں رہتے۔وین تیز رفتاری سے چل رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ہموار اور سیدھی سڑک پر سفر کر رہے ہیں کیونکہ خاصی دیر سے کوئی موڑ نہیں کاٹا تھا۔جان محمد کو خیال آیا شاید انہیں شہر سے باہر لے جا رہے ہیں۔دونوں سپاہی ایک ساتھ بیٹھے بے فکری سے گپیں مار رہے تھے۔

''کاش میرے ہاتھ آزاد ہوتے۔'' جان محمد نے سوچا۔دو سپاہیوں سے بھڑ جانا۔آزاد ہونے کا ایسا موقع پھر ان کے ہاتھ نہیں آتا جکڑے ہوئے ہاتھوں نے اسے مجبور کر دیا تھا۔سپاہیوں نے رائفلیں بھی بے پروائی سے شانوں پر لٹکا رکھی تھیں۔اپنی طرف سے مایوس ہو کر جان محمد خدا سے دعا کرنے لگا۔یہ شاید قبولیت کا لمحہ تھا کیونکہ کوئی جانور سڑک سے گزر رہا تھا وین کی تیز ہیڈ لائٹس نے اسے بدحواس کر دیا۔وین ڈرائیور نے اسے بچانے کے لیے اسٹیئرنگ پوری قوت سے موڑ دیا بارش کی وجہ سے سڑک پر وین کے پہیے گھومے اور نتیجے میں الٹ گئی تقریباً پچاس میل کی رفتار سے جاتی وین نے کئی قلابازیاں کھائیں اور سڑک پر پہلو کے بل ساکت ہو گئی تھی۔ڈرائیور کی قضا آ گئی تھی۔الٹنے کے دوران اس کا سر شیشہ توڑ کر باہر نکل گیا اور وین کے نیچے آ گیا اس کی موت وہیں واقع ہو گئی تھی۔البتہ عقبی حصے میں موجود افراد مضروب ضرور ہوئے تھے لیکن کسی شدید زخم سے محفوظ رہے تھے۔

وین رکنے کے بعد سب سے پہلے جان محمد کو ہوش آیا تھا اس کے اوپر ایک سپاہی پڑا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔اس کے اوپر پڑا سپاہی کراہ رہا تھا۔وین الٹنے کے دوران اس میں جلتا بلب پھٹ گیا تھا اور اب اندر تاریکی تھی لیکن سپاہی کے بازو کا بیج اسے چبھ رہا تھا۔اچانک اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔وین کو حادثہ پیش آ گیا تھا اور ان کے پاس سنہری موقع تھا کہ وہ فوراً آزاد ہو سکتے ہیں۔اس نے اپنی ہتھکڑی والے ہاتھ سپاہی کی گردن میں ڈال دیئے اور اس کا گلا دبانے لگا۔اس کا جسم تڑپا مچلا مگر جان محمد کے مضبوط ہاتھوں سے آزاد نہ ہو سکا۔باقی افراد ابھی تک بے ہوش تھے اس لیے کسی کی طرف سے ردعمل نہیں آیا حتیٰ کہ سپاہی کا جسم سرد پڑ گیا۔جان محمد نے سب سے پہلے اس کی جیب کی تلاشی لی۔ان کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی چابی ایک سپاہی کے پاس تھی۔جان محمد نے خود کو آزاد کیا پھر اس نے وین کا دروازہ کھولا۔بجلی چمکنے سے اندر کا منظر ایک لمحے کے لیے روشن ہوا اور اس نے رائفل دیکھ لی تھی اور دوسرے سپاہی کو بھی اس نے ہتھکڑیوں کا جوڑا پہنا دیا۔اس کے چاروں ساتھی بے حس تھے وہ انہیں ٹٹول ٹٹول کر آوازیں دینے لگا۔سب زندہ تھے۔پہلے ولی کو ہوش آیا۔پندرہ منٹ بعد وہ وین سے باہر تھے۔بارش اور سردی عروج پر تھی مگر آزادی کا جذبہ ہر تکلیف پر حاوی تھا۔انہیں چوٹیں آئیں تھیں لیکن کسی کی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔نادر نے ڈرائیور کی رائفل نکال لی تھی۔سپاہیوں کے جسم سے فاضل گولیوں کی بیلٹس بھی اتاری تھیں۔وہ سوچ رہے تھے کہ آگے کیا کریں کہ سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس لہرائیں۔

''چھپ جاؤ!'' جان محمد چلایا اور وہ ادھر ادھر چھپ گئے۔

ایک منٹ بعد وہ گپتا کو گھیرے کھڑے تھے۔تین عدد رائفلوں اور پانچ آدمیوں کے سامنے وہ قطعی بے بس تھا پھر بجلی چمکی تو جان محمد نے اسے دیکھ لیا۔

''تم بھارتی لانچ کے کپتان ہو۔جس نے پاکستانی ماہی گیر پکڑے تھے۔''

گپتا چونکا۔''تم کیسے جانتے ہو۔۔۔۔۔۔کون ہو تم؟''

''ہم!وہی ماہی گیر ہیں یہ وین ہمیں کسی جیل کی طرف لے جا رہی

تھی۔" جان محمد بولا۔

"ہمارا ایک ساتھی مارا گیا ہے اور اس کے ذمے دار تم ہو۔" اس نے گپتا کا گلا پکڑ لیا۔

"میری بات سنو۔ ایک منٹ ۔۔۔۔ تم نے دیکھا تھا کہ میں نے ہمیشہ کالی داس کی مخالفت کی تھی۔ میری مخالفت کی وجہ سے کالی داس نے اعلیٰ افسران سے مجھے ڈس مس کرا کے بوٹ کی کپتانی خود سنبھال لی تھی۔ اگر تم اس کے کیے کی سزا مجھے دو گے تو یہ زیادتی ہو گی۔"

جان محمد نے محسوس کیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے گپتا کا گلا چھوڑ دیا۔

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

"دفتر سے، میں اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ نیول کالونی میں۔"

"تب ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔" جان محمد نے فوری فیصلہ کر لیا۔ گپتا کا گھر ان کے لیے محفوظ ترین جگہ ثابت ہو سکتا تھا۔ تلاش کرنے والوں کو خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان کے مفرور نیول کالونی میں روپوش ہو سکتے ہیں۔ وہ سب کسی نہ کسی طرح گپتا کی کار میں آ گئے۔

"سنو شاید تم لوگ یہ سمجھو کہ میں تمہارا دشمن ہوں ۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ جب تم لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ تب بھی میں نے مخالفت کی تھی اور گرفتاری کے بعد میں نے بہتر سلوک کے لیے سفارش کی تھی لیکن یہاں کے اکثر لوگ میرے ہم خیال نہیں ہیں۔ وہ پاکستان کے سخت دشمن ہیں۔"

"اور تم دوست ہو؟" جان محمد نے طنز کیا۔

"نہیں۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"میں بھی دوست نہیں ہوں لیکن مجھے احساس ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"سب سے پہلے تو میں تمہیں پناہ گاہ فراہم کر سکتا ہوں۔ جیسے ہی حادثے کی خبر پہنچے گی تم لوگوں کی تلاش بڑے پیمانے پر شروع کر دی جائے گی۔"

"اگر ہم پاکستان واپس جانا چاہیں۔"

گپتا نے گہری سانس لی۔ "تب ذرا مشکل ہو گی۔ سمندری راستے سے جانے کے لیے کشتی درکار ہو گی اور خشکی کا راستہ بہت دور ہے۔ میں تمہیں امید نہیں دلا سکتا۔"

"خیر ابھی ہمیں پناہ کی ضرورت ہے۔" جان محمد نے کہا۔

ویسے وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ یہاں سے پاکستان جانا آسان نہیں تھا۔ بھارتی بحریہ اور بارڈر سیکورٹی فورس اپنی سرحدوں کی سخت نگرانی کرتے تھے۔ اسے یاد آیا ممبئی میں اس کی برادری کے کچھ لوگ آباد تھے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے تھے مگر مسئلہ کشمیر کے اٹھنے کے بعد یہ آمدورفت تقریباً بند ہو گئی تھی اگر وہ کسی طرح ممبئی تک پہنچ جاتے تو مچھیرے برادری کے یہ لوگ ان کی مدد کر سکتے تھے۔

نیول کالونی فوجی سیکورٹی کا علاقہ نہیں ہے۔ اس لیے راستہ میں کسی چیک پوسٹ کا واسطہ نہیں پڑا اور وہ بہ حفاظت گپتا کے گھر تک جا پہنچے۔ گیٹ سے رام داس کو غائب پا کر گپتا کا ماتھا ٹھنکا تھا اور جب اس نے داخلی دروازے کو بھی کھلا پایا تو اسے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ ششمیتا اکیلے ہونے کی صورت میں کبھی داخلی دروازہ کھلا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس نے جان محمد سے کہا۔

"کوئی گڑبڑ ہے میرا اردلی بھی غائب ہے اور گھر کا دروازہ کھلا ہے۔"

"اردلی اپنے کوارٹر میں ہو سکتا ہے۔"

گپتا اب ششمیتا کو آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے پہلے بیڈ روم میں جھانکا پھر ڈائننگ میں دیکھا۔ آخر میں وہ نشست گاہ تک آیا۔ جہاں ششمیتا بے جان صوفے پر پڑی تھی۔ اس کا نیلگوں چہرہ اور ساکت سینہ دیکھ کر گپتا کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مر چکی ہے۔ وہ گنگ رہ گیا۔ جان محمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ کون ہے؟"

"میری بیوی۔" گپتا نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نجانے کس نے اسے قتل کر دیا ہے۔''

''قتل!'' جان محمد چونکا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اس کی گردن کی طرف دیکھو۔'' گپتا نے اشارہ کیا۔

یہ صورت حال خاصی غیر متوقع تھی۔ خاص طور پر جان محمد اور اس کے ساتھیوں کے لیے کیونکہ وہ پناہ لینے کیلئے ادھر آئے تھے اور قتل کا مطلب تھا۔ پولیس کی مداخلت۔۔۔ کچھ دیر میں ولی اور نادر رام داس کو دھکے دیتے ہوئے بنگلے میں لائے۔

''یہ اپنے کوارٹر میں پڑا سو رہا تھا۔'' ولی نے بتایا۔

''حرام زادے۔۔۔! تو اپنے گھر میں پڑا سو رہا تھا۔'' گپتا اس پر برس پڑا تھا۔

''کسی نے ششمی کو قتل کر دیا ہے۔''

رام داس ساکت ہو گیا۔ ''سرکار۔۔۔! میں بے قصور ہوں۔''

''اس بنگلے میں اور کون ہے؟'' نادر نے پوچھا۔

''بس میں اور رام داس ہیں۔'' گپتا نے بتایا۔

وہ سب بھوکے تھے۔ نشست گاہ کو بند کر کے وہ ڈائننگ روم میں آئے۔ رام داس نے ان کیلئے کھانا بنایا۔ کھانے کے بعد انہوں نے گپتا کے کپڑے پہنے۔ اپنا بوسیدہ لباس اتار دیا جو بھیگ بھی گیا تھا۔ کھانے کے بعد گپتا نے ان سے کہا۔

''سنو دوستو! اب میں تمہیں پناہ نہیں دے سکتا۔ یہ قتل کا معاملہ ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' جان محمد نے کہا۔

''لیکن ابھی ہم کہیں نہیں جا سکتے ہیں۔''

''ششمیتا کی لاش کا کیا ہو گا؟''

''ہاں یہ مسئلہ ہے۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ فی الحال لاش دفنا دیتے ہیں۔ جب ہم چلے جائیں تو تم پولیس کو بتا دینا۔''

مگر گپتا کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ششمیتا کی لاش اسے پھنسوا دیتی۔ وہ کسی طرح بھی پولیس کو اپنی بے گناہی باور نہیں کرا سکتا تھا۔ سب سے پہلے اسی پر شک کیا جاتا۔ پولیس کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی کہ ششمیتا ایک بے راہ رو عورت تھی اور اس کے کئی معاشقے بیک وقت جاری تھے۔ وہ گھر میں مردہ پائی گئی تو پہلا شک گپتا پر جائے گا۔ اسے شبہ تھا کہ حالات جیسے جا رہے تھے فورس کی سطح پر بھی اسے بچانے کیلئے کچھ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ عین ممکن تھا اسے مزید پھنسوا دیا جاتا۔

''سنو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ ورنہ ممکن ہے مجھے پکڑ لیا جائے۔''

جان محمد حیران رہ گیا۔ ''تم جاؤ گے لیکن کیوں۔۔۔ تمہیں کس کا ڈر ہے؟''

''مجھے ڈر ہے کہ پولیس بیوی کے قتل کے شبے میں مجھے پکڑ لے گی۔''

''تو کیا تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟''

گپتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں تمہارے ساتھ آیا ہوں تم دیکھ رہے تھے کہ وہ پہلے ہی مر چکی تھی مگر تم میرے لئے گواہی نہیں دے سکتے اور میرے پاس کوئی گواہ نہیں ہے۔ ششمیتا کا جسم ہلکا سا گرم تھا۔ یعنی پولیس پوسٹ مارٹم سے پتا چل جائے گا کہ اسے کس وقت قتل کیا گیا تھا۔''

''لیکن ہمارے ساتھ کہاں جاؤ گے؟''

''ممکن ہوا تو تمہارے ملک۔۔۔۔''

جان محمد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ جاسوسی کے الزام میں۔''

''اگر تم مدد کرو تو میں بچ بھی سکتا ہوں۔ اس نوکری سے میرا دل پہلے ہی خراب ہو گیا ہے۔ ایک بار فرار کے بعد میں ویسے بھی اس ملک میں نہیں آ سکوں گا۔''

جان محمد سوچنے لگا پھر اس نے کہا۔ ''کوئی تیز رفتار کشتی مل سکتی ہے۔ جو گہرے سمندر میں بھی جا سکے۔''

''اگر تم سمندر کے راستے فرار کا سوچ رہے ہو تو یہ بہت مشکل ہے۔'' گپتا نے نفی میں سر ہلایا۔

"سب ممکن ہے صاحب۔۔۔! پاکستان کا سمندر اس جگہ سے شاید دو سو میل دور ہے۔ اگر ہم تیز رفتاری سے جائیں تو پانچ چھ گھنٹے میں خطرے سے دور نکل جائیں گے۔ اس موسم میں بھارتی نیوی بھی سمندر پر ہوگی۔ خاص طور سے چھوٹی کشتیاں۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن بڑے جہاز سمندر میں ہیں۔"

"ان سے اتنا خطرہ نہیں ہوگا۔ اگر ہمیں تیز رفتار کشتی مل جائے۔"

گپتا سوچ میں پڑ گیا۔ "یہاں بندرگاہ سے ذرا دور ایک تفریحی ڈاک ہے۔ وہاں پر تفریحی کشتیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک مقامی جاگیردار کی بوٹ ہے۔ فرانس سے لایا تھا۔ سنا ہے چالیس ناٹ کی رفتار سے چلتی ہے اور گہرے سمندر میں آسانی سے سفر کرتی ہے۔"

"بس تو پھر ہم اسی سے سفر کریں گے۔" جان محمد بولا۔

"ڈاک یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"جانے میں کم از کم ایک گھنٹہ لگے گا۔"

"اس وقت چار بج رہے ہیں۔ روشنی سات بجے سے پہلے نہیں ہوگی۔ اگر ہم پانچ بجے بھی نکلیں تو دو گھنٹے میں خاصا دور جا چکے ہوں گے۔" جان محمد نے کہا۔

"لیکن اس کا کیا ہوگا؟" گپتا نے رام داس کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے آزاد چھوڑ گئے تو یہ پہلی فرصت میں پولیس کو خبردار کر دے گا۔"

"اسے باندھ کر ڈال جاتے ہیں۔ ایک دو دن میں کوئی نہ کوئی انہیں چھڑانے آئے گا۔"

"جان!" اچانک ولی نے پکارا۔

وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ "ادھر کوئی آ رہا ہے میں نے کار کی روشنی دیکھی ہے۔"

وہ سب چوکنا ہو گئے۔ گپتا نے کھڑکی سے جھانکا۔ "ہاں ڈرائیو وے میں کوئی کار ہے۔"

نادر اور قاسم داخلی دروازے کے پاس چھپ گئے۔ چند لمحے بعد کسی کے

قدموں کی آواز آئی اور برساتی میں ملبوس شخص اندر آیا۔ قاسم اور نادر نے بیک وقت اس کے جسم سے رائفلیں لگا دیں۔

"ہلنا مت!"

وہ کالی داس تھا۔ اس نے تیز روشنی میں نادر اور قاسم کو پہچان لیا اور انہیں رائفل بدست پا کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

"کک۔۔۔۔کون ہو تم۔۔۔۔؟" اس نے ہکلا کر کہا۔

اچانک قاسم نے اس کے سر پر رائفل کی نال ماری۔ "کتے کے بچے۔۔۔۔خنزیر کی اولاد۔۔۔۔۔پوچھتا ہے کون ہیں ہم لوگ۔۔۔" اس نے دوسری بار نال ماری تو کالی داس چکرا کر گر گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ چند لمحے ہاتھ پاؤں پٹخنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا تھا۔ شور سن کر دوسرے بھی وہاں آ گئے اور کالی داس کو دیکھ کر سب کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ گپتا نے اس کے جسم کو ٹھوکریں ماریں۔

"اچھا ہوا یہ آ گیا ورنہ میری حسرت دل میں رہ جاتی۔"

جان محمد وقت کے خیال سے پریشان تھا۔

"جو کرنا ہے جلدی کرو۔ ہمیں اب نکلنا ہے۔"

گپتا نے بے ہوش کالی داس کو ششمیتا کی لاش کے ساتھ بنگلے کے اسٹور روم میں بند کر دیا۔ جس کا دروازہ اتنا مضبوط تھا کہ ہاتھی بھی اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ رام داس کو اس نے ایک دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ جان محمد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"کہیں بھوک پیاس سے مر نہ جائے۔"

"مر جائے!" گپتا نے بے پروائی سے کہا۔

"جو نمک حرام مالک کے گھر کی حفاظت نہ کرے اس کا یہی انجام ہونا چاہیے۔"

گپتا کے پاس سروس پستول بھی تھا۔ وہ اس نے خود جان محمد کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ لوگ باہر نکلے۔ بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ گپتا بولا۔

"اس موسم میں سمندر کی حالت بری ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں صاحب۔۔۔! ہم اس سے بھی بری حالت میں بوٹ چلا چکا ہے۔"

گپتا نے ڈرائیونگ سنبھالی اور وہ بے حد تیزی سے ڈاک کی طرف روانہ ہو گئے۔ جان محمد نے اس سے کہا۔

"بڑی سڑکوں کی بجائے ذیلی سڑکوں سے چلے عین ممکن ہے۔ پولیس نے ناکہ بندی کر رکھی ہو۔"

"اس طرح زیادہ وقت لگے گا۔" گپتا نے کہا۔

"پروا نہیں ہے صاحب! بس پولیس کا سامنا نہ ہو۔ ورنہ ہم پکڑے جائے گے اور ہمارے ساتھ آپ بھی۔"

گپتا نے ہائی وے راستہ چھوڑ کر ذیلی سڑکوں سے گزرنا شروع کر دیا۔ وہ جان محمد سے متفق تھا اگر پولیس وین دریافت کر لی گئی تھی تو اس وقت ہائی وے پر تلاش کا کام جاری ہوتا۔ ذیلی سڑکوں سے راستہ دور ہوتا گیا تھا لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ پولیس کا سامنا کیے بغیر بالآخر پرائیویٹ ڈاک تک جا پہنچے تھے۔

☆......☆......☆

کالی داس کو ہوش آیا تو وہ تاریکی میں ایک ٹھنڈے فرش پر پڑا تھا۔ اس نے فرش ٹٹولا تو اس کا ہاتھ ایک سرد جسم سے ٹکرایا۔ اس کے اندر خوف کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ یہ جسم حرارت سے قطعی خالی تھا۔ اس نے اٹھ کر دیوار ٹٹولی اور بالآخر ایک طرف سوئچ بورڈ تلاش کر لیا۔ پہلے اسے کھلے ساکٹ سے ہلکا سا کرنٹ لگا اور اس نے "ہائے ماتا جی" کو پکارا۔ صحیح سوئچ دباتے ہی کمرہ روشن ہو گیا تھا۔ لاش ٹٹولنے کے دوران اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس کی لاش ہو سکتی ہے۔ پھر بھی ششمیتا کو مردہ دیکھ کر اسے دھچکا پہنچا تھا۔ چند دن پہلے یہ عورت اس کی تنہائیاں مہکاتی تھی۔ اس کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ گپتا نے انتقام لینے کے لیے ششمیتا کو قتل کر کے اس کی لاش کو اس جگہ بند کر دیا تھا۔

"حرام زادہ۔۔۔!" اس نے بلند آواز میں کہا۔

اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ دروازہ کھولنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسٹور روم میں کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ وہ اس میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا۔ جس سے دروازہ توڑا جا سکے۔ چیزیں الٹنے پلٹنے کے دوران اسے ایک کلہاڑی ہاتھ لگ گئی۔ اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ یہ فائر فائٹرز والی کلہاڑی تھی۔ خاص طور سے بند دروازے کھولنے کے لیے۔ وہ اسے لے کر دروازے پر پل پڑا تھا۔ پے در پے ضربوں سے وہ لاک کے آس پاس والا حصہ توڑنے لگا۔ اس کام میں مشکل سے بیس منٹ لگے تھے۔ تیز دھار کلہاڑی نے دروازے کے پرخچے اڑا دیئے تھے۔ وہ باہر نکلا تو بنگلے میں خاموشی تھی۔ اس نے بیڈ روم، کچن اور نشست گاہ دیکھی۔ ڈائننگ روم بھی خالی تھا لیکن کچن سے کسی کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے کلہاڑی پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کچن کا دروازہ کھولا اس کی کنڈی باہر سے لگی تھی۔ اندر رام داس بری طرح بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا لیکن وہ ناک سے آواز نکال کر اور پاؤں کچن میں رکھے ڈیپ فریزر پر مار کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کالی داس نے اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور غرا کر بولا۔

"وہ لوگ کہاں ہیں؟ جھوٹ مت بولنا۔ ورنہ۔۔۔ گردن کاٹ دوں گا۔"

"نن۔۔۔ نہیں سرکار۔۔۔! وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ مجھے ادھر بند کر گئے ہیں۔"

"کدھر گئے ہیں؟"

"پتا نہیں صاحب۔۔۔! پر کسی کشتی کا کہہ رہے تھے۔ کسی ٹھاکر کی کشتی ہے۔ اس کے ذریعے پاکستان جانے کی بات کر رہے تھے۔"

"پاکستان۔" کالی داس اچھل پڑا تھا۔ وہ فون کی طرف جھپٹا لیکن رسیور اٹھاتے ہی اسے پتا چل گیا تھا کہ فون مرا پڑا ہے۔ اس نے گندی سی گالی دی اور باہر کی طرف لپکا۔ کچن میں رام داس شور مچا رہا تھا کہ اسے کھولا جائے مگر کالی داس نے اس کی فریاد پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی کار بنگلے کے گیٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ چابی غائب پا کر اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان ابل پڑا تھا۔ بہرحال اس نے جھک کر نیچے سے

تاریں نکالیں۔ ان کو جوڑ کر انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے شمار تاروں میں دو تار تلاش کرنا مشکل تھا۔ بالآخر اسے درست تار مل گئے۔ انجن نے جھرجھری لی اور اسٹارٹ ہو گیا۔

☆......☆......☆

پرائیویٹ ڈاک زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس پر کوئی دو درجن کے قریب چھوٹی بڑی تفریحی کشتیاں کھڑی تھیں۔ سب سے پہلے چیک پوسٹ کے گارڈ نے روکا۔ اسے باندھ کر اس کی چوکی میں ڈال دیا گیا پھر کشتی کے محافظ نے انہیں روکا اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا پڑا۔ کشتی دیکھ کر جان محمد کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ یہ خاصی بڑی اور مضبوط نظر آنے والی کشتی تھی۔ جس میں دو عدد طاقت ور ڈیزل انجن تھے۔ البتہ بوٹ میں ڈیزل کی مقدار کم تھی۔ اسے انہوں نے اردگرد کی کشتیوں سے پورا کیا۔

صبح چھ بجے وہ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ کشتی گپتا خود چلا رہا تھا۔ قاسم اور ولی ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ نادر اور غلام سو گئے تھے۔ جان محمد گپتا کے ساتھ تھا۔ اگرچہ گپتا اب تک اس سے پورا تعاون کرتا آیا تھا مگر وہ اس پر اعتبار کرنے کیلئے تیار نہیں تھا یہ بات گپتا نے بھی محسوس کی۔ دو تین بار اس نے جان محمد کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ مخلص ہے مگر اس نے اپنے رویے کو تبدیل نہیں کیا تھا۔ گپتا سفر کے چارٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جان محمد سے کہا۔

''ہمیں ساحل سے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ گہرے سمندر میں بھارتی بحریہ کے جہاز ہمیں گھیر سکتے ہیں۔''

''وہ اس بوٹ سے زیادہ تیز رفتار نہیں ہو سکتے۔''

گپتا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم بحریہ کے بارے میں نہیں جانتے ہو۔ وہ تمہیں روکنے کیلئے جہاز حرکت میں نہیں لائیں گے۔ ان کے پاس ہیلی کاپٹر ہیں۔ طیارے ہیں وہ ان سے ہمیں گھیر لیں گے اور ہم ان سے کسی صورت نہیں بچ سکتے ہیں۔''

جان محمد نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہو صاحب!''

گپتا نے بوٹ نکالنے کے کوئی نصف گھنٹے بعد ساحل کے ساتھ متوازی کر

لی۔ اس طرح انہیں زیادہ سفر کرنا پڑتا لیکن وہ محفوظ رہ سکتے تھے۔ کالی داس کے بارے میں اسے اطمینان تھا کہ وہ بغیر کسی بیرونی مدد کے باہر نہیں آ سکتا ہے۔ رام داس کو بھی بالکل بے بس کر کے کچن میں ڈال آئے تھے۔ قاسم اور ولی نے گرما گرم ناشتا بنایا۔ پراٹھے، حلوا اور تلے ہوئے انڈے تھے۔ چائے اور کافی دونوں تھے۔ جسے جو پسند آئے پی سکتا تھا۔ جان محمد اور اس کے ساتھیوں نے کتنے دن بعد سیر ہو کر کھایا تھا۔ ناشتا کر کے ولی سونے چلا گیا اور نادر کو جگا کر جان محمد بھی آرام کرنے چلا گیا۔ قاسم کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ عرشے سے چاروں طرف نظر رکھے۔ نادر کو گپتا پر لگایا تھا۔ نادر کشتی چلانے اور نیوی گیشن کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔ اس لئے جان محمد نے اس کی ذمے داری لگائی تھی۔ اگر گپتا دھوکا دینے کی کوشش کرتا تو وہ آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔

ساحلی علاقوں میں شدید بارش جاری تھی لیکن کھلے سمندر میں موسم کسی قدر بہتر تھا۔ ابر آلود آسمان کے ساتھ ہلکی بارش ہو رہی تھی مگر روشنی کافی تھی اور سمندر میں مدوجزر بھی کم تھا اس لئے وہ بہ آسانی بیس ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے بوٹ چلا رہے تھے۔ نو بجے تک وہ خاصی دور نکل چکے تھے۔ موسم اور سمندر کی حالت کو دیکھتے ہوئے مقامی ملاح کشتیاں کنارے پر لے گئے تھے۔ دوسرے مقاصد کیلئے چلنے والی چھوٹی کشتیاں اور لانچز بھی لنگر انداز تھیں اس لئے راستے میں انہیں کوئی کشتی نظر نہیں آئی۔ البتہ دور کھلے سمندر میں آتے جاتے بڑے بحری جہازوں کے ہیولے صاف نظر آ رہے تھے۔ دس بجے قاسم اور نادر دوبارہ سونے چلے گئے تھے۔ جان محمد اور غلام محمد اوپر آ گئے۔

یہ خاصی پرتعیش قسم کی بوٹ تھی جس کے نچلے حصے میں تین لگژری قسم کے بیڈ روم تھے۔ جہاں پر تمام تر سہولتیں تھیں جان محمد نے ایک بیڈ روم کی تلاشی لی اور وہاں پر گپتا کو سونے کیلئے بھیج دیا۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔

گپتا کو بیڈ روم میں دواؤں کی الماری سے نیند کی گولیاں مل گئیں جو اس نے کئی ایک ساتھ نگل لیں اب وہ صرف آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ سوچتے سوچتے سو گیا کہ اس نے ان لوگوں کا ساتھ کیوں دیا ہے۔ آخری الفاظ اس کے ذہن میں یہ آئے تھے

کہ سب بھاڑ میں جائے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

☆......☆......☆

بندرگاہ کی طرف آتے ہوئے کالی داس کا دماغ کسی قدر سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر اس نے اعلیٰ حکام کو اطلاع دے دی تو اس کا کریڈٹ بھی وہی لے جائیں گے۔ بہتر ہے وہ خود سمندر میں جائے اور ان لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ لوگ اور گپتا ہاتھ آ گئے تو وہ راتوں رات قوم کا ہیرو بن جاتا اس لئے اس نے ہیڈکوارٹر جاتے ہی ایڈ جوائنٹ کو رپورٹ کی۔

"سر! مجھے شبہ ہے مفرور پاکستانی جاسوس سمندر کے راستے پاکستان جانے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے مجھے اجازت دی جائے کہ میں ان کو سمندر میں تلاش کروں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اس موسم میں کوئی پاگل ہی سمندر میں جائے گا اور انہیں کشتی کہاں سے ملے گی۔"

"آپ غور کریں سر۔۔۔! یہ ان کیلئے بہترین موقع ہوگا کہ اس موسم میں کسی کو خیال نہیں آئے گا اور کشتی کسی بھی گھاٹ سے مل سکتی ہے۔ وہ کوئی تفریحی کشتی بھی چرا سکتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی ایڈ جوائنٹ نے فون اٹھا کر کسی سے بات کی دیکھو تمام ایسی جگہوں کی سخت نگرانی شروع کرادو جہاں کشتیاں لنگر انداز ہیں۔۔۔ تمام طرح کی کشتیاں۔ ہاں اور ان میں سے کوئی غائب پائی جائے تو فوری طور پر مجھے اطلاع کرو۔"

کالی داس کو مایوسی ہوئی۔ ایڈ جوائنٹ نے اسے اجازت دینے کے بجائے خود اقدامات کرنا شروع کر دیئے تھے۔

"میرے لئے کیا حکم ہے سر!"

"تم کوئی تیز رفتار بوٹ لے کر جاؤ اور ساحل کے ساتھ ساتھ انہیں تلاش کرو۔ اگر انہوں نے کوئی کشتی چرائی بھی ہے تو گہرے پانی میں جانے کی جرأت نہیں کریں گے۔"

"تھینک یو سر!" کالی داس بے ساختہ خوش ہو گیا۔

ایڈ جوائنٹ نے اسے غور سے دیکھا۔ "شکریہ کس بات کا یہ تمہاری ذمے داری ہے۔"

آٹھ بجے کالی داس چار افراد کے عملے کے ساتھ ایک اسپیڈ گن بوٹ لے کر نکلا۔ یہ بوٹ خاص طور سے گہرے پانی میں تیز رفتاری سے سفر کیلئے بنائی گئی تھی۔ کالی داس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے گپتا اور پاکستانی ماہی گیروں کو سمندر میں تلاش کر لیا اور انہوں نے مزاحمت کی تو وہ انہیں اڑا کر رکھ دے گا۔ اسپیڈ بوٹ میں طویل فاصلے پر مار کرنے والی مشین گن اور راکٹ بھی تھے۔ ایک سویلین شپ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

روانگی کے ایک گھنٹے بعد اسے اطلاع ملی کہ فوجی ڈاک سے ذرا فاصلے پر ایک نجی ڈاک سے ایک بڑی تفریحی کشتی بعض مسلح افراد زبردستی لے گئے ہیں۔ خیال ہے کہ مفرور پاکستانی ماہی گیر اسی میں سوار تھے۔ کالی داس کو پیغام سنتے ہی یقین آ گیا تھا کہ اس کی تلاش کا مرکز یہی بوٹ تھی۔ ریڈیو سے بوٹ کے بارے میں جو تفصیلات آئی تھیں ان کے مطابق وہ چالیس ناٹ فی گھنٹے کی رفتار سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی۔ وہ صبح چھ بجے نکلی تھی۔ یعنی اسے کالی داس پر تین گھنٹے کی سبقت حاصل تھی۔ خراب موسم کی وجہ سے فضائی تلاش نہیں کی جا رہی تھی۔

کالی داس کی گن بوٹ تقریباً ساٹھ ناٹ کی رفتار سے چل سکتی تھی اور اس وقت بھی اس نے رفتار پچاس ناٹ فی گھنٹہ کر رکھی تھی۔ حالانکہ سمندر میں تین چار فٹ اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ بوٹ کالی داس خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہوئے عجلت میں سر کی معمولی سی مرہم پٹی کرالی تھی اور پین کلر انجکشن لے لیا تھا مگر اس وقت جوش میں اور انتقام کے خیال سے درد یاد بھی نہیں تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس رفتار سے وہ بارہ بجے تک انہیں پکڑ لے گا۔ بشرطیکہ وہ ان کی سیدھ میں سفر کرتا رہا۔

☆......☆......☆

دس بجے تک موسم اور سمندر کسی قدر بہتر ہوا تھا اس لئے جان محمد نے بوٹ کی

رفتار بڑھا دی۔ اب وہ تیس ناٹ کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ اب تک وہ شمال مغرب کی جانب سو ناٹ کا سفر طے کر چکے تھے اور اب پاکستان کی سمندری حدود کوئی سو ناٹ کے فاصلے پر ہی تھی۔ ہموار سمندر پا کر جان محمد نے مزید ہمت کی اور رفتار مزید بڑھا دی۔ اس نے آج تک کوئی کشتی اتنی رفتار سے نہیں چلائی تھی۔ ان کی اپنی کشتی ماہ نور دس بارہ ناٹ سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کر سکتی تھی۔ ماہ نور یاد آئی تو اس کے دل کو دھکا لگا تھا۔ اس بے جان کشتی سے انہیں کتنی انسیت تھی۔ یہ ان کے باپ کی نشانی اور ان کے روزگار کا واحد ذریعہ تھی۔ اب وہ اسے گنوا چکے تھے لیکن جان روزگار سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ابراہیم اپنی جان سے گیا تھا۔ کاش وہ زندہ ہوتا تو ان کے ساتھ ہوتا۔ جان محمد نے سرد آہ بھری۔

گزشتہ رات سے جاری بھاگ دوڑ اور حالات کی کشیدگی اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ بے پناہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ دو گھنٹے کی نیند سے معمولی سا فرق پڑا تھا۔ نادر جھونکے لے رہا تھا۔ قاسم اوپر عرشے پر تھا اس معاملے میں سب سے مضبوط اعصاب اسی کے تھے۔ وہ دو دن تک بھی جاگ سکتا تھا اور پوری طرح چاق و چوبند رہتا تھا۔ اس لئے آرام سے جاگ رہا تھا۔ بارہ بجے تک وہ ایک سو ستر ناٹ فاصلہ طے کر چکے تھے اور ابھی پاکستانی حد سے تیس میل کے فاصلے پر تھے۔ راستے میں انہیں کوئی جہاز یا کشتی ایسی نظر نہیں آئی تھی جو خاص طور سے ان کی تلاش پر مامور ہو۔

موسم کی خرابی کی وجہ سے سمندر کا معمول کا ٹریفک غائب تھا۔ جان محمد مضطرب تھا۔ صرف ایک گھنٹے کی بات تھی اور پھر وہ پاکستان کی حدود میں ہوتے اور انہیں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

یہ بات سوچتے ہوئے جان محمد کو خیال بھی نہیں آیا کہ انہیں پاکستان کی حدود سے ہی گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے نادر سے کہا۔

''نیچے جا کر گپتا کو اٹھا لاؤ۔ اب کشتی وہ چلائے گا۔''

نادر چلا گیا۔ اچانک بوٹ کا ریڈیو جاگ اٹھا۔ پہلے صرف کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی رہی تھی پھر کسی نے کہا۔

''رتنا گرل کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ بوٹ اپنی لوکیشن سے آگاہ کرے۔''

پیغام پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں دہرایا گیا تھا۔ جان محمد نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر مائیک اتار لیا تھا۔ وہ بٹن دبا کر جواب دینے جا رہا تھا کہ رک گیا۔

''مجھے جواب دینے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''لعنت ہو ان پر۔۔۔۔''

بوٹ کا نام رتنا گرل ہی تھا۔ گویا ان کی تلاش جاری تھی۔ جان محمد ریڈیو کے معاملات سے اتنی واقفیت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی چھٹی حس نے اسے روک دیا کہ اگر اس نے جواب دیا تو رتنا گرل کا سراغ لگایا جا سکتا ہے اور ابھی وہ بھارتی سمندری حدود میں تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر رتنا گرل پر ان کی موجودگی کا علم بھارتی نیوی کو ہو چکا تھا تو اس وقت علاقے میں تعینات ان کی تمام کشتیاں اور بحری جہاز رتنا گرل کی تلاش میں ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی جان محمد نے کنٹرول روم سے جھانک کر قاسم کو آواز دی۔

''سب کو جگا دو۔۔۔ خطرہ ہے۔ ہمیں تلاش کیا جا رہا ہے۔''

ذرا سی دیر میں سب کنٹرول روم میں تھے۔ ''گپتا کہاں ہے؟'' جان محمد نے نادر سے پوچھا۔

''وہ سو رہا ہے میں نے اسے اٹھانے کی ہر کوشش کی وہ جاگتا ہی نہیں ہے۔''

''اسے مارو گولی۔۔۔ بلکہ اس کے کیب کا دروازہ باہر سے بند کر دو۔'' جان محمد نے کہا۔

''میری بات غور سے سنو۔ ابھی ریڈیو پر اس بوٹ کا نام پکار کر جواب دینے کو کہا گیا ہے۔ یعنی ہماری تلاش شروع کی جا چکی ہے۔''

''تب ہم کیا کریں استاد!'' قاسم نے پوچھا۔

''تم میں سے دو کشتی کے مستول کی طرف چلے جائیں اور چاروں طرف سے نظر رکھیں۔ ایک بندہ عرشے پر رہے۔ جیسے ہی کسی طرف سے کوئی کشتی یا جہاز نظر آئے۔ نیچے والے کو بتائے اور نیچے والا مجھے بتائے۔''

ولی اور قاسم مستول پر چلے گئے۔ تقریباً پینتیس فٹ کی اونچائی سے وہ

چاروں طرف میلوں دور تک دیکھ سکتے تھے۔

ان کے پاس ایک دوربین بھی تھی۔ غلام عرشے پر تھا اور نادر کشتی کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ ہموار سمندر پر بوٹ جیسے اڑی جا رہی تھی۔ اس کی کم سے کم رفتار بھی پینتیس ناٹ فی گھنٹے سے کم نہیں تھی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب قاسم جو دور بین سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک چونکا۔ عقب میں افق پر ایک دھبا سا تھا جو تیزی سے واضح ہو رہا تھا۔ وہ چیخ اٹھا۔

"استاد کو بتاؤ۔ ادھر سے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔"

غلام نے چیخ کر اس کی بات دہرائی تو جان محمد جھپٹ کر کیبن سے نکلا عقبی عرشے سے اس نے سمندر کی طرف دیکھا:

دھبا اب اتنا واضح تھا کہ اس جگہ سے بھی صاف نظر آ رہا تھا اور وہ مزید۔۔۔ تیزی سے واضح ہو رہا تھا۔

جان محمد نے اندازہ لگایا کہ اس کشتی کی رفتار رتنا گرل سے کہیں تیز ہے۔ اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ کوئی عام کشتی اتنی تیز رفتاری سے نہیں چل سکتی تھی۔ یہ یقیناً بھارتی بحریہ کی اسپیڈ بوٹ تھی اور وہ شدید خطرے میں تھے۔ ابھی پاکستانی سرحد فاصلے پر تھی وہ اندر کی طرف بھاگا اور اس نے انجن کو پوری رفتار دینا شروع کر دی۔ کشتی کی رفتار میں کسی قدر اضافہ ہوا لیکن وہ پہلے ہی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اس سے زیادہ تیزی دکھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ عقب میں آنے والی بوٹ رفتہ رفتہ واضح ہو رہی تھی۔ حتیٰ کہ قاسم کو دوربین سے اس پر لہراتا بھارتی ترنگا نظر آنے لگا۔

بھارتی اسپیڈ بوٹ برق رفتاری سے سفر کرتی پاکستان کی سرحد کے نزدیک آ گئی تھی لیکن ابھی تک کالی داس کو رتنا گرل کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ کالی داس پریشان تھا کیونکہ اس سفر کے دوران میں وہ دوسرے بحری جہازوں اور کشتیوں سے بھی رپورٹ لیتا رہا تھا۔ رتنا گرل کو کہیں نہیں دیکھا گیا تھا۔ سیاسی کشیدگی کی وجہ سے بھارتی نیوی کے طیارے پاکستان کی سرحد کے پاس اڑنے سے گریز کرتے تھے۔ اس وجہ سے

طیاروں اور ہیلی کاپٹرز کے ذریعے رتنا گرل کی تلاش پاکستان کی حدود سے دور ہی کی جا رہی تھی۔ کالی داس نے ریڈیو پر سرحد کے پاس گشت کرنے والی ساری کشتیوں کو رتنا گرل کا حکم دیا تھا۔ اس نے خاص طور پر زور دیا تھا کہ کشتی کو پاکستان کی حدود میں جانے سے روکا جائے اور اسے تباہ کر دیا جائے۔ یہ ساری بات بھارتی نیوی کے مخصوص کوڈ میں ہو رہی تھی۔ پھر کالی داس اس کے حکم پر رتنا گرل کو لوکیشن واضح کرنے کے لیے کہا جانے لگا۔ کیونکہ ان کشتیوں میں اس قسم کے آلات لگے ہوئے تھے جو رتنا گرل سے نشر ہونے والے جواب سے اس کی لوکیشن کا پتا چلا سکتے تھے۔

اچانک سپیڈ بوٹ کے ریڈار پر شمال مغرب کی سمت ایک دھبا نمودار ہوا جو تیز رفتاری سے پاکستان کی سمندری حدود کی طرف جا رہی تھی۔ کالی داس مضطرب ہو گیا تھا۔ اس نے کشتی کی رفتار بڑھانے کا حکم دیا اور گن کریو سے کہا کہ وہ اپنی ذمے داری نبھانے کے لیے تیار رہیں۔ ریڈار بوٹ کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل بتا رہا تھا۔ اگر یہ کوئی بحری جہاز ہوتا تو بیس میل کے فاصلے سے بھی واضح نظر آ جاتا۔ کالی داس کا شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ یہ کوئی چھوٹی کشتی تھی اور شاید رتنا گرل تھی۔ وہ جس رفتار سے جا رہی تھی۔ وہ بھی حیران کن تھا۔ کالی داس نے ریڈار کی ریڈنگ اور اپنی بوٹ کی رفتار سے اندازہ لگایا کہ آگے والی بوٹ چالیس ناٹ فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ اتنی رفتار سے رتنا گرل سفر کر سکتی تھی۔

کالی داس پرجوش تھا۔ فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ چھ۔۔۔ میل۔۔۔ پانچ میل۔۔۔ پھر تین میل۔

اسی اثنا میں آگے جانے والی بوٹ سے انہیں دیکھ لیا گیا تھا اس لیے اس کی رفتار میں مزید تیزی آ گئی تھی۔ گن بوٹ پر جو مشین گن نصب تھی، اس کی موثر مار دو کلو میٹر سے زیادہ نہیں تھی لیکن بہترین نتائج کے لیے فاصلہ بارہ سو میٹر سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح راکٹ مارنے کے لیے فاصلہ ایک کلومیٹر سے کم ہونا چاہیے تھا۔ کالی داس جانتا تھا کہ پاکستان کی سمندری حدود چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا اگر اسے پاکستان کی حدود میں گھس کر رتنا گرل

کو تباہ کرنا پڑا تو وہ اس سے دریغ نہیں کرے گا۔ جیسے جیسے دونوں کشتیوں کا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا، کالی داس کے چہرے پر خون کی پیاس بڑھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

جنوب مشرقی سمندر میں بھارت کی سمندری حدود سے دو میل کے فاصلے پر ایک سیکیورٹی بوٹ الحامد گشت کر رہی تھی، جب اس پر بھارتی بحریہ کے پیغام پکڑے جانے لگے۔ اتفاق سے ان کے پاس بھارتی کوڈ کی گائیڈ بک تھی، اس کی مدد سے کنٹرول روم میں موجود افراد نے پیغامات ڈی کوڈ کر کے اس کی اطلاع کشتی کے کپتان شیر علی کو دی۔ اس نے کسی قدر غور و خوص کے بعد بوٹ کا رخ بھارتی سرحد کی طرف موڑنے کا حکم دیا۔

''لیکن خیال رہے۔۔۔سرحد کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔''

''یس سر!'' پائلٹ نے کشتی کا رخ موڑا اور شیر علی نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ وہاں سے جواب ملا۔

''جب تک معاملہ پاکستان کی حدود میں نہ آئے تم لوگ مداخلت نہیں کرو گے۔''

''یس سر!'' شیر علی نے جواب دیا اور کشتی پر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔

یہ گن بوٹ چھوٹی لیکن جدید اسلحے سے لیس تھی، اس میں دو مار توپ کے علاوہ راکٹ اور اینٹی شپ میزائیل بھی تھے۔ ضرورت پڑنے پر یہ مختصر سی بوٹ کسی بڑے جنگی جہاز پر حملہ کر سکتی تھی۔ ہنگامی حالات کا سائرن بجتے ہی الحامد کا عملہ تیزی سے اپنی اپنی پوزیشنوں پر پہنچ گیا تھا۔ بھارتی سرحد سے ذرا فاصلے پر رک کر الحامد اپنے ریڈار کی مدد سے سمندر کا جائزہ لینے لگی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ریڈار اسکرین پر بھارتی حدود کی جانب سے دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں جو بے حد تیز رفتاری سے پاکستانی حدود کی جانب آ رہی تھیں۔

''سر! لگتا ہے اگلی بوٹ کا تعاقب کیا جا رہا ہے؟'' شیر علی کے نائب رضا احمد نے کہا۔

''ہمیں ہوشیار رہنا ہے، یہ دشمن کی سازش بھی ہو سکتی ہے۔'' شیر علی نے ہدایت کی۔

''اسلحے کو تیار رکھو لیکن جب تک میری طرف سے حکم نہ ملے، کوئی فائر نہ کرے۔''

''میزائل بھی سر!'' رضا احمد نے تصدیق چاہی۔

شیر علی نے ریڈار اسکرین کی طرف دیکھا۔

''نہیں، میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی' یہ دونوں چھوٹی کشتیاں ہیں۔''

''او کے سر!'' رضا احمد باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

جان محمد بار بار مڑ کر عقب میں تیزی سے آتی بوٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جواب مشکل سے ایک میل کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ اچانک پانی میں آ کر گولیوں کا برسٹ گرا اور پانی فوارے کی طرح اچھلا تھا۔ جان محمد نے بوٹ لہرائی۔ اسی وجہ سے اگلے برسٹ سے بچ گیا عقبی بوٹ بے دریغ مشین گن سے فائر کر رہی تھی۔ جان محمد مستقل بوٹ کو لہرانے لگا۔ اسکے اندازے کے مطابق وہ پاکستان کی سرحد کے نزدیک تھا یا اسے عبور کر چکا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ محفوظ تھا۔ بھارتی سرحدوں کا احترام نہیں کرتے۔

''استاد! وہ ہم پر فائرنگ کر رہے ہیں۔'' باہر سے نادر نے چلا کر کہا۔

''اندر آ جاؤ۔'' جان محمد نے جواب دیا کوئی اوپر نہ رہے، سب نیچے چلے جاؤ۔''

لیکن ولی اور غلام، نادر اور قاسم نیچے جانے کی بجائے کنٹرول روم میں آ گئے۔ جان محمد جھنجلایا۔

''یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے، نیچے جاؤ۔۔۔یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔''

''ہم بھی ان پر فائر کریں گے۔'' نادر جوش سے بولا۔

"احمقانہ باتیں نہ کرو۔ وہ اتنی دور ہیں کہ ہماری رائفلوں کی گولیاں ان تک نہیں جاسکتیں ۔تم سب نیچے جاؤ۔"

"استاد! تم نیچے جاؤ میں کشتی چلاتا ہوں۔" نادر نے کہا۔

"اتنی دیر سے چلا کر میں نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے، تم اسے درست طریقے سے نہیں چلاسکو گے، میرا حکم ہے سب نیچے جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں، کوئی اوپر نہ آئے۔"

اسی لمحے بھارتی کشتی سے چلایا جانے والا برسٹ کنٹرول روم کے اوپر والے حصے میں لگا۔ عقبی شیشہ بکھر گیا تھا۔ اوپر چھت میں سوراخ نظر آنے لگے تھے۔ وہ سب بے اختیار نیچے جھک گئے۔

"دفع ہو جاؤ، مجھے اپنا کام کرنے دو ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔"

ولی، غلام، قاسم اور نادر رینگتے ہوئے نیچے چلے گئے بھارتی بوٹ خاصی نزدیک آگئی تھی۔ اتنی نزدیک کہ اس کی آگ برساتی گنیں صاف نظر آرہی تھیں۔ پھر جان محمد نے ایک شعلہ سا لپک کر اپنی کشتی کی طرف آتے دیکھا تھا، اس نے بے ساختہ بوٹ کا اسٹیئرنگ کاٹا اور رتنا گرل داغے جانے والے راکٹ سے بال بال بچی۔ دھماکے کے ساتھ سمندر کا پانی فوارے کی طرح بلندی تک گیا تھا۔ رتنا گرل چند گز کے فاصلے سے بچ گئی تھی۔ جان محمد پوری طرح چوکس تھا۔ بوٹ کو لہرانے کے ساتھ وہ مستقل عقب میں بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ مشین گن کے مقابلے میں راکٹ کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ اس کا ایک ہی وار بوٹ کے پرخچے اڑا سکتا تھا۔ اب تک مشین گن کے کئی برسٹ بوٹ کے مختلف حصوں میں لگ چکے تھے لیکن خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ جان محمد نے رائفلوں کے فائرز سنے۔ وہ چونکا۔ اس نے کیبن سے جھانکا نادر، قاسم اور ولی عقبی حصے میں بھارتی بوٹ پر فائر کر رہے تھے، جواب مشکل سے پانچ گز کے فاصلے پر تھی۔ جان محمد کا خیال تھا کہ بھلا بھارتی بوٹ کا ان معمولی رائفلوں سے کیا بگڑے گا مگر وہ حیران رہ گیا، جب بھارتی بوٹ کی رفتار میں تیزی سے کمی ہوئی تھی اور چند لمحوں کے اندر وہ خاصی پیچھے رہ گئی تھی اور اب وہ رائفل کی رینج سے باہر تھے۔

"کتنی بزدل قوم ہے یہ۔۔۔ نہتوں پر شیر ہے اور جہاں سے جواب ملا فوراً دبک جاتی ہے۔" جان محمد نے سوچا۔

بھارتی بوٹ سے فائرنگ بدستور جاری تھی۔ جان محمد نے یکے بعد دیگرے بوٹ سے کئی شعلوں کو پرواز کرتے دیکھا تو رتنا گرل کو دائیں طرف کاٹنا شروع کر دیا۔ نصف درجن راکٹ سمندر میں گر کر ادھر ادھر ضائع ہو گئے تھے۔

قاسم اور نادر نے نعرہ لگایا۔ جان محمد نے چلا کر کہا۔

"اندر آؤ۔۔۔ احمقو۔۔۔! وہ فائر کر رہے ہیں۔"

با دل ناخواستہ وہ اندر چلے گئے۔ جان محمد نے محسوس کیا کہ بوٹ کی رفتار میں کمی آرہی ہے۔ اس نے رفتار کی سوئی کی طرف دیکھا۔ واقعی رفتار کم ہو رہی تھی۔ حالانکہ دونوں انجن پوری رفتار سے چل رہے تھے۔ اگر ایندھن ختم ہوتا تو ان کی آواز میں بھی فرق آتا۔ ساتھ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ بوٹ بھاری ہو رہی ہے۔ اسی اثنا میں نادر اور غلام بھاگتے ہوئے آئے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"استاد! غضب ہو گیا۔" نادر ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا؟" جان محمد بوٹ کی پریشانی میں الجھا ہوا تھا۔

"کشتی کے نچلے حصے میں پانی بھر رہا ہے۔"

اب جان محمد سمجھا کہ بوٹ کیوں سست ہو رہی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ وہ پاکستانی سمندر میں تھے۔ بھارتی بوٹ نے ان کی کشتی پر مشین گن سے فائرنگ کر کے سوراخ کر دیئے تھے، جس سے پانی بھر رہا تھا۔ جان محمد نے ریڈیو کا مائیک اٹھایا اور مے ڈے کو پیغام دینے لگا۔

"اگر کوئی پاکستانی سیکیورٹی بوٹ سن رہی ہے تو ہمیں بھارتی بوٹ سے بچائے جو پاکستان کے سمندر میں ہمارا تعاقب کر رہی ہے' اس کی فائرنگ سے بوٹ میں سوراخ ہو گیا ہے۔ بوٹ میں پانی بھر رہا ہے۔ ہماری مدد کی جائے۔"

"استاد! بھارتی بوٹ نزدیک آرہی ہے" نادر چلایا۔ جان محمد نے پلٹ کر دیکھا۔ بھارتی بوٹ دوبارہ بے حد نزدیک تھی۔ پھر اس سے شعلے نکلے۔ جان محمد نے

بوٹ گھمانے کی کوشش کی۔لیکن سست پڑ جانے والی بوٹ نے ذرا تاخیر کی۔دھماکے سے جیسے فضا میں بھونچال آ گیا تھا۔

☆......☆......☆

رضا احمد بے چینی سے کپتان کے حکم کا منتظر تھا۔اسے بھارتی بوٹ کی دیدہ دلیری پر حیرت تھی۔وہ دن دھاڑے اور ایک پاکستانی بوٹ کی موجودگی میں پاکستانی سمندری حدود میں گھس آئی تھی اور اب اس سویلین بوٹ کے پائلٹ نے اسے مہارت سے بچالیا تھا۔دوسری طرف کپتان شیر علی بھارتی بوٹ سے رابطہ کر کے اسے وارننگ دینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بھارتی بوٹ کا ریڈیو شاید بند تھا۔اس کی جارحانہ کاروائیاں مسلسل جاری تھیں اور جب ایک راکٹ آ کر سویلین کشتی کے عقبی حصے پر گرا تو شیر علی کا صبر جواب دے گیا۔

”رضا۔۔۔ ہٹ دی بوٹ۔“ اس نے مائیکروفون پر کہا۔اسی اثنا میں ریڈیو آپریٹر نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیپٹن سر! سویلین بوٹ سے پیغام آیا ہے۔“

شیر علی نے ہیڈ فون لگا کر پیغام سنا۔اس کا چہرہ جوش سے چمکنے لگا۔

”یہ پاکستانی ہیں۔“

سویلین بوٹ کے عقبی حصے سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ پانی میں ڈوب رہی تھی۔دوسری طرف بھارتی بوٹ چکر کاٹ کر واپس جا رہی تھی۔جب رضا احمد نے اس کے خلاف کارروائی شروع کی۔پہلا راکٹ اس کے پہلو پر لگا تھا۔اگلے ہی لمحے توپ نے اس پر گولے برسانے شروع کر دیئے۔تین گولے یکے بعد دیگرے اس کے عرشے پر گرے اور بوٹ کا حشر نشر ہو گیا۔مگر اس کی گولہ باری سے اس کے انجنوں کو نقصان نہیں پہنچا تھا کیونکہ بھارتی بوٹ اب بھی خاصی رفتار سے اپنی سمندری حدود کی طرف جا رہی تھی۔شیر علی کے خیال میں اسے اتنا سبق سکھانا کافی تھا،اس نے رضا احمد کو حملہ روک کر سویلین بوٹ پر سوار افراد کی مدد کرنے کو کہا۔

چند منٹ کے اندر پاکستانی کشتی رتنا گرل کے ساتھ جا لگی اور اس سے مسلح

جوان کود کر بوٹ میں داخل ہو رہے تھے۔

☆......☆......☆

کالی داس پر جنون طاری ہو گیا تھا۔اس نے خاصا پہلے پاکستانی سیکیورٹی بوٹ دیکھ لی تھی لیکن رتنا گرل کو تباہ کرنے کی خواہش اس کے اندیشے پر غالب آ گئی تھی۔اس نے مسلسل فائر کرنے کا حکم دیا مگر رتنا گرل کو چلانے والا مہارت سے اسے ہر حملے سے بچا رہا تھا لیکن کہاں تک، بھارتی بوٹ کی مشین گن کے برسٹ نے اس کے نچلے حصے میں سوراخ کر دیے تھے اور اس میں پانی بھرنے لگا تھا۔اس کے ساتھ ہی رتنا گرل کی رفتار میں کمی آنے لگی تھی۔اچانک ریڈیو سے پاکستان سیکیورٹی بوٹ سے وارننگ نشر ہونے لگی تھی۔بھارتی بوٹ کو خبردار کیا جا رہا تھا کہ وہ فوراً اپنی جارحانہ روش ترک کر کے واپس اپنی حدود میں چلی جائے ورنہ اس کے خلاف کارروائی ہو گی۔کالی داس کا پائلٹ یہ سن کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔

”سر! ہمیں واپس چلے جانا چاہیے۔پاکستانی بوٹ پر میزائل بھی لگے ہیں۔“

”بکومت! اپنا کام کرو۔“ کالی داس نے اسے جھڑک دیا۔رتنا گرل کی رفتار میں کمی کے ساتھ ہی اس کے منہ پر سفاک مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔اس نے راکٹ فائر کرنے والے سے کہا۔

”اب یہ بچ کر نہ جائے۔“

”یس سر!“ اس نے جواب دیا اور اس بار اچھی طرح نشانہ لے کر راکٹ فائر کیا ان میں سے ایک رتنا گرل کے عقبی حصے پر گرا اور اس میں آگ لگ گئی تھی۔

”واپس چلو۔“ کالی داس نے پائلٹ سے کہا۔

”رفتار پوری کر دو۔“

پائلٹ نے پھرتی سے اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن انہیں تاخیر ہو چکی تھی۔پاکستانی سیکیورٹی بوٹ سے راکٹ فائر ہوا اور بھارتی بوٹ کا پہلو زخمی ہو گیا اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ یکے بعد دیگرے تین گولے آ کر کشتی کے اوپر گرے۔انہوں نے الگ تباہی مچائی تھی۔ہر طرف شعلے رقص کر رہے تھے۔

"اپنی حدود میں چلو۔" کالی داس چیخا اور پھر ریڈیو پر پیغام دینے لگا۔

"سر! ہم بھارتی سرحد سے ایک ناٹ کے فاصلے پر ہیں۔" پائلٹ نے اسے آگاہ کیا۔

کالی داس نے پلٹ کر دیکھا۔ پاکستانی سیکیورٹی بوٹ ان کے تعاقب میں آنے کی بجائے رک گئی تھی۔ کالی داس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب انہیں خطرہ نہیں تھا۔ اس نے کریو سے کہا کہ آگ کو ایندھن کے ذخیرے تک پہنچنے سے روکیں۔ وہ گیس سیلنڈر لیے آگ بجھا رہے تھے لیکن آگ نے راکٹوں والے حصے میں رسائی حاصل کر لی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور ان سب کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ ابھی پاکستان کی سمندری حدود میں تھے۔

☆......☆......☆

بھونچال ذرا تھما تو وہ سب فرش پر پڑے تھے۔ نادر کو معمولی زخم آئے تھے۔ خوش قسمتی سے راکٹ بوٹ کے عقبی حصے میں گرا تھا۔ ورنہ اگر کنٹرول روم پر گرتا تو ان سب کے پرخچے اڑ جاتے۔ عقبی حصے میں آگ بھڑک رہی تھی جو تیزی سے بوٹ کے اگلے حصے کی طرف آ رہی تھی۔ جان محمد نے کہا

"جلدی کرو، کشتی سے نکلو ورنہ ایندھن میں آگ لگ گئی تو ہم سب کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔"

"غلام کہاں ہے؟" ولی چلایا۔

"وہ نیچے ہے۔" جان محمد کھانستا اور لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

"گپتا بھی نیچے ہے۔"

راکٹ لگنے کے بعد رتنا گرل کے انجن بند ہو گئے تھے اور کشتی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ جان محمد نیچے اترا تو وہاں گھٹنوں گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ اس نے چلا کر غلام محمد کو آواز دی۔

"کہاں ہے تو؟"

"میں ادھر ہوں بھائی!" غلام محمد چلایا۔

"اسے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں، دروازہ نہیں کھل رہا۔"

"گپتا جس کیبن میں تھا اس کا دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ یہ جگہ عقبی عرشے کے نیچے تھی اور وہاں پر آگ کی حدت محسوس کی جا سکتی تھی جو اوپر بھڑک رہی تھی۔ جان محمد نے ایک کلہاڑی اٹھائی اور اس سے پے در پے دروازے پر ضربیں لگانے لگا۔ جلد ہی پلائی کا دروازہ جواب دے گیا۔ اندر شعلے رقصاں تھے۔ غلام جھجکا لیکن جان محمد بے جھجک اندر گھس گیا تھا۔ کیبن کا اوپری حصہ آگ پکڑ چکا تھا اور چھت کا خاصا بڑا حصہ اڑ چکا تھا۔ جان محمد نے گپتا کو تلاش کیا۔ لیکن وہ کیبن میں نظر نہیں آیا۔ فرش پر تقریباً دو فٹ پانی کھڑا تھا۔ اچانک اس کے پاؤں کسی چیز سے ٹکرائے۔ اس نے جھک کر دیکھا، ایک انسانی بازو پانی سے جھانک رہا تھا۔ اس نے بازو پکڑ کر کھینچا تو گپتا کا بے جان چہرہ سامنے آ گیا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ نہیں تھا کیونکہ اس کی نصف کھوپڑی اڑ گئی تھی۔ غالباً وہ راکٹ گرتے وقت مارا گیا تھا۔

غلام محمد نے بھی گپتا کی لاش دیکھ لی تھی۔

"بھائی نکلو، ادھر سے۔ کشتی ڈوب رہی ہے۔"

لیکن جان محمد گپتا کی لاش یوں چھوڑ کر جانے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اس نے لاش بازوؤں سے پکڑی اور اسے کھینچ کر اوپر لے جانے لگا۔ غلام اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ اوپر تھے۔ اسی اثنا میں پاکستانی سیکیورٹی بوٹ وہاں آ کر رکی اور اس میں سے جوان کود کود کر رتنا گرل پر آنے لگے۔ محض پندرہ منٹ میں وہ سب سیکیورٹی بوٹ پر تھے اور کپتان شیر علی ان لوگوں کے بارے میں ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ دے رہا تھا اور بوٹ کے لوگ ان کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔ گپتا کی لاش ایک جگہ محفوظ کی جا چکی تھی۔

پاکستانی سیکیورٹی بوٹ نے اس جگہ کا چکر لگایا جہاں پر بھارتی نیول بوٹ تباہ ہوئی تھی۔ اب وہاں اس کی چند باقیات تیر رہی تھیں۔ باقی بوٹ لاشوں سمیت سمندر میں غرق ہو چکی تھی۔ شیر علی کو ملاحوں اور لاش سمیت واپسی کا حکم ملا۔ راستے میں اس نے جان محمد اور اس کے ساتھیوں سے تفصیلی بیان لئے تھے۔ وہ جان بچ جانے پر خوش تھے اور ساتھ ہی اپنے روزگار کا واحد ذریعہ چھن جانے پر افسردہ بھی تھے۔ شیر علی نے

انہیں تسلی دی۔

”جوان! روزگار چیز سے نہیں انسان کے بازو سے ملتا ہے اور میں نے دیکھ لیا ہے، تمہارے بازوؤں میں بہت زور ہے۔ میں تمہارے لئے سفارش کروں گا۔ اگر تم ہمارے ادارے میں آنا پسند کرو۔“

”سر! اگر مجھے یقین ہو کہ میں آپ کے ساتھ شامل ہو کر غریب مچھیروں کا تحفظ کر سکوں تو میں ضرور شامل ہوں گا۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“

جان محمد اب کسی قدر مطمئن تھا۔

☆......ختم شد......☆